

مولانا یوسف اصلاحی

محی الدین نواب

عالم اسلام کے مایہ ناز دانشور، مصنف اور مفکر

کہانی میری گلوں میں خون بن کر دوڑتی ہے، مجھے بھی دوڑنا ہے

فروری 2013

اردو ڈائجسٹ

f / urdu Digest . pk



ہاکی میں نام کس نے
والے تین ان تھک بھائی

ریحان ہمسراں اور رضوان کی پرجوش داستان

ہارمان لیتے تو کب کے میدان سے باہر ہوتے // کوچ ہی اُن کی راہ میں رکاوٹ تھے

اللہ کا قرآن

جس نے میری یاد سے منہ موڑا

اور جس نے میری یاد سے منہ موڑا تو اس کے لیے زندگی تنگ ہوگی (یعنی کثرت مال و اسباب سے بھی اس کو سکون حاصل نہیں ہوگا) اور قیامت کے روز ہم اس کو اندھا اٹھائیں گے O کہے گا اے رب تو نے مجھ کو اندھا کیوں اٹھایا اور میں تو دیکھنے والا تھا O اللہ فرمائے گا اس لیے کہ تمھارے پاس ہماری آیتیں پہنچی تھیں پھر تو نے ان کو بھلا دیا۔ اسی طرح آج ہم تم کو بھلا دیں گے O (آنکھوں کا بہترین استعمال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آیات کو پڑھا جائے۔ ان کو یاد رکھا جائے اور ان پر عمل کیا جائے)

(طہ: ۲۰-۱۲۶-۱۲۳)

رسول کا فرمان

قرآن مجید سات مختلف لہجوں اور قراتوں میں نازل ہوا۔

حضرت عمر بن الخطابؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”قرآن مجید سات مختلف لہجوں اور قراتوں میں نازل ہوا ہے۔ اس لیے جس کو جس طرح سہولت ہو اسی طریقے سے پڑھ لے۔“

(صحیح بخاری کتاب ۴۳- باب ۳: مسلم کتاب صلاۃ المسافرین- باب ۴۸)

قرآن مجید کی تلاوت کرتے رہنے کی فضیلت

حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریمؐ نے فرمایا: ”اس مومن کی مثال جو قرآن کی تلاوت کرتا رہتا ہے نارنگی کی سی ہے جس کی خوشبو بھی عمدہ ہے اور ذائقہ بھی عمدہ ہے اور قرآن نہ پڑھنے والا منافق اندرائن کے پھل کی طرح ہے جس میں خوشبو بھی نہیں ہے اور مزہ بھی کڑوا ہے۔“

(بخاری کتاب ۷۰- باب ۳: مسلم کتاب صلاۃ المسافرین- باب ۳۷)

انہیں ناکام ہونا نہیں آتا ہمارے لیتے تو کب کے میدان سے باہر ہوتے

ہاکی میں نام کمانے والے تین ان تھک
بھائیوں ریحان، رضوان اور عمران کی داستان

کوچ ہی اُن کی راہ میں رکاوٹ تھے

تحریر و تہذیب: اختر عباس

ہاکی کے
بٹ برادران کی
دلچسپ کہانی

69

معافی جیسی چھٹیوں سے گزرنے کے بعد سیاسی جماعتوں کے پاس بچنے کا کیا؟ لہذا آنے والی عبوری حکومت تقریباً تمام اندرونی و بیرونی اسٹیک ہولڈرز کی رضامندی سے ایکشن پلان کی کوئٹہ کرے گی جس کا جواز گزشتہ ۱۴ برسوں کے گند (Mess) کو صاف کرنا اور انتخابات میں ایک ایسی توانا، دیانت دار اور مخلص قیادت کو سامنے لانا ہوگا جو ملک کو درپیش شدید معاشی بحران اور اندرونی و بیرونی چیلنجز کا ڈٹ کر مقابلہ کر سکے۔

مارچ، اپریل میں دوبارہ کی افغانستان پالیسی کا اعلان متوقع ہے۔ یوں دکھائی دیتا ہے کہ وہ ۲۰۱۳ء کے بجائے ۲۰۱۳ء میں ہی افغانستان سے اپنی افواج کا انخلاء چاہتا ہے۔ جیسا کہ اس نے اپنی حلف برداری کی تقریب میں بھی کہا کہ ”جنگ کا عشرہ مکمل ہو گیا ہے۔“ دوبارہ کو امریکی معیشت میں بہتری کے لیے دفاعی بجٹ میں کمی کرنا ہے تاکہ ۲۰۱۴ء میں کانگریس کے انتخابات میں ان کی جماعت اچھی کارکردگی دکھا سکے۔ اسی لیے انھوں نے سیکرٹری آف ڈیفنس کے لیے چک ہیگل (Chuck Hegel) کا انتخاب کیا ہے حالانکہ اس کی تقرری پر اسرائیل نے ناپسندیدگی کا اظہار کیا، جس کی وجہ ۲ برس قبل ان کا ایسے خط پر دستخط کرنے سے انکار تھا جس میں یورپی یونین کو لبنان کی شیعہ تنظیم حزب اللہ کو دہشت گرد قرار دینے کے لیے کہا گیا تھا۔ ہیگل ایران پر امریکی باہرانی حملے کے بھی مخالف رہے ہیں اور خاسے ”آؤٹ سپون“ مشہور ہیں۔ سیکرٹری آف اسٹیٹ کے لیے سلیٹر جان کیری کا انتخاب بھی اسی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جناب کیری پاکستان کے معاملات میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور امریکی سینٹ کی فارن ریلیشنز کمیٹی کی حیثیت سے القاعدہ کو ختم کرنے کے لیے پاکستان کے بنیادی کردار کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ افغانستان سے امریکی فوج کے جلد انخلاء کے لیے بھی ضروری ہے کہ پاکستان میں انتخابات کو آگے دھکیلا جائے۔

۲۰۱۳ء میں ہی پاکستان میں طاقت کے تمام مراکز کے سربراہان نے تبدیل ہونا ہے۔ صدر پاکستان، بری فوج کے سربراہ اور چیف جسٹس آف پاکستان بالترتیب ستمبر، نومبر اور دسمبر کے مہینوں میں اپنے عہدوں سے سکند ہو رہے ہیں۔ غیر ملکی طاقتیں خصوصاً امریکا انتخابات کے نتیجے میں آنے والی قیادت سے معاملات طے کرنے کا رسک نہیں لینا چاہے گا۔ شطرنج کی بساط پر بھی چلے گا ہے ہر کوئی اپنی چال چل رہا ہے۔ دیکھتے ہیں کون کس کو مات دیتا ہے کہ ع شاطر سے بھی پوشیدہ ہے فرزین کا ارادہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ”اور وہ لوگ جنہوں نے جھٹلایا ہماری آیات کو، انہیں ہم ہتھرتج لے جائیں (تجارت کی طرف) ایسے طریقے سے کہ انہیں خبر تک نہ ہوگی اور میں وہیں دوں گا انہیں، بے شک میری چال بڑی مضبوط ہے۔“ (پارہ ۹، الاعراف ۱۸۱)

طیبہ اعجاز ترخانی

پڑھیے، پڑھا لکھیے اور اعلیٰ اُٹھائیے
tayyab.aijaz@urdu-digest.com

مینجنگ ایڈیٹر نوٹ

شاطر سے بھی

پوشیدہ ہے فرزین کا ارادہ

اتوار کے دن واہیجر (Viber) پر پھٹی گئی۔ دوسری طرف تیونس سے میرا دوست نوفل غزال تھا جو مینجنگ کے شعبے کی صف اول کی فرانسیسی کمپنی ”Bobst“ کے پاکستانی اور افریقی ریجن کا سیکرٹری جرنل ہے۔ وہ پاکستان کے حالات پر فکر مند تھا کیونکہ وہ کئی مرتبہ یہاں آچکا ہے اور خطی صورت حال سے بخوبی واقف ہے۔ میں نے اپنی معلومات کے لیے اس سے پوچھا کہ آج کا تیونس بہتر ہے یا ”عرب بہار“ سے پہلے کا؟ اس نے جواب دیا: ”یقیناً آج کا تیونس زین العابدین کے دور سے بہتر نہیں۔“ آخر کے دور میں لوٹ کھسوٹ کے باوجود امن و امان بھی تھا اور معیشت بھی اچھی حالت میں تھی۔ لیکن ہمیں توقع ہے کہ ہمارا مستقبل ماضی سے کہیں بہتر ہوگا۔“ انھوں نے مزید بتایا کہ مشرق وسطیٰ اور افریقی ممالک میں جاری خانہ جنگی خصوصاً مالی میں ہونے والے تنازعہ واقعات کی وجہ سے یورپی کمپنیوں کی اشیاء خصوصاً مشینری کی فروخت میں نمایاں کمی ہوئی ہے اور پورے یورپ میں معیشت سست روی کا شکار ہے۔

نظارہ پورے افریقہ کے ممالک نہایت پس ماندہ ہیں اور ان کے عوام کی اکثریت غربت کی لکیر سے کہیں نیچے زندگی بسر کرتی ہے۔ لیکن یہ سرزمین معدنی دولت جس میں سونا اور میرے شامل ہیں، سے مالا مال ہے۔ کئی عشروں سے یہاں کی دولت آموں اور دارلارڈز سے مل کر یورپی طاقتیں لوٹ رہی تھیں، جو اب ممکن نہیں رہے گا۔ فرانس نے اپنی فوجیں مانی میں اتار دی ہیں اور جلد ہی امریکی اور نیٹو افواج کو افغانستان سے نکل کر افریقہ کے جنگلوں اور صحراؤں میں اپنے اور اتحادیوں کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے جانا ہوگا۔ پاکستان میں جوں جوں الیکشن کا وقت نزدیک آ رہا ہے۔ نئے نئے اور غیر متوقع واقعات تسلسل سے جنم لے رہے ہیں۔ ڈاکٹر طاہر القادری کی کینیڈا سے تشریف آوری، منار پاکستان پر ایک بڑا جلسہ اور پھر بچوں، عورتوں، جوانوں اور بوڑھوں پر مشتمل ہزاروں لوگوں کا اسلام آباد کے ریڈ زون تک پہنچنا اور شدید سردی میں ۲۴ دن تک دھڑا دھڑا، انہی واقعات کی ایک کڑی ہے۔ اس دھڑے کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوا بظاہر لگتا ہے کہ وہ انتخابات کو کم از کم ۲۰۱۴ء تک ملتوی کرانے کا باعث بنے گا۔ جن شرائط پر عمل کرنے کے عہدہ یہاں ہوئے، ان پر مکمل عمل ۹۰ دنوں میں ممکن ہی نہیں۔ دوہری شہریت، بجلی اور گیس چوری، میٹروں سے قرضہ جات کی



صدر مجلس
مدیر اعلیٰ
مینجنگ ایڈیٹر
ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
الطاف حسن قریشی
طیب اعجاز قریشی

ایڈیٹر
مجلس تحریر
نویس اسلام آباد، سلی ایوان
مہتمم طباعت
تخلیق و تزیین
پروف خوان

مارکیٹنگ/اشتہارات

advertisment@urdu-digest.com

ڈائریکٹر مارکیٹنگ
مینجنگ ایڈیٹر ٹرانزیشن
لاہور
گجرات/گوجرانوالہ

سالانہ خریداری
subscription@urdu-digest.com
فون: +92-42-37589957

اردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے

پاکستان 1080 کے بجائے 750 روپے میں
بیرون ملک 50 امریکی ڈالر
URDU DIGEST Current A/C No. 800380
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس
325, G-III جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738
editor@urdu-digest.com

وقت 90
طالع و شرافت حسن قریشی نے جہاں سے 24 روبرو
سے چھپ کر کمرن آباد لاہور سے شائع کیا

فہرست

سرورق پر

49

حامد مشہود

محی الدین نواب

کہانی پیریگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے، مجھے بھی دوڑانی ہے
قلم اور موقلم کے نواب

228



حضرت براء بن مالکؓ

33

ایک عظیم صحابی کی روح پروردستان حیات زندگی پھر ان کا شعار "اللہ اور جنت رہا"

خالد محمد خالد

عالم اسلام کے مایہ ناز دانشور، مصنف اور مفکر

مولانا یوسف اصلاحی

سے ایک دل پر گہنگو اختر عباس

سید عام محمود

بھارت کے پہلے فلم ڈائریکٹر کی نظر میں

ایک لیڈر کی خوبیاں

89



ولی زاہد

عالمی دنیا کا سب سے بڑا راک شار

سمیع یوسف

کے سماجی گیت ۲۳ کروڑ ۲۴ لاکھ فروخت ہو چکے

65

ان کے لیے خاص جو صرف نام کو ہی بڑا جانتے ہیں

عطیہ فیضی

قصہ اک نگار شہر کا....

ماہر القادری

116

اچانک روشنی چمکنے سے نزدیک و اچکدار
آنکھوں میں حیرت لیے ہمیں دیکھ رہا تھا

تنزانیہ کے جنگلوں میں 5 دن

صبا شفیق

11

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ



زندگی نام بے ڈر ڈر کے جیے جانے کا

105



شکیل احمد

اپنے بچوں اور خواتین پر سرمایہ کاری کرنے والی

قوموں کو زوال نہیں آتا

کہانیاں

مقروض	161
بقا	171
دو مسافر	180
بٹوے میں پڑا خط	183
باؤدارت کی گشتی	186
نمٹ یا نکلن	189
گلاب گاہ	193
آخری خواہش	201
ایپل	206
سرخ پھول	212
سوتیلا زکوری و رحالہ بن اسلام	
نیلوفر اقبال	
شوکت عثمانی راہر سعیدی	
آرملڈ فائن	
اخلاق احمد	
حسن رزاقی	
نجیب عمر	
تورا کینہ قاضی	
محمد عباس ثاقب	
رانا فضل حسین مقبول جاوید احمد صدیقی	

دنیا کی سب سے زیادہ مچھلی

254

جسے پکارتے ہیں "لیٹ شیف" کا لائنس یافتہ بونا لاری ہے



رضوان علی شاہ

ماٹیکل ڈیل

الطاف حسن قریشی	۱۵
الطاف حسن قریشی	۱۹
مظہر بک	۲۹
مہدالہک چاہد	۳۲
حبیبہ اعرف بیہی	۳۶
مناور	۵۹
غلام سجاد	۸۱
جاوید چوہدری	۱۰۲
غلام رسول اعوان	۱۲۹
محمود ریز	۱۳۳
اسکندر علی ریاض	۱۴۰
ساجد نیاز	۱۴۲
تحریک حنا صمد الحق	۱۴۵
رضوان علی شاہ	۱۵۲
قاضی مظہر الدین	۱۵۷
خالد سعید اختر	۲۳۶
ڈاکٹر اسد ارشد	۲۳۷
محمد حسام	۲۴۱
مظہر احمد پاشی	۲۴۵
علی عباس قادری	۲۵۰
ڈاکٹر ساجد محمود ساجد	۲۵۲
دستی شاہ	۲۵۷
مظہر ہاشم پوری	۲۵۹
محمد طفیل	۲۶۲
نور علی	۲۶۷
محمد جمال	۲۷۰
نور حسین	۲۷۳
پروفیسر آئی شہباز	۲۷۷
تاج محمد	۲۷۹
اختر عباس	۲۸۳

اس پر اپنی ہی بادشاہی کے خلاف
سازش یا بغاوت کرنے کا الزام تھا

مختار زمن

ظفر، شوق رنگ

آئیے ہم ہمیں
آنکھیں بند کر لیں

نیا کیا ہے اس کہانی میں.....



عطیہ عمر

جھگڑے تب ہی کیوں ہوتے ہیں جب گھر میں "دائے" ہوتے ہیں

چوہدری فتح خان اور چچا سام



کچھ اپنی زباں میں

عظیم رہنماؤں کے نقوشِ دوام

دسمبر اور جنوری کے درمیان ہم تین رہنماؤں جناب بشیر بلور، جناب پروفیسر غفور احمد اور جناب قاضی حسین احمد کی بصیرت، محبت اور عزیمت کی تابندگی سے محروم ہو گئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی بیش بہا خدمات، ان کے بے مثل ایثار اور ان کی جہد مسلسل کو قبول فرمائے، انھیں جو ارحم میں جگہ دے اور ان کے درجات بلند فرمائے! بشیر بلور جو عوامی نیشنل پارٹی کے اہم قائد اور خیبر پختونخواہ کی کابینہ میں سینیئر وزیر تھے، وہ ۲۲ دسمبر کی شام خود ش حملے میں کئی ساتھیوں کے ہمراہ شہید ہوئے اور پورے ملک میں ان کی قربانی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا گیا۔ وہ ایک نڈر، بلند ہمت اور اصول پسند سیاستدان تھے اور دہشت گردی کے خلاف ایک مضبوط چٹان ثابت ہوئے۔ پاکستان سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کی وصیت کے مطابق ان کا جد خد کا ہلالی پرچم میں لپٹا ہوا تھا اور جب ان کا جنازہ اٹھا تو قضا تلاوت کے نعروں سے معمولی سی۔ ان کی جرأت اور قوت ایمانی سے لوگ بے حد متاثر تھے، کیونکہ وہ دہشت گردی کی جانے وقوعہ پر سب سے پہلے پہنچتے، سوگواروں کے دکھ میں شریک ہوتے اور دہشت گردی کی لعنت ختم کرنے کے لیے حوصلوں کو ہمیز لگاتے۔ بلاشبہ وہ پوری قوم کا ایک عظیم سرمایہ تھے جو انسانی اور سیاسی رشتوں کی مضبوطی کے لیے شب و روز پوری لگن سے کام کر رہے تھے۔

ان کی شہادت سے چند روز پہلے جماعت اسلامی کے مایہ ناز رہنما پروفیسر غفور احمد اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ یوپی تہذیب کی نفاست، شرافت اور وضع داری کا ایک حسین مرقع تھے۔ ان کا شمار ایسی عظیم شخصیات میں کیا جائے گا جو وقت کو اپنے آدرشوں کے سانچے میں ڈھالتے اور اپنے افکار کی پاکیزگی اور گفتار کی مٹھاس اور صداقت سے دل و دماغ مسح کرتے ہیں۔ وہ ابھی کم عمر ہی تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ انھوں نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کے بجائے گھر گھر شربت بیج کر اپنے خاندان کی کفالت کا راستہ اپنایا اور تعلیم بھی جاری رکھی۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم کام کیا۔ وہ ۱۹۴۳ء میں اس وقت جماعت اسلامی سے متاثر ہوئے جب سیاسی طور پر ان کی ہمدردیاں مسلم لیگ سے وابستہ تھیں۔ پاکستان بنا تو کراچی ہجرت کی اور اردو کالج میں پڑھانے لگے پھر خرابی صحت کے باعث کراچی سے اوکاڑہ منتقل ہو گئے اور بی بی ٹی کالج میں اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔ مگر مزدوروں کے حقوق اور مساوات کے حق میں آواز اٹھانے پر فارغ کر دیئے گئے۔ ان کے مزاج میں غریبوں، محنت کشوں اور عام شہریوں کے لیے درد رچا بسا تھا اور اسی مقصد کے تحت انھوں نے انتخابی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ وہ ۱۹۵۸ء میں بلدیہ کراچی کے انتخابات میں کامیاب ہوئے جس میں جماعت اسلامی نے ۱۰۰ میں سے ۱۹ نشستیں جیت لی تھیں اور اسٹیبلشمنٹ میں شدید اضطراب پیدا ہو گیا تھا۔

۱۹۷۰ء کے انتخابات میں پروفیسر غفور احمد نامور سیاسی شخصیتوں کو شکست دے کر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور اپنی خدا واد صلاحیتوں اور اپنی مقناطیسی شخصیت کی بدولت قومی سرگرمیوں کا مرکز و محور بن گئے۔ انھوں نے ۱۹۷۳ء کے آئین کی تدوین میں نہایت عرق ریزی اور بالغ نظری سے کام کیا اور اس میں جو پارلیمانی اور اسلامی رنگ غالب نظر آتا ہے اس کا سہرا پروفیسر صاحب کے سر جاتا ہے۔ وہ ان دنوں متحدہ جمہوری محاذ کے سیکرٹری جنرل تھے اور ان کے صوبہ سرحد، بلوچستان اور سندھ کے اپوزیشن قائدین کے ساتھ گہرے رابطے بن چکے تھے۔ مولانا نورانی سے لے کر چودھری ظہور الہی، شیر باز خان مزاری، سردار شوکت حیات، خان عبدالولی خان، غوث بخش بزنجو اور نواب خیر بخش مری ان کی سیاسی بصیرت اور فہم و فراست پر اعتماد کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ رفیق باجوہ ایڈووکیٹ کے بعد وہ پی این اے کے سیکرٹری جنرل منتخب ہوئے اور بعد ازاں بھٹو صاحب کے ساتھ مذاکرات کی ٹیم کے رکن بھی بنے۔ انھوں نے اس امر کی سر توڑ کوشش کی کہ مذاکرات کامیاب ہو جائیں اور ملک مارشل لاء کے عذاب سے محفوظ رہے، بلکہ ان کی مخلصانہ ساعی پر مخالف عناصر غالب آ گئے۔ وہ جماعت کے فیصلے کے مطابق مارشل لاء میں نو ماہ وفاقی وزیر بھی رہے، مگر ان کی جمہوری سرشت نے اسے دل سے قبول نہیں کیا تھا۔

پروفیسر صاحب سیاست میں شرافت، میانہ روی اور باہمی رواداری کی ایک لازوال علامت کے طور پر ابھرے تھے۔ انھوں نے اپنے مشاہدات اور تجربات پر مشتمل نصف درجن کے لگ بھگ کتابیں تصنیف کیں اور بیماری کے باوجود اپنی صلاحیتیں انسانی اور اسلامی اقدار کی آبیاری میں لگے رہے۔ وہ امن اور دوستی کی جیتی جاگتی تصویر اور ہمارے خوابوں کی تعبیر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنازے میں ہر مسلک اور ہر مکتبہ فکر کے وابستگان آئے اور یہ پیغام دے گئے کہ معاشرے میں شرافت، امانت، دیانت اور شائستگی اور دھیمے لہجے کی آج بھی قدر دانوں کی بہت بڑی تعداد پائی جاتی ہے۔ جناب قاضی حسین احمد جنھوں نے پروفیسر صاحب کا جنازہ پڑھایا تھا دس روز بعد وہ بھی اچانک دارفانی سے کوچ کر گئے اور ان کے بچھڑ جانے کا غم پاکستان کے مختلف الخیال حلقوں کے علاوہ بہت سارے مسلم ممالک کے دینی حلقے شدت سے محسوس کر رہے ہیں۔ بلاشبہ ان کے اندر طوفانِ مٹھہرے ہوئے تھے اور ان کے سینے میں انقلاب انگیزیاں لیتے ہوئے تھے۔ وہ دیوبندی مسلک سے تعلق رکھنے والے گھرانے میں پیدا ہوئے، مگر ان کی ذہنی اور فکری رہنمائی عصر حاضر کے مجدد سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریروں، مجلسوں اور صحبتوں نے کی تھی۔ ان کے اندر مرد کوہستانی کی تمام خصوصیات پائی جاتی تھیں۔ ۱۹۷۰ء میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے اور اپنی بے پایاں صلاحیتوں اور غیر معمولی متحرک شخصیت کے باعث سیکرٹری جنرل اور اس کے بعد امارت کے منصب پر فائز ہوئے۔ وہ بائیس برسوں تک جماعت کی رہنمائی کرتے اور اسلامی اور جہادی تحریکوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں غیر معمولی حافظہ عطا کیا تھا اور انھیں قرآن کی بڑی سورتوں کے علاوہ اقبال کے اُردو اور فارسی کے بلا مبالغہ ہزاروں شعر یاد تھے۔ وہ ہزاروں کارکنوں کو بالعموم ان کے ناموں سے یاد رکھتے تھے۔ ان کی شخصیت میں وجاہت کے علاوہ بڑی گرمجوشی تھی جو لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔



ہمارے مستقبل پر اثر انداز ہونے والے واقعات

پچھلے دو ماہ بہت ہنگامہ خیز رہے کہ انہونیوں کا سلسلہ ایک دوسرے کے ساتھ کچھ اس طرح جڑا ہوا تھا کہ ہماری ریاست کا اسٹرکچر شدت سے متاثر ہوا ہے اور مستقبل کے امکانات میں بھی زبردست ارتعاش نظر آتا ہے جس کے باعث آج قومی مباحثے کا عنوان ہی تبدیل ہو گیا ہے۔

تازہ حالات کا تجزیہ۔ الطاف حسن قریشی کے قلم سے

پانچ سالہ سیاسی تاریخ چند پہلوؤں سے اُمید افزا، مگر بحیثیت مجموعی بڑی مایوس کن معلوم ہوتی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ منتخب حکومتیں اپنی آئینی مدت پوری کرنے والی ہیں اور انتقال اقتدار، توقعات کے مطابق، پُر امن اور جمہوری ہو گا۔ یہ امر قابل تعریف ہے کہ اُمروں نے اپنے اقتدار کو طول دینے کے لیے دستور میں تباہ و تاراج کا جو ایک حصار کھینچا تھا، اُسے پارلیمنٹ نے بڑی دانائی اور باریک بینی سے منہدم کر ڈالا ہے اور چھوٹے صوبوں کو داخلی خود مختاری مل گئی ہے اور مالیاتی وسائل بڑی فیاضی سے وفاق سے صوبوں کی طرف منتقل ہوتے رہے ہیں۔ یہ الگ بات کہ آئینی ترامیم کے وقت رازداری کا پردہ تان لینے سے اس پورے عمل کے اندر توازن قائم نہیں رہ سکا اور وفاقی اسٹرکچر خاصا کمزور ہو گیا ہے جبکہ صوبے نئی ذمہ داریاں سنبھالنے کی سکت نہیں رکھتے، چنانچہ گزشتہ برسوں میں ایک انتظامی اور مالیاتی انتشار پھیل گیا ہے اور سیاسی انحلال پیدا ہوا ہے۔

خرابیوں کی جڑ حکمرانوں کی نااہلی، کوتاہ نظری اور بدترین بدعنوانی کے علاوہ حساس اور نازک امور کے بارے میں اُن کے غیر سنجیدہ، غیر ذمہ دارانہ اور غیر جمہوری رویے ہیں۔ اس حقیقت سے ہم سب واقف ہیں کہ بلوچستان کے اندر بد امنی بڑھتی جا رہی ہے اور ویرانوں، شہر اہلوں اور بستیوں سے ہلکی ہوئی لاشیں برآمد ہو رہی ہیں، شہروں کے اندر بھی انسانی زندگی غیر محفوظ ہے اور اغوا کی وارداتوں اور نارگٹ کلنگ نے معاشرے کا ڈھانچہ ہلا کے رکھ دیا ہے۔ ہزارہ قبیلے کے افراد چن چن کر بڑی سفاکی سے قتل کیے جا رہے ہیں جبکہ ایک بھی قاتل گرفتار نہیں کیا جا سکا۔ سپریم کورٹ نے مٹرٹی ہوئی صورت حال کا از خود نوٹس لیا، کونسلر جنسری میں بھی کیس کی متعدد بار ساعت کی، ایف سی اور پولیس کی اعلیٰ قیادت کا انتہائی کڑا احتساب کیا گیا اور یہ اُمید پیدا ہوئی کہ لاپتہ افراد کے انتہائی گھمبیر مسئلے پر جلد قابو پا لیا جائے گا، مگر عوام کی اُمیدیں بر نہ آسکیں، البتہ سردار اختر مینگل جو دہائی میں خود ساختہ جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہے ہیں، وہ سپریم کورٹ پر اعتماد کا اظہار کرتے ہوئے اس میں پیش ہوئے اور بلوچستان کے بحران پر قابو پانے کے لیے کہ ایک چھ نکاتی ایجنڈا پیش کیا جو بحث مباحثے کی دھند میں تحلیل ہو چکا ہے۔ چند ماہ

وہ پاکستان اور امت مسلمہ کے جملہ مسائل کی جڑ مسلمانوں کے اندر پائے جانے والے افتراق اور انتشار کو سمجھتے تھے، چنانچہ انھوں نے ان تھک اور پیہم کوششوں سے تمام مکاسب فکر کی نمائندہ جماعتیں ملی یکجہتی کونسل کے پلیٹ فارم پر جمع کر دی تھیں جو ایک معجزہ سے کم نہ تھا۔ ان مساعی سے فرقہ وارانہ خوریزی میں بہت کمی واقع ہوئی اور اخوت اور بھائی چارے کی فضا پروان چڑھنے لگی۔

متحدہ مجلس عمل کا سیاسی کارنامہ بھی جناب قاضی حسین احمد کے عہد امارت میں سرانجام پایا جس نے ۲۰۰۲ کے انتخابات میں زبردست انتخابی کامیابیاں حاصل کیں اور صوبہ سرحد میں تاریخ میں پہلی بار اسلامی جماعتوں کی حکومت قائم ہوئی۔ اس نے قومی سیاست کا رخ یکسر تبدیل کر دیا تھا۔ یہ الگ بات کہ بعض وجوہ سے اچھی حکمرانی کا نقش قائم نہ ہو سکا۔ اسلامی جمہوری اتحاد کے قیام میں بھی قاضی صاحب اور سید منور حسن کا بہت اہم اور فیصلہ کن کردار تھا۔ وہ رشتے اور دل جوڑنے میں کمال مہارت رکھتے اور غیر معمولی ریاضت اور اخلاص اور محبت کا عملی ثبوت دیتے تھے۔

قاضی صاحب ایک طوفان آشنا سیاستدان، اعلیٰ منتظم اور جواں عزم قائد ہونے کے علاوہ ایک بہت بڑے مجاہد اور اسلامی تحریکوں کے روح رواں بھی تھے۔ ان کے ایران، سعودی عرب، ترکی اور سوڈان کے حکمرانوں سے خصوصی برادرانہ مراسم تھے۔ ان کا دل کشمیر، فلسطین، بوسنیا اور چیچنیا کے مظلوم اور خستہ حال مسلمانوں کے لیے دھڑکتا رہتا تھا۔ ان کی درد مندی کا یہ منظر بھی لوگوں نے دیکھا کہ وہ علاج کرانے انگلستان گئے تو ذرا مہلت ملتے ہی نفس نفیس بوسنیا کے مسلمانوں کی مدد کے لیے پہنچ گئے۔ وہ اپنے ورلڈ ویو کے مطابق چین کی کمیونسٹ پارٹی سے مذکرات کے لیے جہنگ گئے اور اس ملک کو اسلام کا آفاقی پیغام پہنچایا اور اسلامی تہذیب کے فروغ کے لیے اشتراک عمل کی دعوت دی۔ وہ امریکی اور بھارتی بلا دستی کے سخت خلاف تھے اور برابری کی سطح پر تعلقات کے حامی تھے۔ الغرض ان کی کتاب زندگی کا ہر باب دعوت و عزیمت کی ایک ناقابل فراموش داستان لیے ہوئے ہے جو عشق رسول ﷺ سے ترتیب پائی ہے۔

الطاف حسن قریشی

بعد جوں جوں ۱۶ دسمبر قریب آتا گیا، عوام کے تحت الشعور میں یہ احساس ابھرنے لگا کہ خاکم بدھن مشرقی پاکستان کی طرح بلوچستان میں بھی ہم کسی ایسے سے دوچار نہ ہو جائیں، کیونکہ حکمرانوں کے کچھن اسی انداز کے ہیں۔

راقم الحروف پانچا کے سیکرٹری جنرل کی حیثیت سے جولائی ۲۰۱۲ء سے لاہور میں بلوچستان پر قومی کانفرنس بلانے کے لیے کوشاں تھا جس میں بلوچستان کے سیاسی اور مذہبی نمائندوں اور لاہور کی علمی، سیاسی اور صحافتی شخصیتوں کے درمیان مکالمے کے ذریعے قیام امن اور ترقی کا ایک قابل عمل روڈ میپ تیار کیا جاسکے۔ لاہور میں کانفرنس کے انعقاد کا سب سے بڑا مقصد بلوچستان اور پنجاب کے باہمی رشتے مضبوط کرنا اور بلوچ بھائیوں کے اندر تنہائی کا جو احساس بڑھتا جا رہا ہے، اُسے تختوں اور سماجی قریبوں سے دور کرنا تھا۔ سامع مشرقی پاکستان کے بڑے بڑے اسباب میں سیاسی رشتوں کا مکمل طور پر ٹوٹ جانا، صحیح صورت حال تک رسائی کا ممکن نہ رہنا اور باہمی اعتماد کا اٹھ جانا تھا۔ مشرقی پاکستان کے بھائیوں کو زیادہ تر شکایات پنجاب سے تھیں کہ اُس کی سول اور فوجی افسر شاہی اُن کے حقوق پر شتون مارتی رہی اور اہل دانش ایک مؤثر کردار ادا کرنے میں ناکام رہے تھے، اس اعتبار سے بلوچستان کے حوالے سے پنجاب کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے۔ ہمیں پورا یقین تھا کہ بلوچستان کانفرنس درست سمت میں ایک بروقت قدم اور حقیقی مفاہمت کی فضا پیدا کرنے میں بہت مددگار ثابت ہوگی کیونکہ تین روزہ قیام کے دوران وسیع پیمانے پر تبادلہ خیال کے ذریعے مسائل کی بہتر تفہیم اور باہمی تعاون کی راہیں کشادہ ہوں گی۔

پانچا کے تنظیمیں مشرقی جذبے سے مصروف کار ہو گئے اور کئی کئی بار بلوچستان کے ہمیں کے لگ بھگ سیاسی اور مذہبی راہنماؤں سے رابطے کیے گئے۔ اُن میں سے بیشتر کے ساتھ ہانمانہ اردو ڈائجسٹ کے توسط سے پہلے ہی ایک ذہنی رشتہ قائم تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ ہر طبقہ فکر کے نمائندے کانفرنس میں بلائے جائیں تاکہ ایک مکمل صورت حال ابھر کر سامنے آجائے۔ رابطے قائم کرنے کے بعد راقم نے پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران سے ملاقات کی اور پانچا اور پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام قومی کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز دی۔ مقصد یہ تھا کہ سیاست دانوں، صحافیوں، تجزیہ نگاروں اور یونیورسٹی کے اساتذہ اور طلبہ کو بھی بلوچستان کے اصل حقائق سے ٹھیک طور پر آگاہی ملے اور وہ قومی شعور کی بیداری میں فعال کردار ادا کر سکیں۔ وائس چانسلر صاحب نے میری تجویز سے اتفاق کرتے ہوئے پورے تعاون کا یقین دلایا اور پروفیسر ڈاکٹر شوکت علی، جناب اکرم چودھری اور جناب ایثار رانا پر مشتمل ایک ٹیم بھی تشکیل دی۔ بلوچستان قومی کانفرنس کو مزید تیز اور بنانے کے لیے میں نے وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف سے اس کا افتتاح کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے قومی یک جہتی کا یہ منصوبہ بہت پسند کیا اور کانفرنس کے مندوبین کے اعزاز میں عشاءِ دینے کی فراخ دلانہ پیشکش کی۔ کانفرنس کی تاریخیں ۲ اور ۳ جنوری مقرر ہوئیں۔ انہی دنوں جناب ڈاکٹر قادری کے مینار پاکستان پر نزول سے عوام کے جذبات میں بھی بھونچال سا آگیا تھا، لیکن ہم نے اپنی تیاریاں جاری رکھیں کہ بلوچستان کے بھائیوں کے ذہنوں پر ہم رکھنا اور انہیں محبت کی آغوش میں سمیٹ لینا اُس ضروری تھا۔

دسمبر کے آخر میں لاہور کا موسم اچانک اس قدر سرد ہو گیا کہ برسوں کا ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ گہری دھند کے باعث یہ خطرہ پیدا ہو گیا کہ مندوبین مقررہ تاریخوں پر شاید لاہور پہنچ ہی نہ سکیں۔ خوش قسمتی سے ایک روز پہلے مطلع صاف ہو گیا، مگر بعض احباب موسم کی خرابی کے پیش نظر جہاز کے بجائے دو روز کے سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے لاہور پہنچ گئے۔ نواب غوث بخش باروئی یکم جنوری کو پنجاب یونیورسٹی کے ایگزیکٹو کلب آگئے جہاں مہمانوں کے قیام کا انتظام تھا۔ اسی طرح نصف شب کے لگ بھگ بلوچستان میں جماعت اسلامی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل جناب عبدالقیوم کاکڑ دو سیاسی کارکنوں کے ہمراہ تشریف لے آئے۔ اُن کا ذوق و شوق دیدنی تھا اور وہ بلوچستان کے بگڑتے ہوئے حالات کے تناظر میں قومی کانفرنس کو بڑی اہمیت دے رہے تھے۔ اس کے بعد

مہمانوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو گیا اور لاہور کی سیاسی زندگی کا رنگ نکھر نکھڑ گیا۔ مسلم لیگ (ن) سے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل عبدالقادر بلوچ آئے جو بلوچستان کے کورمانڈر اور گورنر بھی رہ چکے ہیں اور ان دنوں قومی اسمبلی کے معزز رکن ہیں۔ وہ اس علاقے کی نمائندگی کر رہے ہیں جہاں ایک شورش بپا ہے۔ اسی جماعت سے وابستہ جناب انوار الحق کا کڑ بھی ہمارے منصوبہ تھے جو علامہ اقبال کے زبردست مداح اور اسلامی تاریخ کے غوطہ زن ہیں۔ پیپلز پارٹی کے رکن قومی اسمبلی اور وزیر مملکت ڈاکٹر آیت اللہ درانی مستونگ کے حلقے سے منتخب ہوئے ہیں جو ان دنوں باغیانہ رجحانات کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ بلوچستان کے انسائیکلو پیڈیا جناب سید فصیح اقبال کے آنے سے کانفرنس کی قدر و قیمت میں کمی گنا اضافہ ہوا۔ حاضریں نے اُن کا بڑی گرجوٹی سے خیر مقدم کیا کہ انہیں چند روز پہلے بلوچستان یونیورسٹی نے اُن کی عظیم خدمات کے اعتراف میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری دی ہے۔

کانفرنس کے مندوبین میں جناب ڈاکٹر جہاں زیب جمال دینی شامل تھے جو بلوچستان نیشنل پارٹی (مینگل) کے قائم مقام صدر اور بڑے سچھے ہوئے ذہن کے مالک ہیں۔ کراچی سے نیشنل پارٹی کے سیکرٹری جنرل جناب طاہر بن غوث شریف لائے۔ جو انوں کے نمائندے جناب لیاقت شاہوانی بھی ہمارے مہمان تھے جو سسکی کی گہرائی تک پہنچنے اور صحیح تجزیہ کرنے کی غیر معمولی صلاحیت رکھتے ہیں۔ جناب عبدالکیم بلوچ ہماری دعوت پر بڑی بے تکلفی سے آئے جو کئی سال بلوچستان کے چیف سیکرٹری رہے، طالب علمی کے زمانے میں طلبہ سیاست میں بھرپور حصہ لیتے رہے اور بلوچستان پر ایک نہایت بیش قیمت کتاب تصنیف کر چکے ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام (ف) کے ممتاز راہنما حافظ حسین احمد بھی طویل سفر طے کر کے کانفرنس میں شرکت کے لیے آئے، وہ بلوچ علاقے سے منتخب ہو کر آتے رہے ہیں اور گہری بصیرت کے مالک ہیں۔ بگٹی پیٹریاٹک (patriotic) کونسل کے چیئرمین جناب سرفراز بگٹی اور ہزارہ ڈیموکریٹک پارٹی کے چیئرمین جناب عبدالخالق ہزارہ کے سینوں میں قیمتی راز پوشیدہ ہیں۔ اسلام آباد سے ہم نے سیمر جنرل (ر) محمد فاروق کو بطور خاص دعوت دی کہ وہ ۲۰۰۶ء اور ۲۰۰۷ء میں کونسل کے جی اوی رہے اور اُن کی کوششوں سے چملا لنگ کا منصوبہ شروع ہوا۔ کلبو میں ساہا سال سے قبا کی جنگ و جدل کے باعث کونسل کی کابینہ بند پڑی تھیں، جنرل صاحب نے اُن کے مابین صلح کرائی اور کالوں میں کام شروع ہو گیا جو اب صوبے کی معیشت کا تازہ خون فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ معیاری تعلیم کے ادارے بھی قائم کر رہا ہے۔ اُن کی کمان کے دوران ہزارہ قبیلہ بھی ٹارگٹ کلنگ سے محفوظ رہا تھا۔

سردی کے باوجود پنجاب یونیورسٹی کا لازمی ہال کھپا کھچ بھرا ہوا تھا اور ذی شعور مدعوین بلوچستان کے بھائیوں کا حالی دل سننے اور اُن سے اظہار یک جہتی کے لیے جوق در جوق آرہے تھے۔ یہ منظر ہماری سیاسی زندگی کی ایک تابندہ علامت اور باہمی رشتوں کا ایک دلکش اظہار تھا۔ کانفرنس کے تین اجلاس ہوئے جن میں مقررین کی تحفظ یا لچکچاہٹ کے بغیر حالات کی حقیقت جانتی تصویر کھینچتے رہے اور شرکاء پوری یک سوئی اور انتہا سے مہمانوں کے تاثرات اور احساسات کا جائزہ لیتے رہے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر ڈاکٹر مجاہد کامران نے کانفرنس کا افتتاح کیا اور تیس سے زائد مقررین نے بلوچستان کی تاریخ اور تازہ ترین حالات کی روشنی میں مسائل کا تجزیہ اور حل پیش کیا۔ لاہور سے ڈاکٹر حسن عسکری رضوی، جناب قیوم نظامی، جناب سید فخر امام، جناب ہمایوں اختر خاں، جناب احسان وانیں، بریگیڈیئر (ر) فاروق حمید خاں، جناب شاہد حامد، جناب یعقوب چوہدری، بریگیڈیئر (ر) نادر میر اور معروف قانون دان اور دانش ور جناب ایس ایم ظفر نے خطاب کیا۔ پانچا کے سیکرٹری جنرل الطاف حسن قریشی نے حالات کی سنگینی کا احساس دلاتے ہوئے قومی یک جہتی کی ایک مربوط پالیسی وضع کرنے اور آپس میں رابطے بڑھانے اور عدل و انصاف اور قانون کے مطابق امور مملکت چلانے اور مسائل کو طاقت کے بجائے سیاسی طور پر حل کرنے کا فارمولہ پیش کیا۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ گلے شکووں اور ماضی میں ہونے والی اعصاب شکن زیادتیوں کے باوجود ہر مقرر اس یقین اور اعتماد سے سرشار تھا کہ بلوچستان پاکستان کا اٹوٹ انگ اور اسٹریٹجک خزانہ ہے جس کے عوام کسی بیرونی طاقت کی غلامی کا آپشن کبھی اختیار نہیں کریں گے۔ اسی طرح کانفرنس کا یہ پہلو بھی حد درجہ فکر انگیز تھا کہ سابق فوجی اور پولیس افسروں نے بلوچستان کے بعض علاقوں میں نیم

بغاوت فرو کرنے کے لیے سیاسی راستہ اپنانے اور ایک ایسا معاشرہ تشکیل دینے پر زور دیا جس میں ہر شہری کو یکساں حقوق اور مواقع حاصل ہوں۔ اُن کا خیال تھا کہ ”بھول جاؤ اور معاف کرو“ کی پالیسی پر عمل پیرا ہونے سے دل اور دماغ جیتے اور اعتماد کے رشتے از سر نو قائم کیے جاسکتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ فوج بلوچستان میں جو ترقیاتی کام کر رہی ہے، اہلی معیار کے تعلیمی ادارے اور ہسپتال کھولی جا رہی ہے، انفراسٹرکچر کی تعمیر پر توجہ دے رہی ہے، بری اور فضائی فوج کی ان تعمیری سرگرمیوں سے اچھے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ فوج میں بلوچستان کو آبادی کے لحاظ سے چند روز پہلے نمائندگی حاصل ہو چکی ہے اور جنرل کیانی نے نئی جھانپوں کے مجوزہ منصوبے ختم کر دیے ہیں اور اُن کی جگہ ٹیکنیکل تعلیم کے ادارے کھولے جا رہے ہیں۔ اگر وفاقی اور صوبائی حکومتیں تمام تعلیم یافتہ نوجوانوں کے لیے روزگار کا انتظام کر سکیں، تو حالات بڑی حد تک معمول پر آجائیں گے اور ایک جواں بہت قیادت کے آگے آنے کے امکانات روشن ہوتے جائیں گے۔

بلوچستان سے آئے ہوئے زیادہ تر دوستوں نے اس خیال کا اظہار کیا کہ مرکز کی طرف سے سیاسی جماعتوں کی قوت پر کاری ضرب لگانے، جمہوری عمل پر شیون مارنے اور متعدد پارلیمانی آئین شکنی کرتے رہنے سے باہمی اعتماد کے رشتے انتہائی کمزور پڑ گئے ہیں۔ لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کے تجربے کے مطابق بلوچ نوجوانوں کی موجودہ بغاوت نواب اکبر بگٹی کی شہادت کے بعد منظم ہوئی ہے۔ جناب طاہر بزنجو کہہ رہے تھے کہ مرکز بلوچستان کے بارے میں کبھی سنجیدہ نہیں ہوا اور وہ ہمارے خلاف برہنہ طاقت استعمال کرتا رہا اور آج لاپتہ افراد کی بڑھتی ہوئی تعداد بلوچستان کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ ڈاکٹر جہاں زیب جمال دینی کی رائے میں اس وقت جمہوری جماعتوں کو بڑے خطرات کا سامنا ہے، کیونکہ ایک طرف حکومت اپنی ایجنسیوں کے ذریعے ہمارے سیاسی کارکن موت کے گھاٹ اتار رہی ہے اور دوسری طرف باغی بلوچ ہم پر حملہ آور ہو رہے ہیں۔ بلوچستان میں حکومت محض نام کی ہے، کیونکہ تمام اختیارات فوج اور ایف سی نے سنبھال رکھے ہیں۔ حاجی عبدالقیوم کا کڑے کہا کہ پشتون اضلاع پر امن ہیں اور ہمیشہ کو سنبھالا دے ہوئے ہیں، حالانکہ انہیں بگٹی کی طویل لوڈ شیڈنگ کا سامنا ہے۔ اُن کے خیال میں تعلیم، سماجی ترقی اور انصاف کی فراہمی کو اولین ترجیح دینی چاہیے۔ ڈاکٹر آیت اللہ درانی کا نقطہ نظر یہ تھا کہ زیادہ تر مسائل سرداروں کی باہمی چیختن، مذہبی انتہا پسندوں کی تنگ نظری اور سیاسی لیڈروں کی خود غرضی نے پیدا کیے ہیں۔ حافظ حسین احمد اور سید فتح اقبال اس امر کے شاکس تھے کہ صدر اور وزیراعظم بلوچستان میں قیام کرنے اور مسائل کی تہ تک پہنچنے اور نوجوانوں پر ترقی کے دروازے کھولنے میں ذرا دلچسپی نہیں رکھتے۔ سرفراز بگٹی نے بڑے اعتماد سے کہا کہ نان اسٹیٹ ایلٹرز کا ڈٹ کر مقابلہ کرنے کے لیے امن کی قوتوں کو منظم ہونا اور فوج کی پشت پر کھڑا ہونا چاہیے۔ جناب انوار الحق کا کڑے ایتقان افروز لہجے میں کہا کہ ریاست مدینہ کی طرز پر معاشرے کی تشکیل سے امن، ترقی اور خوشحالی کے دروازے کھل سکتے ہیں۔ سپریم کورٹ پارلیامینٹ کے سابق صدر جناب یاسین آزاد نے انکشاف کیا کہ سپریم کورٹ کے اخذ نوٹس لینے سے لاپتہ افراد کی تعداد خاصی کم ہوئی ہے اور فیئر ٹرائل کے امکانات پیدا ہوئے ہیں۔ اُن کا اصرار تھا کہ بعض بیرونی طاقتیں گواہ رپورٹ، صوبے کے بیش بہا معدنی وسائل اور وسیع و عریض ساحل پر لپٹائی ہوئی نظریں جمائے ہوئے ہیں۔ اُن کے خطرناک عزائم کو ناکام بنانے کے لیے ہمیں غیر معمولی قوت ارادی، یک جہتی اور ہوش مندی کا ثبوت دینا اور قانون کی حکمرانی کا قبول بالا کرنا ہوگا۔

بلوچستان کے تمام سیاسی رہنماؤں نے انتخابات میں حصہ لینے اور جمہوریت کو مستحکم کرنے کا عزم ظاہر کیا، مگر ساتھ ساتھ اس امر کی بھی نشان دہی کی کہ آنے والے انتخابات کے نتائج ۲۰۰۸ء کے انتخابات سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہوں گے، کیونکہ گزشتہ پانچ برسوں میں ایک ایک ایم پی اے کو ایک ایک ارب روپے سے زائد ترقیاتی کاموں کے لیے دیے جا چکے ہیں جو اب ووٹ کی خرید پر خرچ کیے جائیں گے۔ اُن کا مطالبہ تھا کہ انتخابی اصلاحات، میڈیا اور سول سوسائٹی کے ذریعے پیسے کا غیر صحت مندانہ اثر و رسوخ ختم کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ بلوچستان کی قومی اور صوبائی نشستوں میں اضافے کو قومی مباحثے کا حصہ بنایا جائے،

کیونکہ ایک حلقہ انتخاب دو اور تین تین اضلاع پر مشتمل ہے اور ایک متوسط درجے کے امیدوار کے لیے وٹروں تک پہنچنا بہت دشوار ہے۔ سینٹ کے اختیارات میں اضافے اور اُس کے براہ راست انتخابات کرانے پر بھی زور دیا گیا۔ اس امر پر بھی اتفاق پایا گیا کہ ایجنسیوں کو انتخابات میں ہر طرح کی مداخلت سے روکا جائے، انہیں ضابطوں کا پابند بنایا جائے اور ایسا سازگار ماحول پیدا کیا جائے جس میں سیاسی جماعتیں انتخابات میں آزادی سے، بے خوف و خطر حصہ لے سکیں۔ کانفرنس میں یہ اعلان بھی کیا گیا کہ بلوچستان میں امن پاکستان کے علاوہ شرق وسط وسطی اور جنوبی ایشیا کے لیے بھی ناگزیر ہے، اس لیے اس خطے میں قیام امن اور استحکام کی ذمہ داری تمام اسٹیک ہولڈرز پر عائد ہوتی ہے۔ یہ بات بھی نوٹ کی گئی کہ بلوچستان کے حوالے سے فوجی قیادت کی پالیسی میں صحت مندی تبدیلی آئی ہے جو اب عوام کی فلاح و بہبود اور جان و مال کے تحفظ کو اولین اہمیت دے رہی ہے، چنانچہ اس توقع کا اظہار کیا گیا کہ جنرل اشفاق پرویز کیانی مزید اعتماد افزا اقدامات کریں گے، امن فورس کو آئینی حدود میں رکھیں گے جبکہ وفاقی حکومت ناراض گروپوں کے دل جیتنے کے لیے سماجی انصاف، معاشی ترقی اور یکساں ڈویلپمنٹ کو یقینی بنائے گی۔ حکومت سے یہ مطالبہ بھی کیا گیا کہ سول اور فوج کی اعلیٰ سطح کی بیوروکریسی میں بلوچستان کو قابل ذکر نمائندگی دی جائے اور عوام کو حقوق اور صوبائی خود مختاری دینے کے جواعلانات کیے گئے ہیں، اُن پر دیانت داری سے عمل درآمد کیا جائے۔

کانفرنس میں اعلان کیا گیا کہ بلوچستان کو داخلی اور خارجی خطرات سے محفوظ رکھنے کے لیے سول اور فوجی قیادت، میڈیا، سول سوسائٹی، مذہبی راہنما، دانش ور اور وکلاء آگے آئیں اور سر دھڑکی بازی لگا کر امن کے دشمنوں کو شکست دیں، بلوچستان کے وسائل پر قبضہ کرنے کے خواب دیکھنے والی بیرونی طاقتوں کے عزائم ناکام بنا دیں اور ہزارہ قبیلے پر ہونے والے مظالم کا فوری طور پر سد باب کریں۔ مقررین نے اس امر پر قدرے اطمینان کا اظہار کیا کہ تمام قومی جماعتیں بلوچستان کے ساتھ یک جہتی کا اظہار کر رہی ہیں اور سول سوسائٹی پہلے کے مقابلے میں بہت زیادہ متحرک ہے۔ پاکستان کے اہم شہروں میں بلوچستان کی صورت حال پر مذاکرے ہو رہے ہیں اور سپریم کورٹ کی طرف سے ایک قابل قدر اور حوصلہ افزا کردار ادا کیا جا رہا ہے۔ اس حوالے سے حکومت پنجاب کا خصوصی شکریہ ادا کیا گیا کہ اُس نے این ایف سی ایوارڈز میں اپنے حصے کے سالانہ دل ارب روپے رضا کارانہ طور پر بلوچستان کو دے دیے ہیں اور بلوچ طلبہ پنجاب کے معیاری اداروں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ اسی طرح پنجاب یونیورسٹی کا یہ اقدام بھی سراہا گیا کہ وہ سول بلوچ طلبہ کو مفت تعلیم فراہم کرنے کے علاوہ ہر طالب علم کو تین ہزار روپے ماہانہ وظیفہ بھی فراہم کر رہی ہے۔ کاروان علم فاؤنڈیشن کی یہ پیشکش بھی قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی کہ وہ ایک سول بلوچ طلبہ کے تعلیمی اخراجات برداشت کرے گی۔

کانفرنس کے اختتام پر وزیر اعلیٰ پنجاب جناب شہباز شریف نے مندوبین کے اعزاز میں عشاء نہ دیا جس میں سردار ذوالفقار کھوسہ، خواجہ سعد رفیق اور جناب عطا الحق قاسمی بھی مدعو تھے۔ معزز مندوبین نے کھل کر اپنے اس احساس کا اظہار کیا کہ حالات کو صحیح رخ دینے اور بلوچستان کو مسائل کی دلدل سے نکالنے میں پنجاب اور خاص طور پر مسلم لیگ ن کا کردار غیر معمولی اہمیت کا حامل ہے اور ہم آپ سے اس امر کی ضمانت چاہتے ہیں کہ مرکز میں حکومت بنانے کے بعد آپ ہمارے حقوق کا تحفظ کریں گے اور بلوچستان کی سیاسی جماعتوں کو اپنے ساتھ لے کر چلیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں یہ بھی توقع ہے کہ آپ کی جماعت فوج کو بھی آئینی حدود میں رکھ سکے گی۔ جناب شہباز شریف نے جمہوریت کے ساتھ اُن کی وابستگی کا حیر مقدم کیا اور اپنے اس عزم کا اظہار کیا کہ ہماری جماعت پاکستان کے جغرافیائی طور پر سب سے بڑے صوبے اور غیور بلوچوں کی سر زمین کو قومی دھارے میں لانے کے لیے اپنا قومی فرض ادا کرتی رہے گی۔ انہوں نے لیفٹیننٹ جنرل (ر) عبدالقادر بلوچ کو کانفرنس کا ورلنگ سپر تیار کرنے کی ذمہ داری سونپی تاکہ بلوچستان کے عوام کے بہتر مستقبل کے لیے عملی اقدامات کی ترجیحات طے کی جاسکیں۔ اس موقع پر میں نے استدعا کی کہ آپس میں رابطوں کا ایک قابل اعتماد نظام قائم کیا جائے اور قومی یک جہتی کو فروغ دینے کے لیے ایک ہمہ پہلو پالیسی وضع کی جائے۔ عشاء پر پڑھ کھنے کا مکالمہ بہت ایتقان افروز تھا۔ کانفرنس کے مندوبین جناب وزیر اعلیٰ پنجاب جناب

سردار ذوالفقار کوہسہ اور خواجہ سعد رفیق کی گفتگو سے بڑے متاثر ہوئے اور اُن کے اندر یہ اعتماد اور حوصلہ پیدا ہوا کہ پنجاب کی سیاسی قیادت بلوچستان کے بارے میں نہایت مخلص اور پُر جوش ہے اور پریشان حالی اور درماندگی میں ایک اچھے دوست کی طرح اپنے بھائیوں کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لینا چاہتی ہے۔ ۱۳ جنوری کا دن مہانوں کو جناب سجاد میر، جناب فرخ سہیل گوندی اور جناب عطاء الرحمن جیسے دانش وروں سے تہذیبہ خیال اور لاہور کے مکتبہ پھولوں سے مشام جاں تازہ کرنے میں گزرا۔ پاکستان کی عظیم علمی اور صحافتی شخصیت عزیزی مجیب الرحمن شامی نے مندوبین کے اعزاز میں عشائیہ دیا جس میں کالم نگار، تاریخ شناس اور آئین و قانون کے شاعر مدعو تھے۔ وہ گھنٹہ تک بے تکلف گفتگو ہوئی اور تاریخی غلط فہمیوں اور ذہنی اشکال کے کاٹنے صاف ہوتے گئے۔ میڈیا نے کانفرنس کی اچھی کوریج کی جس کے ذریعے قوم کے اندر بلوچستان کی صورت حال میں بنیادی تبدیلی برپا کرنے کی لہر پیدا ہوئی اور یہ تاثر گہرا ہوا کہ بلوچستان قومی کانفرنس ہمارے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب کرے گی۔

چھلنے لگا، تب حکومت کو صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا اور ۱۳ جنوری کو رات کے ۲ بجے جناب وزیر اعظم اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ علمدار روڈ پہنچے جہاں انہیں مظاہرین کے ساتھ زمین پر بیٹھنا پڑا۔ شدید سردی میں ٹھہرتے ہوئے لوگوں نے وزیر اعظم صاحب سے مکالمہ شروع کر دیا جس پر ہمارے وزیر اطلاعات و نشریات جناب کارہ پیش میں آگئے اور فرمانے لگے کہ وزیر اعظم سے ڈیالگ نہیں کیا جاتا۔ اس پر ایک صاحب نے ترش لہجے میں پوچھا کیا وہ ہمارے واسرائے ہیں کہ اُن سے بات نہیں کی جا سکتی۔ جب معاملہ بگڑنے لگا تب جناب راجہ پرویز اشرف نے مظاہرین کے سارے مطالبات مان لیے اور ۱۴ جنوری کو گورنر راج کے نفاذ کا نوٹیفکیشن جاری کر دیا گیا اور سیکوری کے جملہ معاملات کو ریکمانڈر کے سپرد کر کے ایف سی کو پولیس کے اختیارات دے دیے گئے۔ معاہدے کے مطابق مظاہرین اپنی متبتیں اٹھا کر خاموشی سے چلے گئے۔ بے حس، غیر منجیدہ اور عاقبت نااندیش حکومت نے پُر امن دھروں کے آگے گھٹنے ٹیک دیے اور یوں ہمارے مستقبل کے گرد ایک اور سرخ دائرہ کھینچنا چلا گیا۔

یہ وہی تاریخیں تھیں جب ڈاکٹر طاہر القادری ہزارہ قبیلے کے طرز پر اپنے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں عورتوں، شیر خوار بچوں، بوڑھوں اور جوانوں کے ہمراہ زبردست پبلٹی کے جلو میں لاگ مارچ پر نکلے تھے اور انہوں نے کرپٹ انتخابی نظام اور کرپٹ حکمرانوں کے خلاف پُر امن اعلان جنگ کر دیا تھا۔ اُن کی تقریروں میں حق و صداقت کی گونج اور عوام کے دل کی آواز سنائی دیتی تھی۔ اُن کے معتقدین اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے دیوانہ وار اُٹھ پلے آ رہے تھے جن کا نظم و ضبط ویدنی اور اُن کے نعروں کا جواب عرش سے آنے لگا تھا۔ چشم فلک شیخ الاسلام کی عظیم قائدانہ صلاحیتوں پر رنگ رہ گئی تھی اور نبض کا نکتا شاید کچھ دیر کے لیے رکتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ سلیش کو کے ایوانوں میں زلزلہ اچکا تھا اور عوام کو یقین ہو چلا تھا کہ انقلاب اُن کے قدم چومنے ہی والا۔ جناب علامہ قادری نے خونِ محمد کرنے والی سردی میں پارلیمنٹ سے ڈرافٹ صلی پر پانچ روز قیام کیا اور قومی مباحثے کا عنوان بدل ڈالا۔ پورے ملک میں یہ احساس شعلہ صفت ہو چکا تھا کہ جاگیرداروں، بنکس، چوروں، بدکرداروں اور بدعنوان اور بالادست اشرافیہ سے نجات حاصل کرنا اور ایک شفاف اور قابل اعتماد انتخابی نظام کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔ ہمارے حکمران پاکستان کی دولت لوٹ کر باہر لے گئے ہیں اور عوام زندگی کی بنیادی ضرورتوں کے لیے ایڑیاں رگڑ رہے ہیں۔ جناب ڈاکٹر قادری نے اسلام آباد کو میدانِ کربلا قرار دیا اور اعلان فرمایا کہ حسینی قافلہ یزیدی قوتوں کو پاش پاش کر کے دم لے گا۔ اُن کی آواز عام آدمی کے دلوں کے تار ہلا رہی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سردی اور بارش میں ٹھہرتے ہوئے مریدین اور شیر خوار بچے اور خواتین بڑی استقامت کا ثبوت دے رہی تھیں، حالانکہ اُن کے حیر و مرشد ایک آرام دہ اور ہلٹ پروف کنٹینر میں ہر آزمائش سے محفوظ تھے اور جاں نثار خواتین اُن کی حفاظت پر مامور تھیں۔

جناب ڈاکٹر قادری نے اپنے سفر کا آغاز نہایت طویل مقاصد سے کیا تھا۔ وہ جعلی جمہوریت کا خاتمہ کر کے ایک حقیقی جمہوریت لانا اور غریبوں کی حکمرانی قائم کرنا چاہتے تھے۔ اُن کا اعلان تھا کہ حریص و نااہل حکمران عوام کو بنگلی اور گیس فراہم کر سکتے نہ ملک میں امن و امان اور انصاف قائم کرنے کی اہلیت اور نیت رکھتے ہیں، اس لیے اہل اور دیانت دار قیادت کو آگے لانے کے لیے بنیادی نوعیت کی انتخابی اصلاحات ضروری ہیں جن میں دستور کے آرٹیکل ۶۲ اور ۶۳ میں دی گئی شرائط پر عمل درآمد یقینی بنایا جائے۔ انہوں نے ایک نئے الیکشن کمیشن کے قیام اور نگران حکومت کی تشکیل میں عدلیہ اور فوج کو بھی اسٹیج ہولڈر بنانے کا مطالبہ کیا۔ وہ حکومت پر مستعفی ہونے اور اسمبلیاں فوری طور پر تحلیل کر دینے کے لیے زور ڈالتے رہے۔ ایک دن ارشاد فرمایا کہ اب وزیر اعظم اور تمام وزرا سابق ہو چکے ہیں۔ تقریر کے دوران یہ خبر آئی کہ پیر ایم کورٹ نے وزیر اعظم کو گرفتار کرنے کا حکم جاری کر دیا ہے تو فرمایا ہمارا آدھا کام ہو گیا ہے اور باقی کل ہو جائے گا۔ بد قسمتی سے اُن کے تیور اور گن گرج سے اُن کے حلیف بھی خوفزدہ ہو گئے اور ایم کیو ایم نے لاگ مارچ سے کنارہ کشی اختیار کر لی جبکہ عمران خاں بار بار کی دعوت کے باوجود ہنگامہ ہست و بود میں شریک نہیں ہوئے۔ اُدھر جناب نواز شریف اپوزیشن کی دس جماعتوں کو ایک نکتے پر جمع کرنے میں

جناب عبدالخالق ہزارہ جن کے ہمراہ اُن کے میڈیا ایڈیٹر بوستان بھی آئے تھے، کانفرنس میں اپنے شیعہ ہزارہ قبیلے کے حالات بیان کرتے وقت اُن کی آواز بھرا گئی تھی۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ہمارا قبیلہ امن پسند اور تعلیم یافتہ ہے اور ہمارے لوگ فوج میں بھی اعلیٰ عہدوں پر فائز ہیں اور کھیلوں میں بھی نام پیدا کر چکے ہیں۔ کسانداران چیف جنرل موی خاں کا تعلق بھی ہمارے قبیلے سے تھا۔ انہوں نے بڑے دکھ سے کہا کہ ایک مضبوطی کے تحت جس میں صوبائی حکومت بھی غالباً شامل ہے، ہمارے ۸۰۰ سے زائد باشندے قتل کیے جا چکے ہیں۔ ہمارے عمائدین کا ایک وفد وزیر اعلیٰ جناب اسلم ریسائی سے ملنے گیا اور قاتلوں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا، تو انہوں نے جواب میں کہا کہ میں آپ لوگوں کی کوئی مدد نہیں کر سکتا، البتہ آٹسو پونچھے کے لیے نٹو پیپر کا ایک ٹرک بھیج سکتا ہوں۔ ہم نے گورنر ہاؤس کے سامنے دھرنا دیا، مگر ہمدردی کا ایک لفظ بھی موصول نہیں ہوا۔ مقتولین کے خاندان پارلیمنٹ کے سامنے کی روز تک مظاہرہ کرتے رہے، لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رسائی۔ لندن میں ہماری کیوبی کے لوگوں نے ہاؤس آف کامنز میں آواز اٹھائی جس کے جواب میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس کا مجھے سخت افسوس ہے، کیونکہ گھر کا مسئلہ گھر میں طے ہونا چاہیے۔ کچھ غریب کہ ہمیں کیوں چن چن کیا جا رہا ہے جبکہ ہمارا قبیلہ مذہبی رواداری اور آزادی پر یقین رکھتا ہے اور کسی قسم کے فرقہ وارانہ تشدد میں ملوث نہیں۔ ہم اپنی ریاست سے جان و مال کا تحفظ فراہم کرنے کا سوال کرتے ہیں۔ انہوں نے چشمِ غم کانفرنس کے منتظمین کا شکریہ ادا کیا جنہوں نے بروقت قومی نقطہ نگاہ سے ایک عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے اور ہزارہ قبیلے کی الم ناک داستان اہل دل تک پہنچا دی ہے۔ مجھے پوری امید ہے کہ ملک میں اہل درد ہمارا ساتھ دیں گے اور ظالم کو ظلم سے روکیں گے۔

وہ لاہور سے پانچ جنوری کی صبح کوئٹہ روانہ ہوئے اور دس جنوری کی شام اُن کے قبیلے پر خوش آمد ہو جس میں سو سے زائد افراد شہید اور ڈیڑھ سو کے لگ بھگ زخمی ہوئے۔ اگلے دن میں نے جناب عبدالخالق کو فون کیا جو برقی ہواؤں میں علمدار روڈ پر ہزاروں مردوں، عورتوں اور بچوں کے ہمراہ اپنے پیاروں کی میجوں کے ساتھ دھرنا دیے بیٹھے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ تقریباً بیس لاکھیں ابھی تک لاپتہ ہیں اور ہم پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ دھرنے کو ایک رات اور ایک دن گزر گیا، مگر صوبے اور مرکز میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوئی، کیونکہ بلوچستان کے وزیر اعلیٰ ملک سے باہر تھے اور وفاقی حکومت اس لیے چین کی باسری بجاری تھی کہ دھرنا پُر امن اور وفاقی دارالحکومت سے بہت دور کوئٹہ میں تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے پُر امن دھروں کا سلسلہ کوئٹہ سے ہوتا ہوا کراچی، پٹنہ، پشاور اور گلگت تک قریہ قریہ اور شہر پھیلتا گیا۔ گلی گلی حسیں کی صدائیں بلند ہونے لگیں اور سیاہ پوش بیپیاں اور کم سن بچے نوے پڑھتے رہے۔ غم و وزن میں ڈوبے نوجوان ایوان صدر کراچی کا پینچہ جہاں صدر زرداری قیام پذیر تھے۔ تین روز تک مختلف مقامات پر ہزاروں مردوزن ماتم کرتے اور سسکیاں بھرتے رہے۔ اُن کا مطالبہ یہ تھا کہ بلوچستان میں گورنر راج نافذ کیا جائے اور کوئٹہ شہر فوج کے حوالے کر دیا جائے۔ جب پُر امن دھروں کا سلسلہ پاکستان کے بڑے بڑے شہروں میں تیزی سے

کامیاب ہو گئے کہ قادری صاحب کے سارے مطالبات غیر آئینی اور غیر جمہوری ہیں، اس لیے ہم انہیں مسترد کرتے ہیں اور آئین سے ماوراء تبدیل کی پوری قوت کے ساتھ مزاحمت کریں گے۔ میڈیا نے ایک طرف شیخ الاسلام کے طویل خطبات کو ضرورت سے زیادہ کوریج دی اور دوسری طرف اُن کے ایجنڈے کے بارے میں کڑے سوالات اٹھانا اور اُن کے تضادات نمایاں کرنا شروع کر دیے جس کی وجہ سے رائے عامہ تیزی سے تبدیل ہونے لگی۔

پُر امن دھرنے کا جلد از جلد اختتام حکومت اور جناب ”شیخ الاسلام“ کی مجبوری بنتا جا رہا تھا۔ ارباب حکومت کو یہ خوف لاحق تھا کہ کوئی سانحہ رونما نہ ہو جائے، کیونکہ ”امن کے سپہ سالار“ گاہے گاہے پارلیمنٹ اور وزیر اعظم ہاؤس پر عوامی قبضے کی دھمکی بھی دیتے رہے۔ دوسری طرف موسم کی شدت کے باعث بچے اور عورتیں بیمار پڑنے لگیں اور حسنی قافلہ اپنی کن ٹرائیوں میں محصور ہو کر رہ گیا۔ بیشتر سیاسی اور مذہبی جماعتوں نے لاطعلقی اور شدید مخالفت کا اعلان کر دیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈیڑھ گھنٹے کے الٹی میٹم کی صدا سنتے ہی مخلوط حکومت کے سربراہ آدرہ افراد سر جوڑ کے بیٹھ گئے اور وقت مقررہ پر مذاکرات کے لیے پہنچ گئے۔ چار پارٹی گھنٹے بات چیت کا سلسلہ جاری رہا اور ایک معاہدہ طے پایا جس کی دو باتیں بڑی اہم ہیں۔ ایک یہ کہ اسمبلیاں آئینی مدت ختم ہونے سے چند روز پہلے تحلیل کر دی جائیں گی تاکہ انتخابی عمل کا دورانیہ ساٹھ دن کے بجائے نوے دنوں تک پھیل جائے اور امیدواروں کے کاغذات کی جانچ پڑتال کے لیے تیس دن میسر آجائیں۔ دوسری یہ کہ آرٹیکل ۲۲ اور ۲۳ پر حقیقی عمل درآمد کے لیے الیکشن کمیشن کو بااختیار بنایا جائے جو بینک اور ٹیکس ڈیفالٹرز، جعلی ڈگری ہولڈرز اور دہری شہریت رکھنے والے امیدواروں کی چھاننی کر سکے۔ ان شقوں کی آئینی اور قانونی حیثیت پر بحث ہنوز جاری ہے اور اس کے انجام کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جاسکتا، تاہم عوام کے اندر زبردست جوش و خروش پایا جاتا ہے اور ایک ماحول بنتا جا رہا ہے جس میں سیاسی جماعتیں بہتر امیدوار کا انتخاب کرنے پر مجبور ہوں گی، کیونکہ انہیں سول سوسائٹی اور میڈیا کے شدید دباؤ کا سامنا رہے گا، چنانچہ ایک حد تک امید کی جاسکتی ہے کہ انتخابی عمل پہلے کے مقابلے میں کسی قدر شفاف ہوگا، البتہ غلطی میں دیرپا مقاصد حاصل نہیں کیے جاسکیں گے۔ اصلاحات ایک تدریجی اور صبر آزمائے عمل ہے جس کے لیے خاطر خواہ ہوم ورک بے حد ضروری ہے۔ آئین میں صادق امین اور متقی کی جو اصلاحات استعمال ہوئی ہیں اُن کا فیصلہ عدالت سے لینا ہوگا جس کے لیے بڑا وقت درکار ہوگا۔

شیخ الاسلام طاہر القادری کے لاٹک مارچ کو پینتالیس پارٹی کے دانش مند راہنما جناب میاں رضا ربانی نے جمہوریت پر ڈرون حملہ قرار دیا ہے جبکہ تاریخ کا گہرا ادراک رکھنے والے جناب شمشاد احمد خاں نے اسے یونانی ایسے سے تشبیہ دی ہے۔ اُن کا کہنا یہ ہے کہ سقراط کی طرح ہمارے شیخ الاسلام نے بھی کرپٹ حکمرانوں کو لٹکارا اور نوجوانوں کے اندر انقلابی روح بھونکی تھی۔ اس جرم پر جمہوری نے اُسے سزائے موت دی۔ اُس کے علم و فضل کے دیوانے اُسے جیل سے فرار کرنے کا منصوبہ تیار کر چکے تھے، مگر سقراط نے ریاست کی رٹ قائم کرنے کے لیے زہر کا پیالہ بڑے اطمینان سے نوش کیا جبکہ ڈاکٹر قادری بڑی بڑی طاقتوں سے معاہدے پر دستخط کرنے میں ایک فخر اور نشاط محسوس کر رہے تھے۔ سپریم کورٹ میں یہ آئینی پٹیشن داخل کی جا چکی ہے کہ کیا کینیڈا کی وفاداری کا حلف اٹھانے والے شہری کے ساتھ دستور کی معاملات طے کیے جاسکتے ہیں۔ ابھی انتخابات کی راہ میں کتنی ہی بارودی سرنگیں بجھی ہوئی ہیں اور ”مجاہد جمہوریت“ نے اسلام آباد کو یرغمال بنا کر ہمارے مستقبل کی تابندگی پر منفی اثرات مرتب کیے ہیں اور ہماری ریاست کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا۔ اس خوفناک قومی ایسے کے پہلو بہ پہلو مزید انہونے واقعات پرورش پارہے ہیں جن کا ذکر آئندہ کیا جائے گا۔ اُن میں سب سے زیادہ چشم کشا بھارتی وزیر داخلہ کا یہ انکشاف ہے کہ بھارت میں آرائیں ایس دہشت گردی کے ترینی کیمپ چلا رہی ہے۔ اس اعتراف سے بھارت کے اندر اُٹنے والے سیاسی طوفان کا ٹھیک اندازہ لگانا ضروری ہے کہ اس کی روشنی میں دونوں ملک دہشت گردی کے خلاف ایک مشترکہ حکمت عملی طے کر سکتے ہیں جو ہمارے مستقبل کے خدو خال میں بہت بڑی تبدیلی ہوگی۔

جو میں نے دیکھا

راؤ رشید

ذوالفقار علی بھٹو کے سیشن سیکریٹری راؤ رشید کی آپ بیتی۔ پاکستانی سیاست اور حکمرانی کی اندرونی کہانی اور پاکستانی تاریخ کی ایک چشم دید شہادت۔

قیمت 320 روپے

غیر مقدس جنگیں

جان کے کوئی

عالمی دہشت گردی کے تمام کرداروں کو نہ صرف پہلے ہی بے نقاب کیا ہے بلکہ ان واقعات کے حقیقی اسباب، پس منظر اور پیش منظر سے بھی آگاہ کیا ہے۔ مشرق وسطیٰ سے لے کر جنوبی ایشیا تک میں سامراج کی گریٹ گیم کی اصلیت سے آگہی حاصل کریں۔

قیمت 490 روپے

مجاں رسول (ﷺ) توجہ فرمائیں

محبوب کائنات حضرت محمد ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں مختلف حکمرانوں کے نام خطوط ارسال کیے۔ یہ تمام خطوط انتہائی خوبصورت انداز سے معروف محقق، دانشور علامہ عبدالستار عاصم کی عنقریب شائع ہونے والی کتاب ”مکتوبات فخر کائنات ﷺ“ میں شامل ہیں۔ اور ساتھ ہی ان صحابہ کرامؓ کے حالات زندگی بھی شامل ہیں جو یہ خطوط مبارک لے کر جاتے رہے۔ آپ اپنی ذاتی لائبریری، گھر یا دفتر کے لیے آج ہی اپنی کاپی بک کروالیں۔ یاد رکھیں جس گھر میں رحمت اللعالمین ﷺ کے خطوط مبارک موجود ہوں گے وہ گھر دنیا کے بابرکت گھروں میں شامل ہوگا۔

رابطہ: مقبول ایڈمی چوک اردو بازار لاہور 0333-4393422/0423-3732416423-5855537

علم ادراک کے نئے خزانے (نئی کتابیں)

عراضہ... ڈاکٹر عبدالقدیر خان-1000

تعلیمات قرآن... ملک مقبول احمد-300

پیش دستی... ڈاکٹر وحید قریشی-400

تحریر پاکستان... پروفیسر نذیر احمد تشہ-900

ضرب الامثال... پروفیسر نذیر احمد تشہ-600

حمید اختر... علامہ عبدالستار عاصم-2000

پاکیزہ زندگی... علامہ عبدالستار عاصم-500

پنجاب کی لوک کہانیاں... پروفیسر غلام مرتضیٰ-400

سفر آرزو... ملک مقبول احمد-600

50 نامور ادبی شخصیات... ملک مقبول احمد-600

سیاحت نامہ ترکی... ملک مقبول احمد-600

بھارت کے فرعون (حصہ 9)... اے حمید-3600

وطن کے سرفروش (5 حصے)... اے حمید-2500

مقبول ایڈمی چوک اردو بازار لاہور 0323-4393422 0423-37324164

ناظم حکمت کے ساتھ جیل

اورحان کمال

ترکی کے معروف ترین شاعر ناظم حکمت اور اورحان کمال کے ترکی کی برصہ جیل کی روداد، اورحان کمال کے قلم سے۔ ترکی کی تاریخ کے پر آشوب دور میں ان ادیبوں کی قید کا پس منظر اور کیسے سیاست نے ادبی ضابطے کو تشکیل دی۔

قیمت 390 روپے

عمران خان فسانہ یا حقیقت

فرینک حضور

عمران خان کی سوانح عمری، ایک غیر معمولی صلاحیت کے حامل کھلاڑی، پاکستان میں پہلا کینسر ہسپتال بنانے والے، ایک یونیورسٹی کے بانی اور اب ایک ابھرتے ہوئے سیاست دان، انہیں پاکستان میں اُمید کی کرن کیوں سمجھا جاتا ہے اور کیا وہ مستقبل میں پاکستان کے صدر یا وزیر اعظم بن سکتے ہیں؟

قیمت 680 روپے

ہربک سٹال پر دستیاب ایک فون کال پر گھر بیٹھے بذریعہ وی پی کتاب حاصل کیجئے

جمہوری پبلیکیشنز۔ 2 ایوان تجارت روڈ، لاہور 042-36314140

**PREQUALIFICATION OF FIRMS FOR PROCUREMENT OF
PASSENGER / BED LIFTS IN PUNJAB BUILDINGS DEPARTMENT**

Applications are invited for prequalification of firms who are authorized dealers of reputed manufacturers of Elevators for passenger / bed lifts for various project of Building Department.

GENERAL SPECIFICATIONS OF PASSENGER / BED LIFTS

Description	Specifications
Country of Origin / manufacturer of lift	USA, West Europe, Japan
Elevators Use	Passenger / bed lift
Control	Variable Voltage Variable Frequency
Operation	Simplex selective collective
Stops	As per Building.
Machine room	Machine room less for passenger lift and also for bed lift, if possible
Door Type	Automatic two panel centre opening power operated
Pit / well Dimensions	As per manufacturer
ELEVATOR / CABIN CAR	
Dimensions	As per manufacturer
Materials	Stainless steel
Car operating Panel	Standard as per Model of manufacturer
Car Position Indicator	(Digital LED dot-display - orange colour when illuminated) Standard as per Model
Entrance Door / Frame	Lintel & narrow jamb of painted steel sheet @ floors / as per manufacturer
Hall Call Button	Micro-stroke click buttons
Warranty	One year
Authorized Dealer	The firm should have authorized dealer in Pakistan
Sale /Service / Parts Availability	Maintenance unit at local level alongwith parts
Past Performance	The firm should have atleast 10 units in Lahore / Islamabad / Karachi
OTHER FEATURES	
Interphone with alarm bell, Car arrival chime, Main floor parking, Automatic by pass, Emergency car light, Handrail on back / side wall, Car light & fan shut off automatic, Overload protection device with buzzer and signal lamp, Multi beam door sensor, Automatic door open time, adjustment, Door nudging feature without buzzer, Door open / close button, Power on re-leveling, Door load detector, Safety door edge, Car call cancelling, Emergency landing system (battery operated) Spring / energy for safety of car	

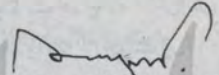
**OFFICE OF THE TEHSIL MUNICIPAL ADMINISTRATION
PIPLAN DISTT. MIANWALI.**

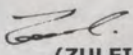
(TENDER NOTICE)

TMA Piplan invites tenders for below works according to basis of MRS 2012, from such contractors, who are registered with any TMA in Mianwali Distt. Tender farms can be obtained from TMA office or Local Govt. Website and submitted with 2% call deposit on 13-02-2013 at 11:00 AM in the sealed box in TMA office. These tenders will be opened at 01:00 PM on the same day.

- 1). No duplicate, overwritten, with out signature tenders will be acceptable.
- 2). No tender without CDR will be acceptable.
- 3). Contractors are bound to deposit 10% performance security according to amended TMA/Town Administration Works Rules, 2003. Failing which tenders will be cancelled within seven days and forfeiting CDR, action will be taken against contractors.
- 4). After seven days of acceptance of work the contractor shall must start work at site within ten days.
- 5). Completion period according to work order.
- 6). Details of works, site plans, specification, technical sanctioned estimate etc, on be examined in office of TO(I&S), according to office hours.
- 7). Competent Authorities have powers to cancel the whole tender or any work without explaining any reason.
- 8). The contractors must bring with them the renewal certificates for the year of 2012-13, failing which the contractor will be ineligible for tendering process.

Sr. No.	Name of Scheme	Estimated Cost	Earnest Money	T.S No. & Date
1	P/Laying premixed carpet (balance work) matted road galli Ara Machine wali, galli Haji Afzal Zargar wali Kundian and Kanday Wala U.C Rural Harnoli.	15.00 Lacs	30000/-	1890/I&S 14-01-2013


(SOHAIL ANWAR KHAN)
Tehsil Municipal Officer
TMA Piplan Distt.
Mianwali


(ZULFIQAR ALI LAK)
Administrator,
TMA Piplan, Distt.
Mianwali

IPL No. 949

حضرت براء بن مالکؓ

ایک عظیم صحابی کی روح پروردستان حیات
زندگی بھران کاشعار ”اللہ“ اور ”جنت“ رہا

کا بچہ، آپ ﷺ کی خدمت انجام دیا کرے گا،
آپ ﷺ اس کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا فرمائیے۔“
رسول اللہ ﷺ نے حضرت انسؓ کی پیشانی پر بوسہ
دیا اور آپؐ کے لیے ایسی دعا فرمائی جو تاحیات آپؐ کو
خیر و برکت کی طرف لے جاتی رہی۔ رسول اللہ ﷺ
نے دعا فرمائی:

”یا اللہ! اس کے مال و اولاد میں اضافہ فرما،
اس کے لیے برکت کا سامان فرما اور اس کو جنت میں
داخل فرما!“

جناب انس بن مالکؓ ۹۹ برس زندہ رہے اور بیٹوں

ان دو مؤاخاتی بھائیوں میں سے ایک
آپؓ ہیں جنہوں نے اللہ کی خاطر زندگی
گزاری اور رسول اللہ ﷺ سے ایسا
عہد کیا جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مضبوط تر ہوتا
رہا۔ ان بھائیوں میں سے ایک رسول اللہ ﷺ کے
خادم جناب انس بن مالکؓ ہیں۔

ایک روز حضرت انسؓ کو آپؐ کی والدہ محترمہ رسول
اللہ ﷺ کی خدمت میں لے گئیں، اس وقت آپؐ کی عمر
صرف ۱۰ سال تھی۔ والدہ محترمہ نے رسول اللہ ﷺ
سے درخواست کی ”یا رسول اللہ ﷺ! یہ انس ہے، آپؐ

The interested firm are required to submit the following information / documents (in duplicate with chain mark in his booklets) to the Executive Engineer 5th Provincial Buildings Division, Lahore to reach him by 15.02.2013 during office hour.

1. Name / full address & partnership deed of the firms with power of Attorney in favour of person authorized.
2. Year of establishment supported by certificate from the registrar of the firms.
3. Detail of projects where elevators installed.
4. Dealership certificate for 2012-13 from the manufacturer if not manufacturer itself.
5. Performance certificate from the Executive Engineer / Client under whom the works have been executed during last three years.
6. Detail of works in hand indicating name of Client Department, consultants, scope of works.
7. Authentic proof of their financial position such as Bank statement of the pervious one year.
8. Income Tax Registration Certificate.
9. Any further particulars, the firms wish to furnish.

The prequalification applications shall be evaluated on the basis of Planning & Development Department criteria for prequalification. The other related information required in this regard should also be provided.

Any further information / details in this connection may be obtained from the Executive Engineer 5th Provincial Building Division, Lahore on any working day. Only pre-qualified firms will be invited to participate in tenders. The committee for prequalification reserve the right to approve or reject any application without assigning any reason.

IPL No. 973

Executive Engineer,
5th Provincial Buildings Division,
LAHORE

اور پلوں کی کثیر تعداد سے نوازے گئے۔ اس طرح آپؐ کو رزقِ دنیا میں سے ایک وسیع و عریض اور خوشنما و دلربا باغ بھی عطا ہوا جو سال میں دو مرتبہ پھل دیتا تھا۔

ان دو مؤاخاتی بھائیوں میں سے دوسرے حضرت ”براء بن مالکؓ“ تھے جنہوں نے عظیم اور جرأت مندانہ زندگی گزاری اور ساری زندگی ان کا شعار ”اللہ اور جنت“ ہی رہا۔ عمر بھر آپ کے پیش نظر یہی دو مقاصد اور اہداف تھے۔

میدانِ جنگ کے اندر جو شخص بھی آپؐ کو راہِ خدا میں لڑتے دیکھتا، حیرت بالائے حیرت کا اظہار کرتا۔ حضرت براءؓ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو تلوار کے ذریعے مشرکین سے جہاد کرتے ہوئے فتح و نصرت کے متلاشی ہوتے ہیں حالانکہ اس وقت نصرت و فتح کی اشد ضرورت بھی ہوتی ہے بلکہ آپؐ اس وقت بھی شہادت کی تلاش میں ہوتے۔ آپؐ کی تمام تر خواہش و تمنا یہ تھی کہ مجھے شہادت کی موت نصیب ہو اور میں حق و باطل کے معرکوں میں سے کسی میں اپنا نصیب حاصل کر سکوں۔ یہی وہ جذبہ اور داعیہ تھا جس کی وجہ سے آپؐ زندگی میں بھی کسی غزوہ سے پیچھے نہ رہے۔

آپؐ بیمار تھے۔ دوست احباب آپؐ کی عیادت کے لیے حاضر خدمت ہوئے تو آپؐ نے ان کے سامنے قرآن کریم کی کچھ تلاوت کی پھر فرمایا: ”شاید تم ڈر رہے ہو کہ میں اپنے بستر پر جان دے رہا ہوں..... نہیں! اللہ کی قسم میرا رب مجھے شہادت سے ہرگز محروم نہیں رکھے گا!“

اللہ تعالیٰ نے آپؐ کے اس یقین کو سچ کر دکھایا۔ آپؐ اپنے بستر پر فوت نہ ہوئے بلکہ اسلامی معرکوں میں سے ایک عظیم معرکہ میں اعزازِ شہادت سے سرفراز ہوئے۔

جنگِ یمامہ کے روز حضرت براءؓ نے جس بہادری

اور شجاعت کا اظہار کیا وہ آپؐ ہی کی صفت خاص تھی..... ایک ایسے مرد میدان کی صفت جس کے بارے میں حضرت عمرؓ بن خطابؓ کہا کرتے تھے کہ انھیں کبھی کمانڈر نہ بنایا جائے کیونکہ ان کی تمام تر جسارت و پیش قدمی اور قوت آزمائی کا مقصد شہادت ہی ہوتا ہے۔ یہ چیزیں ان کی قیادت کو دوسرے سپاہیوں کے لیے ایسے خطرے سے دوچار کر سکتی ہیں جو تباہی سے کم نہیں ہوتا۔ جنگِ یمامہ کے روز جب اسلامی لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی سالاری میں میدانِ جنگ میں اترنے کے لیے تیار تھا تو حضرت براءؓ انتظار کے ان لمحات کو اس طرح بے چینی اور بے تابی کے ساتھ گزار رہے تھے گویا یہ لمحے نہیں بلکہ سال ہوں۔ اس موقع پر تیزی کے ساتھ حرکت کرتے ہوئے آپؐ کی آنکھیں میدانِ جنگ کا بغور جائزہ لیتی رہیں۔ گویا وہ اس عظیم بہادر کے لیے موزوں ترین جائے شہادت تلاش کر رہی تھیں!

اللہ اکبر..... آپؐ کو اس مقصد کے علاوہ دنیا کی کوئی اور چیز مشغول نہیں رکھ سکتی تھی۔

حضرت خالد بن ولیدؓ نے بلند آواز سے اللہ اکبر کہا..... اللہ کی کبریائی کا یہ اعلان سن کر اسلامی لشکر کی مضبوط صفیں اپنے اہداف کی طرف چل پڑیں۔ موت کے عاشق جناب براءؓ بن مالکؓ بھی لشکر کے ہمراہ متحرک ہو گئے۔

میدانِ جنگ گرم ہوا تو آپؐ کی تلوار سے ظلم و باطل کے پجاریوں کی ایک کثیر تعداد زمین پر گرنے لگی۔ آپؐ اپنی تلوار کے ساتھ ”مُسلِمہ“ کذاب کے بیروکاروں کو پچھاڑنے لگے۔ آپؐ کی چمکتی تلوار کے نیچے وہ موسمِ خزاں میں گرنے والے پتوں کی طرح گر رہے تھے۔

”مُسلِمہ“ کا لشکر کمزور تھا نہ قلیل، بلکہ یہ مرتدین کا خطرناک ترین لشکر تھا۔ اپنی تعداد و تیاری اور اپنے جنگجوؤں کے کٹ مرنے کے جذبے کے اعتبار سے یہ

ایک سے بڑھ کر ایک خطرہ اپنے اندر رکھتا تھا۔ اس لشکر نے ایسی پامردی اور خشی کے ساتھ مسلمانوں کے حملے کی مزاحمت کی کہ قریب تھا کہ جنگ کی لگام ان کے ہاتھ میں آجاتی اور وہ مزاحمتی صورتِ حال سے نکل کر حملہ آور کی حیثیت اختیار کر لیتے۔

اس موقع پر مسلمانوں کی صفوں میں ذرا سی بے دلی کا ظہور سامنے آیا تو مسلمان کمانڈر اور مقرر اپنے اپنے گھوڑوں پر بیٹھے بیٹھے فوج کو ثابت قدم رہنے کی نصیحت کرنے اور اللہ کے وعدے کی یاد دہانی کرانے لگے۔ حضرت براءؓ بن مالکؓ بلند آہنگ تھے، سپہ سالارِ لشکر جناب خالد بن ولیدؓ نے آپؐ کو بلایا کہ اے براءؓ! تم بھی اعلان کرو۔

حضرت براءؓ نے پوری قوت سے ”جرأتِ مندانہ اور ہادیانہ اعلان کیا:

”اے اہلِ مدینہ!..... آج کسی مدینہ کے بارے میں نہ سوچو!

آج صرف اللہ اور جنت کو نظروں کے سامنے رکھو!“

یہ ایسے الفاظ تھے جو کہنے والے کی روح کی بلندی اور خوبیوں کی رفعت کی نشاندہی کرتے ہیں۔

اللہ اکبر..... کیا الفاظ ہیں: ”آج صرف اللہ اور جنت کو نظروں کے سامنے رکھو!“

واقعی اس طرح کے مواقع پر دل و دماغ اور روح و فکر اللہ اور جنت کے سوا کسی اور طرف ہرگز نہیں جانے چاہئیں۔ یہاں تک کہ اسلام کے دارالحکومت مدینہ منورہ اور وہ مقام جس میں مسلمان اپنے گھر بار اور ازواج و اولاد چھوڑ کر آئے تھے، ان کے بارے میں سوچنا بھی مناسب نہ تھا۔ کیونکہ آج اگر مسلمان دشمن سے شکست کھا جاتے تو مدینہ باقی رہتا نہ گرد و پیش مدینہ بچتا!

حضرت براءؓ کے الفاظ اسلامی افواج کے دل و دماغ میں اس طرح اتر گئے.....!

کس طرح.....؟

اس سوال کا جواب نہیں دیا جاسکتا! کیونکہ ان الفاظ کے اثر و تاثیر سے کسی چیز کو تشبیہ دینا ظلم ہوگا۔ بس ہمیں یہ کہنا چاہیے کہ جناب براءؓ کے الفاظ منہ سے نکلے اور اپنا کام دکھا گئے۔

تھوڑے ہی وقت میں معرکہ اپنی پہلی صورتِ حال پر لوٹ آیا یعنی مسلمان جم کر لڑنے لگے۔ اب مسلمان پیش قدمی کر رہے تھے اور اللہ کی بھرپور نصرت آگے بڑھ کر ان کا استقبال کر رہی تھی۔ مشرک بڑی ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو کر زمین پر گر رہے تھے۔ حضرت براءؓ اپنے ان ساتھیوں کے ساتھ تھے جو پرچم کے سائے تلے اپنی عظیم منزل کی طرف گامزن تھے۔

صلاة اللہ وسلام علی محمد واصحابہ۔ مشرک پسپا ہو کر بھاگ اٹھے اور انھوں نے ایک بہت بڑے باغیچے میں داخل ہو کر اپنے آپ کو بچانے کی کوشش کی۔ ادھر معرکہ مسلمانوں کے خون سے ٹھنڈا ہو رہا تھا۔ اس بات کا امکان تھا کہ ”مُسلِمہ“ اور اس کے سپاہی جو اس باغیچے میں جا چکے ہیں، کہیں انجامِ جنگ پھر تبدیل نہ کر دیں۔ اس وقت براءؓ ایک بلند ٹیلے پر چڑھے اور زوردار آواز سے کہنے لگے: ”مسلمانو! مجھے اٹھاؤ اور اس باغ کے اندر ان دشمنوں کے اوپر پھینک دو۔“

قارئین کرام! اس مضمون کے آغاز میں ہم نے ذکر کیا تھا کہ حضرت براءؓ فتح و نصرت کے متلاشی و متبعی نہ تھے بلکہ شہادت کی تلاش و جستجو میں رہتے تھے۔ کیا مذکورہ واقعہ پڑھ کر ہمارے اس بیان کی تصدیق نہیں ہو جاتی! دراصل حضرت براءؓ اس منصوبے میں اپنی زندگی کا بہترین خاتمہ اور اپنی موت کی بہترین تصویر دیکھ رہے تھے اور اگر آپؐ کو اٹھا کر اس باغیچے میں پھینک دیا جاتا تو آپؐ مسلمانوں کے لیے اس کا دروازہ کھول دیتے۔ جو نبی آپؐ باغیچے کے اندر گرتے اور اپنا کام انجام دینے کی کوشش کرتے تو

مشرکوں کی تلواریں آپؐ پر ٹوٹ پڑتیں اور آپؐ کے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے رکھ دیتیں۔ دوسری طرف بالکل اسی لمحے آپؐ کے لیے جنت کے دروازے آراستہ ہو رہے ہوتے اور ایک نئے اور معزز و مکرم دولہا کے استقبال کے لیے کھل جاتے۔

اس موقع پر حضرت براءؓ نے اتنا انتظار بھی نہ کیا کہ لوگ آپؐ کو اٹھا کر باغیچے کی دیوار پر چڑھاتے اور اندر بھینکتے۔ آپؐ خود ہی دیوار پر چڑھے اور باغیچے کے اندر داخل ہو کر دروازہ کھول دیا۔ پھر اسلامی افواج اس کے اندر داخل ہو گئیں۔ مگر قدرت کے فیصلے دیکھیے کہ اس کے باوجود حضرت براءؓ کا خواب پورا نہ ہوا، مشرکین کی تلواres آپؐ کو پاکیں نہ وہ شہادت آپؐ کو مل سکی جس کی خواہش و تمنا آپؐ کے دل میں بچل رہی تھی۔

حضرت ابو بکرؓ نے سچ فرمایا: ”موت کے حریص رہو، تمہیں زندگی عطا ہوگی!“ اس روز اس عظیم بہادر کے جسد نے مشرکین کی تلواروں کی ۹۰ کے قریب ضربیں سہیں جن سے آپؐ کو اتنے ہی زخم آئے۔ جنگ کے بعد پورا ایک ماہ گزر گیا، حضرت خالد بن ولید بذات خود آپؐ کی تیمارداری کرتے رہے۔

حضرت براءؓ نے جس قدر زخم کھائے اور تکلیف اٹھائی، یہ سب کچھ اس خواہش و تمنا کے حصول کے لیے تھا جو اس موقع پر حاصل نہ ہو سکی۔ لیکن اس کے باوجود آپؐ مایوس نہ ہوئے کیونکہ ہر دن کوئی نیا معرکہ کھڑا کر دیتا تھا جہاں آپؐ کو اپنی خواہش کے پورا ہونے کا امکان نظر آتا تھا۔

حضرت براءؓ کو رسول اللہ ﷺ نے خوش خبری دی تھی کہ آپؐ ”مَسْجَبُ الدَّعْوَةِ“ ہیں یعنی اللہ تعالیٰ آپؐ کی دعا قبول کر لیتا ہے۔ اس لیے آپؐ ہمیشہ اپنے رب سے یہی دعا کرتے تھے کہ اللہ آپؐ کو

شہادت عطا فرمائے۔ پھر آپؐ پر یہ بھی واجب تھا کہ آپؐ جلد بازی سے کام نہ لیں کیونکہ ہر کام کا ایک وقت مقرر ہوتا ہے!

حضرت براءؓ اپنے زخموں سے شفا یاب ہو گئے اور پھر ان اسلامی لشکروں کے ہمراہ چل پڑے جو ضلالت و گمراہی کی قوتوں کو انجام تک پہنچانے کے درپے تھیں۔ یہ قوتیں روم اور ایران کی عارضی اور فانی حکومتیں تھیں جو اپنی باغی و سرکش افواج کے ذریعے اللہ کی زمین پر قابض اور اس کے بندوں کو غلام بنائے ہوئے تھیں۔

ادھر حضرت براءؓ و انصار و اسلام کے ان معرکوں میں اپنی تلوار سے ضرب لگا رہے تھے، تلوار کی ہر ضرب کی جگہ جہاں نو کی ایک بلند ترین دیوار بن رہی تھی جو جہاں روشن ہوتے دن کی طرح واضح ہو رہا تھا۔

عراق کے ساتھ مسلمانوں کی ایک جنگ کے دوران ایرانیوں نے اس بے حییت و درندگی کا مظاہرہ کیا جو وہ کر سکتے تھے۔ ان کی افواج نے آگ سے تپتی ہوئی زنجیروں کے ساتھ گنڈے لگا رکھے تھے جنہیں یہ لوگ اپنے قلعوں کے اندر سے باہر بھینکتے تھے۔ جو بھی مسلمان ان زنجیروں کی زد میں آتا وہ ان سے خلاصی نہ پاسکتا اور یہ اس کو جلا کر رکھ دیتیں۔

حضرت براءؓ اور آپؐ کے مؤاخاتی بھائی جناب انسؓ بن مالک کو مسلمانوں کی ایک جماعت کے ساتھ ان قلعوں کی کوئی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ اسی دوران ان گنڈوں والی زنجیروں میں سے ایک زنجیر اچانک حضرت انسؓ بن مالک پر آپڑی۔ حضرت انسؓ اس زنجیر کو ہاتھوں سے پکڑ کر اپنے جسم سے الگ نہ کر سکے کیونکہ وہ دھکتے ہوئے شعلے اگل رہی تھی۔

حضرت براءؓ بن مالک نے اس موقع کو بھی شہادت کا موقع خیال کیا، جلدی سے اپنے بھائی انسؓ کی طرف بڑھے، دونوں ہاتھوں سے زنجیر کو پکڑا اور پوری

قوت کے ساتھ اس سے زور آزمائی کرتے ہوئے اسے توڑ ڈالا۔ حضرت انسؓ زنجیر سے خلاصی پا گئے لیکن حضرت براءؓ نے اپنے ہاتھوں پر نظر ڈالی تو وہ دکھائی نہ دیئے۔ ان کا سارا گوشت اتر چکا تھا اور جلی بڈیوں کا صرف ڈھانچہ رہ گیا تھا! لیکن قدرت کی شان دیکھیے کہ اللہ کی راہ کا یہ مجاہد علاج کے لیے کچھ وقت گزارنے کے بعد شفا یاب ہو جاتا اور موت کا یہ عاشق از سر نو موت کے تعاقب میں نکل کھڑا ہوتا۔

کیا اب ان کی تمنا پوری ہونے کا وقت آگیا ہے؟ یقیناً..... کیوں نہیں!

یہ ٹوسٹر کا مقام ہے۔ مسلمان اس مقام پر ایران کے مقابل ہیں اور حضرت براءؓ کے لیے اس سے بڑھ کر خوشی کا موقع کون سا ہو سکتا تھا؟ ابھوازی اور فارسی بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہو گئے تاکہ مسلمانوں کو نابود کر دیں۔ امیر المومنین حضرت عمرؓ بن خطاب نے کوفہ میں موجود اسلامی کمانڈر، حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کو خط لکھا کہ ابھوازی کی طرف فوج بھیجو، بصرہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بھی ابھوازی کی طرف فوج بھیجنے کا حکم دیتے ہوئے کہا: ”سہیلؓ بن عدی کو لشکر کا کمانڈر بنا کر بھیجو اور براءؓ بن مالک کو ان کے ساتھ ہونا چاہیے!“

پھر کوفہ اور بصرہ سے آنے والے دونوں لشکر اکٹھے ہو گئے۔ حضرت انسؓ بن مالک اور حضرت براءؓ بن مالک، دونوں عظیم بھائی اسلامی لشکر میں موجود تھے۔ جب دعوت مبارزت کے ساتھ جنگ کا آغاز ہوا تو تنہا حضرت براءؓ نے ایک سو ایرانیوں کو موت کی نیند سلا یا۔ پھر لشکر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے اور دونوں اطراف سے کثیر تعداد میں مقتولین گرنے لگے۔

جنگ جاری تھی کہ کچھ صحابہ حضرت براءؓ کے قریب گئے اور آپؐ کو مخاطب کر کے کہا:

”اے براءؓ! کیا تمہیں اپنے بارے میں رسول اللہ ﷺ کا یہ قول یاد ہے کہ ”کچھ پرانگندہ حال اور

غبار آلود ایسے بھی ہیں جو دو ہوسیدہ کپڑوں کے مالک ہیں اور ان کو کوئی مقام و مرتبہ نہیں دیا جاتا (لیکن) یہ اگر اللہ تعالیٰ کو کوئی قسم دے دیں تو اللہ ان کی بات رد نہ کرے گا، براءؓ بن مالک انہی میں سے ہیں۔“

اے براءؓ! اللہ کو قسم دو کہ اللہ دشمنوں کو شکست دے اور ہمیں فتح یاب کرے!“

حضرت براءؓ نے ہاتھ آسمان کی طرف بلند کیے اور گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہوئے:

”یا اللہ! ان کی گردنیں ہمارے قبضے میں کر دے۔“

یا اللہ! انھیں شکست دے دیجئے۔ اور ہمیں ان پر غلبہ عطا فرما۔

اور مجھے آج اپنے نبی ﷺ سے ملا دے!“

اس کے بعد حضرت براءؓ نے اپنے مؤاخاتی بھائی حضرت انسؓ پر نظر ڈالی جو قریب ہی لڑائی میں مصروف تھے۔ ایک ایسی طویل نظر گویا اپنے بھائی کو الوداع کہہ رہے ہوں۔

اس کے بعد مسلمانوں کے اندر جرأت و بہادری کی روح پڑ گئی۔ دشمن ان کے سامنے مجتمع نہ رہ سکا اور انھیں فتح مبین نصیب ہوئی۔

لیکن جنگ کے اختتام پر ایک مشرک ہاتھ کی ضرب آپؐ کو لگتی ہے۔ آپؐ کا جسم زمین کی طرف لٹکھڑا جاتا ہے۔ اسی دوران آپؐ کی روح ملا اعلیٰ کی طرف شہداء کی تقریب ازدواج اور بابرکت لوگوں کی تقریب عید میں شمولیت کے لیے مجھ پرواز ہو جاتی ہے!

دُور شہدائے جنگ کے درمیان حضرت براءؓ ضوع فجر کی مانند مسکراتا ہوا اپنا روئے مبارک بلند کیے، اپنے ہی پاکیزہ خون سے ترمٹی کی ایک مٹھی دائیں ہاتھ میں پکڑے دکھائی دے رہے تھے اور آپؐ کی تلوار آپؐ کے پہلو میں پڑی تھی۔ رضی اللہ عنہ

ابوزرع کی روایت

حجاز کی دلچسپ کہانی، اعرابوں نے ان کی اپنے شہروں کی کردار نگاری
عالم اسلام کے نامور محقق اور کالم نویس حمید اللہ کی تحقیق

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”عائشہؓ میں تیرے لیے ویسا ہی ہوں جیسا اُم زرع کے لیے ابوزرع تھا“
انتخاب: مظہر سلیم بھوکہ

سنئے آئے ہیں کہ کسی زبان کے قدیم ترین آثار نظموں میں ملتے ہیں۔ لیکن بروکل مان (Brockel Mann) نے جب اپنی مشہور جرنل کتاب ”تاریخ ادبیات عربی“ لکھی تو اس میں بتایا کہ نظموں سے بھی زیادہ قدیم آثار نشر کے ہوتے ہیں اور وہ ضرب الامثال، کہاوتوں، خطبوں (تقریروں) کے اقتباسات اور بچوں کی لوریوں وغیرہ میں ملتے ہیں۔ ایسی چیزوں سے ملک کا ہر شخص واقف ہوتا ہے، لیکن ان آثار کا کوئی مؤلف معلوم ہوتا ہے اور نہ زمانہ ولادت۔ سیرت النبی ﷺ ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ مجھے اس میں بھی ایسی کچھ چیزیں ملیں۔ حمید اسلامی کے ایک عضو یونسہ (یوگوسلاویہ) کے مسلمانوں میں بھی ایک زبان زد کہانی پائی جاتی ہے جس کے بکثرت زبانوں میں ترجمے بھی ہوئے ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ (ڈاکٹر حمید اللہ۔ بیس، فرانس)

الانباء، اسحاق الکاذی، ابو القاسم عبد الحلیم بن حیان المصری جیسے مشاہیر قدما بھی شامل ہیں۔ اس کے بعد زنجیری نے اپنی ”الفاظ“ میں پھر قاضی عیاض نے جن کی شرح سب سے وسیع اور سارے پیشروؤں کی جامع بھی ہے۔ قسطلانی نے اپنی شرح میں دیگر ماخذوں میں بیان شدہ اختلافات روایت کو بھی نقل کیا ہے۔ صحیح بخاری چھپ کر عام ہے بلکہ اس کا اردو ترجمہ بھی ملتا ہے۔ اس لیے اس مضمون میں اصل عربی عبارت کو نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہر حال بخاری کی روایت درج ذیل ہیں:

امام بخاری فرماتے ہیں: حدیث بیان کی ہمیں سلیمان بن عبد الرحمن (المعروف بہ ابن بنت شریک ابو ایوب الدمشقی) اور علی حجر بن یاس ابو الحسن المعتدی الحموری نے، اور ان

عرب کے منطقہ حجاز میں ایک دلچسپ کہانی مشہور تھی۔ اعرابوں نے اپنے شہروں کی کردار نگاری کی۔ اس ادبی شاہکار کو اتنی اہمیت حاصل ہوئی کہ حضرت عائشہؓ کی روایت اور رسول کریم ﷺ اس کے دلچسپی لینے کو صحیح بخاری جیسی دینی کتاب میں جگہ ملی۔ قسطلانی نے اپنی ”ارشاد الساری فی شرح صحیح البخاری“ ج ۸ ص ۹۱ (کتاب النکاح، باب حسن المعاشرة، ۸۲/۲۷) میں صراحت کی ہے کہ خاص اس حدیث ابوزرع پر کئی عالموں نے مستقل رسالے اور شرحیں لکھی ہیں۔ ان میں امام بخاری کے استاد اسماعیل بن ابی اویس بھی ملتے ہیں اور ثابت بن قاسم، الزبیر بن بکار اور ابو عبیدہ القاسم بن سلام نے اپنی ”غریب الحديث“ میں ”ابو محمد بن خنسیہ بن

دینی و عصری تعلیم کی شمع

اسے مزید روشن کرنے میں ہمارا ساتھ دیں

محترمی و کبری جناب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

■ کیا آپ کے پاس ایک قرآن مجید ہے؟

تمام مسلمان بہن بھائیوں اور خصوصاً آپ سے التجا ہے کہ آپ کے پاس اگر ایک سے زیادہ مترجم قرآن مجید، قاعدے، سپارے، بخاری شریف یا حدیث کی کوئی کتاب یا دیگر اسلامی کتابیں موجود ہوں تو ضائع نہ کریں بلکہ ادارہ آمنہ جنت کی لائبریری کو عطیہ کریں۔ جب تک طالبات ان کو پڑھتی رہیں گی، ثواب آپ کو ملتا رہے گا اور یہ صدقہ جاریہ بھی ہے۔

■ اپنے والدین اور مرحومین کے بلند درجات کے لیے؟

ادارہ کو تفاسیر قرآن کریم، کتب حدیث اور دیگر اسلامی کتابیں خود تشریف لاکر پہنچا دیں یا ان کی قیمت بذریعہ منی آرڈر بنام ادارہ ارسال فرمادیں۔ ہم تفسیر قرآن کریم بازار سے لے کر رسید آپ کو بھجوا دیں گے ان شاء اللہ

■ دعوت

آپ کو دعوت دی جاتی ہے کہ آپ ماسوائے اتوار کے کسی بھی دن کسی بھی وقت جس میں آپ کو آسانی ہو، ادارے کا وزٹ فرمائیں۔ ہمارے کام تعلیم القرآن و عصری تعلیم کو چیک کریں۔ اگر دل گواہی دے کہ کام احسن طریقے سے ہو رہا ہے تو پھر تفاسیر قرآن کریم و کتب حدیث عنایت فرما کر عند اللہ ماجور ہوں۔

■ نوٹ:

منی آرڈر یا کتابیں بنام ادارہ ارسال فرمائیں۔ وقتی دیتے وقت ادارے کی رسید وصول کریں۔ شخصی نام پر ہرگز ارسال نہ فرمائیں شکریہ۔ نیز ادارے کو دیے جانے والے عطیات اکم لکھیں سے مستثنیٰ ہیں۔

رضیہ پروین

(ایم۔ اے عربی، ایم۔ اے اردو۔ وفاق المدارس)

آمنہ جنت فاؤنڈیشن گرلز ماڈل سکول رجسٹرڈ

چونیاں شی ضلع قصور (۵۵۲۲۰)

Ph: 0300-4735932 / 0333-4935205

متفرق معلومات

سنن نسائی میں عمر بن عبد اللہ بن عروہ نے اپنے دادا عروہ بن زبیر سے اور وہ اپنی خالہ حضرت عائشہؓ سے روایت کرتے ہیں کہ بی بی نے فرمایا: ایک دن میں اپنے باپ کی دولت پر فخر کرنے لگی کہ زمانہ جاہلیت میں ان کے پاس ۱۰ لاکھ اوقیہ (چار کروڑ) کی رقم تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: چپ بھی رہ، اے عائشہؓ میں تیرے لیے ایسا ہی ہوں جیسا ام زرع کے لیے ابو زرع تھا۔“ ابو القاسم عبد الکلیم بن حیان نے اپنی ایک سند کے ساتھ مرسل روایت کی ہے (یعنی صحابی کا نام ہے اور ایک تابعی نے رسول اللہ ﷺ سے منسوب کر کے بیان کیا ہے) کہ سعید بن عمر نے قاسم بن اُسن سے (انھوں نے) عمرو بن الحارث سے (انھوں نے) الاسود بن جبیر المعافری سے روایت کی ہے کہ ایک دن رسول اللہ ﷺ حضرت عائشہؓ کے پاس آئے جب کہ بی بی فاطمہؓ بھی وہاں تھیں اور دونوں میں کچھ سخت کلامی ہو گئی تھی۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ”اے لالو (حمیرا) کیا تو میری بیٹی کو تنگ کرنے سے باز نہ آئے گی؟ میں تیرے لیے ویسا ہی ہوں جیسا ام زرع کے لیے ابو زرع تھا۔“ عائشہؓ نے کہا یا رسول اللہ ﷺ ہمیں اس کا قصہ سنائیے۔“ فرمایا: ایک گاؤں تھا، وہاں اربعہ تین رہتی تھیں۔ ایک بار ان کے شوہر باہر گئے ہوئے تھے۔ انھوں نے کہا آؤ ہم بیان کریں کہ ہمارے شوہر کیسے ہیں اور اس میں جھوٹ نہ بولیں.....“

حدیث میں ضرب الامثال بھی ہیں۔ بچوں کی لوریاں بھی، پرانے خطیبوں کے کلام کے اقتباسات بھی، مگر ان کا آج موقع نہیں۔ یا زندہ محبت باقی۔

دے دی اور (دوسری) شادی کر لی۔ اس کے بعد میں نے بھی ایک سردار سے سے نکاح کر لیا، جو ٹھکتا ہے تو صاف تار گھوڑے پر اور ہاتھ میں (علاقہ) خط کا بنا ہوا نیزہ۔ شام کو وہ بے شمار جانوروں کا ریوڑ میرے پاس لاتا اور ہر خوش گوار چیز ایک نہیں دو دو تھالیوں میں مجھے دیتا اور کہتا: کھا اور کھلا۔

اس نے یہ بھی کہا: ابو زرع کے ہاں کے برتن بھی اتنے بڑے ہیں کہ اگر میں ان ساری، (بے شمار) چیزوں کو منع کروں جو اس نے مجھے دی ہیں تو بھی اس کے ہاں کا سب سے چھوٹا برتن نہ بھرے۔

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں: رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: میں تیرے لیے ویسا ہی ہوں جیسا ام ابو زرع کے لیے ابو زرع (روایت سوائے اس کے کہ اس نے طلاق دی اور میں تجھے طلاق نہ دوں گا) بی بی نے کہا: بلکہ آپ ﷺ ابو زرع سے بھی بہتر ہیں۔ یا رسول اللہ ﷺ (روایت، میرے ماں باپ آپ پر فدا ہوں آپ میرے لیے اس سے بھی بہتر ہیں۔ جتنا ابو زرع ام زرع کے لیے تھا۔

نہسا یہ عورتیں جان سے رنجی ہیں (روایت، اعضا متناسب پیٹ دبا ہوا، گردن میں مالا بڑی ہوئی۔ فربہ سے بدن میں سلوٹیں بڑی ہوئیں، اعضا ٹھٹھے ہوئے، آنکھیں بڑی اور خوب سیاہ و سفید۔ کماندار بھنویں۔ لمبی نازک، نازک بدن، دراز گردن) ابو زرع کی ایک لونڈی بھی ہے۔ وہ ہے کیسی؟ (روایت، ابو زرع کا مہمان کیسا ہوتا ہے؟ پیٹ بھر کر کھاتا ہے۔ جی بھر کر پیتا اور فراوانی سے رہتا ہے۔ ابو زرع کے باورچی، وہ ہے کیسی؟ نہ کام میں وقفہ نہ بظمی ایک ہانڈی خالی ہونے لگتی ہے تو دوسری چڑھا دی جاتی ہے، پے در پے ایک کے بعد دوسری۔ ابو زرع کا مال، وہ کیا ہوتا ہے؟ خون بہا میں خرچ ہوتا ہے یا فقیروں کے لیے محفوظ رہتا ہے۔ اس (ام زرع) نے یہ بھی کہا:

ایک دن ابو زرع باہر گیا۔ اس کے ہمراہ مشکوں میں دودھ جھٹکے کھا رہا تھا۔ ایک عورت کو دیکھا جس کے ساتھ دو بچے کیا تھے گویا دو چھتے (روایت، شیر کے بچے) تھے جو اس کی چھائی پر دو اناروں سے شیل رہے تھے۔ اس پر ابو زرع نے مجھے طلاق

ساتویں نے کہا: میرا شوہر یا تو جہالت دکھاتا ہے یا گلوں کا سا رہتا ہے۔ چھائی سے چھائی تو ملتی ہے لیکن ہر مرض اس کے امراض میں پایا جاتا ہے تجھے زخمی کرے گا، یا سر پھوڑ دے گا، یا دونوں ہی کا کرے گا تو بولے تو تجھے گالی دے، تو اس کے ساتھ مذاق کرے تو تیرا پھوڑ دے۔

آٹھویں نے کہا: میرے شوہر کو چھوڑ تو خرگوش کا سا ہوتا ہے، سو گھٹوں تو زعفران کی سی بو ہوتی ہے۔ (میں اس پر غالب رہتی ہوں اور وہ دوسرے سارے لوگوں پر غالب رہتا ہے)۔ نویں نے کہا: میرے شوہر کے خیمے میں ستون بلند ہوتا ہے، اس کی تلوار کی حائل طویل ہوتی (میزبانی سے) راہک بکثرت نکلتی ہے۔ اس کا مسکن ہر کسی سال کے لیے قریب ہوتا ہے۔

دسویں نے کہا: میرا شوہر مالک ہے۔ مالک سے کیا مراد ہے؟ تجھے اس کی کیا خبر، اس کے اوٹ اکثر گھر کے سامنے ہی بیٹھے رہتے ہیں، چرنے کم جاتے ہیں اور جب وہ کسی مہمان کے استقبال کا باجاستے ہیں انھیں یقین ہو جاتا ہے کہ اب ان کی جان کی خیر نہیں۔

گیارہویں (زرع) نے کہا: میرا شوہر ابو زرع ہے۔ ام ابو زرع نے کہا (روایت، جانور اور کھیتوں کا مالک) اس نے میرے کانوں میں زبور لٹکائے اور میرے بازوؤں میں چربی (فربہ) بھری۔ مجھے خوش رکھتا ہے جس سے مجھے خوشی ہوتی ہے۔ مجھے وہاں پایا تھا جہاں بکریاں ٹھوڑی اور مشقت بہت پائی جاتی تھی اور وہاں لایا جہاں گھوڑے نہ ہناتے، اونٹ بلبلاتے، فصل کٹ کر غلہ روندنا جاتا اور چھلکوں سے دانہ نکالا جاتا ہے۔ میں اس سے کچھ بات کروں تو میری توہین نہیں کرتا۔ سوتی ہوں تو دل بھر کر صبح تک، پیتی ہوں تو جی بھر کر، کھاتی ہوں تو سیر ہو کر۔ ابو زرع کا بیٹا، اس کا کیا ہے؟ وہ سوتا ہے تو نرم و نازک حصیر پر۔ کھاتا ہے تو نو عمر بھیڑ کا ایک پورا ہاتھ (روایت، پیتا ہے تو آؤنی کا ایک بارود ہوا پورا دودھ، چلتا ہے تو مہین و نرم لباس میں اُگرتا ہوا)۔ ابو زرع کی بیٹی، وہ کیسی ہے؟ باپ کی بھی مطیع اور ماں کی بھی (روایت، گھر والوں بلکہ ساری عورتوں میں ایک زینت ہے) فربہ سے اپنی اوڑھنی میں بھر جاتی ہے۔ (یعنی جامہ زیب) ہے اور

دونوں نے کہا: خبر دی ہمیں یسعی بن یونس (بن ابی اسحاق السبئی نے اور کہا: حدیث بیان کی ہمیں ہشام بن عروہ نے (اپنے بھائی) عبد اللہ بن عروہ سے (انھوں نے اپنے باپ) عروہ (بن الزبیر بن العوام سے) انھوں نے اپنی خالہ عائشہؓ سے کہ بی بی نے فرمایا: (ایک بار) اربعہ تین کے حالات معاہدہ کیا اور باہم بیان کیا کہ وہ اپنے شوہروں کے حالات سے کوئی چیز نہ چھپائیں گی۔

پہلی نے کہا: میرا شوہر گویا ایک بہت ہی دبلا اونٹ ہو جو دشوار گزار پہاڑی کی چوٹی پر چلا گیا ہو (راہ) سہل نہیں کہ وہاں تک چڑھا جائے۔ اس میں فربہ بھی نہیں کہ اس کو (وہاں سے) منتقل (کرنے کی زحمت کو برداشت) کیا جائے (یعنی بخیل اور بد اخلاق ہے، اس سے کچھ مال اور امداد پانے کی امید بے سود ہے)۔

دوسری نے کہا: میں اپنے شوہر کی باتیں پھیلاتا نہیں چاہتی۔ ڈرتی ہوں کہ اگر ذکر کرنے لگوں تو کوئی چیز چھوڑ نہ سکوں اور اس کے ظاہری اور باطنی عیبوں کو بیان کر ڈالوں (جو مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ یعنی اس لطیف انداز میں کہہ دیا کہ وہ ہر طرح کی برائیوں سے بھرا ہوا ہے)۔

تیسری نے کہا: میرا شوہر بڑا بدخلق ہے اگر (اسے) بولوں تو طلاق دے دے اگر چہ رہوں تو معلق چھوڑ دے۔ چوتھی نے کہا: میرا شوہر ہتھامہ کی رات کی طرح ہے (کہ ہوا چلتی ہی نہیں) نہ گرمی نہ سردی (دیگر روایت نہ گرمی، نہ صحت شکن آب و ہوا) نہ خطر، نہ آکٹا ہٹ۔

پانچویں نے کہا: میرا شوہر گھر میں آتا ہے تو چھتے کی طرح خوابیدہ رہتا ہے؟ (پیار و محبت کے بغیر ہم بستر ہو جاتا ہے) اور باہر جاتا ہے تو شیر کی طرح (چھرا ہوا) اور یہ کبھی نہیں پوچھتا کہ گزر کر کس طرح ہو رہی ہے (اور آج کوکل کے لیے اٹھا نہیں رکھتا)۔

چھٹی نے کہا: میرا شوہر کھانے لگتا ہے تو سب سمیٹ کر، پیتا ہے تو آخری قطرے تک، سوتا ہے تو اپنے ہی کپڑوں میں لپٹ کر (تنہا) اور ہاتھ نہیں بڑھاتا کہ (میرے) درود کو معلوم کرے۔



ایمان تازہ ہو گیا

ایک بڑے ڈاکٹر کا قصہ، وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ کسی کی دعاؤں کا حصہ ہے

عبدالملک مجاہد

ہوئے کہ میں نے نوٹ کیا کہ کس طرح اللہ تعالیٰ ہماری دعاؤں کو قبول کرنے کے حالات پیدا کر دیتا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ دعا قبول ہو جاتی ہے۔ کچھ عرصہ قبل ایک دن صبح سویرے مجھے اپنے خاندان کی ایک بیوہ خاتون کے بارے میں خیال آنا شروع ہوا کہ نہ جانے ان کے کیا حالات ہوں گے وہ کیسی ہوں گی۔ وہ میری دور کی رشتہ دار ہیں اور کافی مدت پہلے بیوہ ہو گئیں۔ میں ان کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے آپ کو ملامت بھی کرتا رہا کہ میں نے ان کو کتنی مدت ہوئی فون نہیں کیا۔ نہ ہی ان کے حالات دریافت کیے ہیں۔ ذہن میں آیا کہ اگر ان کی طرف سے فون آیا، کوئی فرمائش ہوئی یا انھیں میری کسی مدد کی ضرورت ہوئی تو میں

”جب“ میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں تو آپ کہہ دیں کہ میں بہت ہی قریب ہوں ہر پکارنے والے کی پکار کو جب بھی وہ مجھے پکارے قبول کرتا ہوں۔ لوگوں کو چاہیے کہ وہ میری بات مان لیا کریں اور مجھ پر ایمان لائیں یہی ان کی بھلائی کا باعث ہوگا۔“ یہ ہمارے ایمان کا حصہ ہے کہ اللہ رب العزت اپنے تمام بندوں کی، خواہ وہ نیک ہوں یا گناہگار، عالم ہوں یا جاہل سب کی دعاؤں کو سنتا ہے اور انہیں قبول کرتا ہے۔ اپنے اللہ رب العزت سے براہ راست بغیر کسی واسطے سے مانگنے والوں کو وہ محروم نہیں کرتا۔ میری زندگی میں کئی بار ایسے مشاہدات اور تجربات

انشاء اللہ اسے ضرور پوری کرنے کی کوشش کروں گا۔ عصر کے بعد ان کا فون آگیا کہ ”میں کتنے دنوں سے سوچ رہی تھی کہ تمہیں فون کروں۔ دراصل مجھے کچھ مانی مدد درکار ہے۔“ میں نے فوراً پوچھا ”ہاں ہاں بتائیے“ اور پھر اسی وقت میں نے ان کی ضرورت پوری کرنے کی حامی بھر لی۔ فون بند ہوا تو میں نے کہا ”واہ میرے رب تو کتنا مہربان اور شفقت کرنے والا ہے۔ تو کیسے کیسے اسباب بناتا ہے۔ آج صبح تو نے پہلے میرے دل میں یہ خیال ڈالا اور ذہنی طور پر مجھے اس کی مدد کے لیے تیار کیا اور پھر شام تک اس کا کام بھی کر دیا۔ اس کے بقول وہ کئی روز سے سوچ رہی تھی اور دعا کر رہی ہوگی کہ اللہ تعالیٰ اس کے کام کا سبب بنا دے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے سچ فرمایا ہے:

﴿وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾

”تمہارے رب نے حکم دیا ہے: مجھے پکارو میں تمہاری دعاؤں کو قبول کرنے والا ہوں۔“

میں دعاؤں کی قبولیت کے سنہرے واقعات نامی ایک کتاب مرتب کر رہا تھا، اس میں ایک خوبصورت واقعہ نے میری توجہ اپنی طرف مبذول کرائی۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس واقعے نے ایمان تازہ کر دیا۔

اس کا نام ڈاکٹر احمد تھا اور وہ سعودی عرب کا معروف طبیب تھا۔ لوگ اس سے مشورہ لینے کے لیے کئی کئی دن تک انتظار کرتے۔ اس کی شہرت بڑھتی چلی گئی۔ دارالحکومت میں ایک انٹرنیشنل میڈیکل کانفرنس کا انعقاد ہوا جس میں اسے بھی دعوت دی گئی۔ اس کی خدمات کے پیش نظر فیصلہ ہوا کہ وہ اس کانفرنس میں نہ صرف کلیدی مقالہ پڑھے گا بلکہ اس موقع پر اسے اعزازی شیلڈ اور سرٹیفکیٹ بھی دیا جائے۔ ڈاکٹر احمد اپنے گھر سے ایئر پورٹ کی طرف روانہ ہوا۔ وہ بڑا خوش اور پرسکون تھا۔ آج شام اس کی تکریم اور عزت کی جانے والی تھی۔

اس کا سوچ کر وہ اور بھی زیادہ آسودہ ہو گیا۔ ایئر پورٹ پر وہ معمول کی چیکنگ کے بعد فوراً ہی ہوائی جہاز میں سوار ہو گیا۔ اس کی فلائٹ وقت کے مطابق پرواز کر گئی۔ کوئی آدھ پون گھنٹے کے بعد ایئر ہوسٹس نے اعلان کیا ہم معذرت خواہ ہیں کہ طیارے میں فنی خرابی کے باعث ہم قریبی ایئر پورٹ پر اتر رہے ہیں۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔

فلائٹ بغیر کسی رکاوٹ اور حادثے کے قریبی ایئر پورٹ پر اتر گئی۔ مسافر جہاز سے اتر کر لاؤنچ میں چلے گئے۔ ڈاکٹر احمد بھی دیگر مسافروں کے ساتھ طیارے کی فنی خرابی کے درست ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایئر پورٹ اتھارٹی نے اعلان کیا: خواتین و حضرات! انجینئر نے بتایا ہے کہ فنی خرابی کے درست ہونے کا فوری طور پر کوئی امکان نہیں ہے۔ لہذا مسافروں کے لیے متبادل طیارہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ یہ طیارہ کب آئے گا؟ کسی کو علم نہ تھا۔ تھوڑی دیر بعد نیا اعلان ہوا کہ متبادل طیارہ کل ہی آسکتا ہے۔ ہم اس زحمت کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ اب آپ کو ہوٹل پہنچا دیا جائے گا۔

ڈاکٹر احمد کے لیے یہ اعلان نہایت تکلیف دہ اور پریشان کر دینے والا تھا۔ آج رات تو اس کی زندگی کی نہایت اہم رات تھی۔ وہ کتنے ہفتوں سے اس رات کا منتظر تھا کہ جب اس کی تکریم ہوئی تھی۔ وہ کرسی سے اٹھا اور ایئر پورٹ کے اعلیٰ افسر کے پاس جا پہنچا، اپنا تعارف کرایا اور کہا کہ میں انٹرنیشنل لیول کا ڈاکٹر ہوں۔ میرا ایک ایک منٹ قیمتی ہے۔ مجھے آج رات دارالحکومت میں مقالہ پڑھنا ہے۔ پوری دنیا سے مندوبین اس سیمینار میں شرکت کے لیے آئے ہوئے ہیں اور آپ لوگ ہمیں یہ خبر سنارہے ہیں کہ متبادل طیارہ ۱۶ گھنٹے بعد آئے گا۔ متعلقہ افسر نے اسے جواب دیا: محترم ڈاکٹر صاحب ہم آپ کی عزت اور قدر کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی اور دیگر مسافروں کی

جن پرندوں کو قید رکھتے ہو، تم انہیں چھوڑ کر آزاد دیکھو
اڑ گئے کہ تو تم ہی ظالم تھے، لوٹ آئیں تو وہ تمہارے ہیں
جنی حواہ پتہ چنچ پڑتے ہو، خون روتے ہو، سوس پڑتے ہو
چاہتیں جو ذرا ادھی ہوں، مٹیں جو کبھی نہ پوری ہوں
بھول جاؤ تو مفلس و قلاش، یاد رکھو تو اک اثاثہ ہیں
زندگی کے اداس لہجوں میں، اک تلی ہیں اک دلاسا ہیں
سنگ کھاؤ نہ سنگ برسائے، سنگ دل سے کنارہ کر جاؤ
نرم دل گر کبھی ملے کوئی، نرمی دل کو تم بھی اپناؤ
سب ہی لوگوں کے دل میں بس جاؤ، زندگی جاری ہے تیزی سے
موت اوڑھے اک دو دھیا چادر، آ رہی ہے تمہیں اڑھانے کو
گلے اپنے تمہیں لگانے کو، کون سا بندہ باندھ سکتے ہو
جس نے جانا ہے جا کے رہنا ہے، جس نے آنا ہے آ کے رہنا ہے
آنے والے تر خدا حافظ، جانے والے ”تجھے خدا حافظ“

کو پورا کرنے کے لیے اسباب بھی خود ہی مہیا فرما دیتا
ہے۔ کائنات کی ساری مخلوق چاہے وہ جاندار ہو یا بے
جان، اللہ کے حکم اور اس کی مشیت کی پابند ہے۔ اس
واقعے میں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے
زمین و آسمان کی مختلف قوتوں کو کام میں لا کر بوڑھی اماں
کی دعا کو پورا کرنے میں لگا دیا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:
﴿أَمَّنْ يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَا وَ يُخْشِفُ
السُّوَاءَ وَ يُجْعَلُكُمْ خُلَفَاءَ الْأَرْضِ إِنَّ اللَّهَ مَعَ الَّذِينَ
قَلِيلًا مَّا تَذَكَّرُونَ﴾
”بے کس کی پکار کو جب کہ وہ پکارے، کون قبول
کر کے ختم کو دور کر دیتا ہے، اور تمہیں زمین میں جانشین
بناتا ہے۔ کیا اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے۔ تم
بہت کم نصیحت و عبرت حاصل کرتے ہو۔“ (النمل: ۶۲)

کی طرح ہوں۔ اللہ نے چاہا تو میں اسے ضرور کروں
گا۔ آپ کی جو بد میرے بس میں ہوگی ضرور کروں گا۔
خاتون کہنے لگی: میرے عزیز بیٹے! وہ دعا اور خواہش
میرے اپنے لیے نہیں بلکہ اس یتیم بچے کے لیے ہے جو میرا
پوتا ہے۔ اس کے ماں باپ کچھ عرصہ پہلے فوت ہو چکے
ہیں۔ اسے ہڈیوں کی ایک بیماری ہے جس کی وجہ سے چلنے
پھرنے سے معذور ہے۔ میں نے قریبی حکیموں، مہمانوں
سے اس کے بڑے علاج کرائے ہیں مگر تمام اطباء اس کے
علاج سے عاجز آ گئے ہیں۔ لوگوں نے مشورہ دیا ہے کہ
اس ملک میں ایک ہی ڈاکٹر ہے جو اس ہڈیوں کے علاج کا
ماہر ہے، اس کی شہرت دور دور تک ہے۔ وہ بڑا مانا ہوا
سرجن ہے۔ وہی اس کا علاج کر سکتا ہے، مگر وہ تو یہاں
سے بہت دور رہتا ہے پھر سنا ہے بہت مہنگا بھی ہے۔ اس
تک پہنچنا کوئی آسان کام تو نہیں ہے۔

تم میری حالت تو دیکھ ہی رہے ہو، میں بوڑھی جان
ہوں۔ کسی وقت بھی بلاوا آ سکتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ
میرے بعد اس بچے کی نگہداشت کرنے والا کوئی نہیں ہو
گا۔ میں ہر وقت اللہ تعالیٰ سے دعا کرتی ہوں کہ وہ کوئی
سبب پیدا کر دے کہ اس بچے کا اس ڈاکٹر سے علاج ہو
سکے۔ عین ممکن ہے کہ اس یتیم بچے کو شفاء اسی ڈاکٹر کے
ہاتھوں مل جائے۔

ڈاکٹر احمد اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا، اس نے
رندھی ہوئی آواز میں کہا: اماں جان! میرا طیارہ خراب ہوا،
راستے میں اترنا پڑا کار کرائے پر لی، خوب طوفان آیا
آندھی اور بارش آئی، راستہ بھول گیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے
آپ کے گھر زبردستی بھجوا دیا۔ اماں آپ کی آخری دعا بھی
قبول ہو چکی ہے۔ اللہ رب العزت نے ایسے اسباب مہیا کر
دیے ہیں کہ وہ ہڈیوں کا بڑا ڈاکٹر خود چل کر آپ کے گھر
آ گیا ہے۔ اب میں آپ کے پوتے کا علاج کروں گا۔“
جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کی سنتا ہے تو پھر اس

ڈاکٹر احمد گھر میں داخل ہوا تو دیکھا کہ ایک بوڑھی عورت
متحرک کرسی پر بیٹھی ہے۔ اس نے خاتون سے کہا: اماں!
میرے موبائل کی بیٹری ختم ہو چکی ہے، کیا میں اپنا موبائل
چارج کر سکتا ہوں؟

بوڑھی عورت مسکرا کر کہنے لگی: میرے بیٹے کون سے
فون کی بات کر رہے ہو؟ تحصیل معلوم نہیں اس وقت تم
کہاں ہو؟ ہمارے ہاں نہ تو بجلی ہے نہ ٹیلی فون، یہ تو
ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جہاں شہری سہولتوں کا کوئی تصور
نہیں ہے پھر اس نے مزید کہا!

میرے بیٹے وہ سامنے میز پر چائے اور کھانا
رکھا ہے۔ لگتا ہے کہ تم بھوکے اور پیاسے ہو۔ راستہ بھٹک
گئے ہو۔ تم پہلے کھانا لو پھر بات کریں گے۔ لگتا ہے تم
خاصا طویل فاصلہ طے کر کے آئے ہو۔ ڈاکٹر احمد نے
اس بوڑھی خاتون کا شکریہ ادا کیا اور کھانے پر ٹوٹ پڑا
۔ سفر کی تھکاوٹ سے اسے شدید بھوک لگ رہی تھی
۔ اچانک خاتون کی کرسی کے ساتھ والی چارپائی پر حرکت
ہوئی اور ایک معصوم نے رونا شروع کر دیا۔ خاتون نے
اس بچے کو تھپک کر سلایا اور اسے دعائیں دینا شروع
کیں۔ وہ اس بچے کی صحت اور سلامتی کے لیے لمبی لمبی
دعائیں کر رہی تھی۔

ڈاکٹر احمد نے کھانا کھایا اور بوڑھی اماں سے کہنے لگا:
اماں جان! آپ نے اپنے اخلاق کرم اور میزبانی سے میرا
دل جیت لیا ہے۔ آپ لمبی لمبی دعائیں مانگ رہی ہیں۔
امید ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی دعائیں ضرور قبول کرے گا۔
”میرے بیٹے! وہ بوڑھی گویا ہوئی۔“ میرے اللہ نے
میری تمام دعائیں سنی اور قبول کی ہیں۔ ہاں بس ایک دعا
باقی ہے جو میرے ضعف ایمان کی وجہ سے پوری نہیں
ہوئی۔ تم تو مسافر ہو، دعا کرو کہ وہ بھی قبول ہو جائے۔

ڈاکٹر احمد کہنے لگا: اماں جان وہ کوئی دعا ہے جو قبول
نہیں ہوئی۔ آپ مجھے اپنا کام بتائیں میں آپ کے بیٹے

مشکلات کا اندازہ ہے۔ لیکن یہ ہمارے بس کی بات نہیں
اور نیا طیارہ فوری طور پر فراہم کرنا میرے بس میں نہیں
ہے۔ البتہ وہ شہر جہاں آپ کو کانفرنس میں شرکت کے لیے
جانا ہے، یہاں سے بذریعہ کار سے صرف تین چار گھنٹے کی
مسافت پر ہے۔ اگر آپ کو بہت جلدی ہے تو ایئر پورٹ
سے کرایہ پر گاڑی حاصل کریں اور خود ڈرائیو کرتے ہوئے
متعلقہ شہر پہنچ جائیں۔“

ڈاکٹر احمد لمبی ڈرائیونگ کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ مگر اب
یہ مجبوری تھی اس کے پاس کوئی متبادل راستہ تھا ہی
نہیں۔ اس نے متعلقہ آفیسر کے مشورے کو پسند کیا اور ایئر
پورٹ سے کار کرایہ پر لے کر متعلقہ شہر کی جانب روانہ ہو
گیا۔ ابھی کچھ ہی فاصلہ طے کیا تھا کہ اچانک موسم خراب
ہونا شروع ہو گیا۔ آسمان پر گہرے بادل نمودار
ہوئے۔ تیز آندھی اس پر مستزاد تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زور
دار بارش شروع ہو گئی اور ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ موسم
کی خرابی کی وجہ سے اسے اندازہ ہی نہ ہوا کہ وہ کس سمت
جارہا ہے۔ دو گھنٹے تک وہ مسلسل چلتا گیا، بالآخر اسے
یقین ہو گیا کہ وہ راستے سے بھٹک چکا ہے۔

اب اسے بھوک اور تھکاوٹ کا احساس بھی بڑی
شدت سے ہونے لگا۔ اس نے سوچا تھا: تین چار گھنٹے ہی
کا سفر تو ہے، اس لیے اس نے اپنے ساتھ کھانے پینے کی
کوئی چیز بھی نہ لی تھی۔ اب اسے کسی ایسے ٹھکانے کی تلاش
تھی جہاں سے اسے کھانے پینے کی کوئی چیز مل سکے۔ وقت
تیزی سے گزرتا رہا تھا۔ چاروں طرف رات کا اندھیرا بھی
چھا چکا تھا۔ ایک چھوٹے سے گاؤں کے پاس سے گزرتے
ہوئے اس نے غیر شعوری طور پر اپنی گاڑی ایک چھوٹے
سے گھر کے سامنے روک دی۔ اس کا ہاتھ گھر کے
دروازے پر دستک دے رہا تھا جب اندر سے ایک بوڑھی
عورت کی نحیف و ناتواں آواز اس کے کانوں میں پڑی جو
کہہ رہی تھی: جو بھی ہو اندر آ جاؤ دروازہ کھلا ہے۔



تاریخ کی خوب صورت کہکشاں سے چند انمول واقعات

سچی کہانیاں



حبیب اشرف صوبی

بدلہ

ہندوستان میں شیرشاہ نام کا ایک ایسا بادشاہ گزرا ہے جس کے احسانوں کو ہندوستان کے لوگ رفتی دنیا تک نہ بھولیں گے۔ وہ بڑا بہادر، نہایت سمجھدار، انصاف پسند اور منتظم بادشاہ ہوا ہے۔ اُس نے رعایا کی بھلائی کے لیے بڑے بڑے کام کیے اور ایسے قوانین بنا گیا کہ آج تک یہاں کی حکومت اُن سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔ انصاف کرنے میں تو اس کا یہ حال تھا کہ اُس کے بیٹے بھی اُس سے کانپا کرتے تھے۔

ایک بار اُس کا بیٹا عاقل خاں ہاتھی پر سوار جا رہا تھا۔ راستے میں ایک بیٹے کا گھر پڑتا تھا۔ بیٹے کے گھر کی دیواریں نیچی تھیں۔ بیٹے کی بیوی اُس وقت نہا رہی تھی۔ شہزادے نے اُسے دیکھا تو شرارت سوچی۔ اُس نے پان کی گوری عورت پر چٹکنی اور ہنستا ہوا چلا گیا۔

گوری عورت پر گری تو اُس نے اوپر دیکھا۔ ہاتھی پر شہزادے کو دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو گئی۔ شرم کے مارے اُس نے چاہا کہ پھری سے اپنا خاتمہ کر لے۔ بیٹے نے

روکا اور کہا گھبرانے کی بات نہیں میں بادشاہ کے پاس جاتا ہوں بادشاہ بڑا خدا ترس اور رعایا پرور ہے۔ انصاف کے معاملے میں وہ کسی کی رعایت نہیں کرتا۔ میں بھی اپنی بے عزتی کا بدلہ شہزادے سے لیتا ہوں۔

بیوی کو سمجھا بچھا کر بیٹے نے بادشاہ سے فریاد کی۔ شہزادے پر مقدمہ ہو گیا۔ عدالت کے سامنے بیٹے نے ساری کہانی سُنائی۔ شیرشاہ نے شہزادے کی طرف دیکھا اور ڈانٹ کر کہا کجبت تو خدا کے غضب سے نہیں ڈرتا۔ اس کے بعد حکم دیا کہ بنیا ہاتھی پر سوار ہو اور شہزادے کے محل کی طرف گزرے۔ شہزادے کی بیوی کو اس کے سامنے کیا جائے اور بنیا اُس پر پان کا بیڑا چھینکے۔

اب دربار میں ہل چل مچ گئی۔ بادشاہ کے امیروں، وزیروں نے بادشاہ کو بہت سمجھایا کہ یہ سزا مناسب نہیں۔ اگر شہزادے کو سزا دینی ہی ہے تو دوسری سزا دی جائے۔ لیکن شیرشاہ اپنے فیصلے پر اڑ گیا۔ اُس نے کسی کی ایک نہ سنی۔ جواب دیا کہ میری نظر میں راجا اور پر جاسب برابر ہیں۔ فیصلہ اب بدلنا نہیں جاسکتا۔

بادشاہ کا یہ فیصلہ سن کر بیٹے کا یہ حال ہوا کہ وہ ہاتھ

جوڑ کر کہنے لگا۔ ”مائی باپ! بس میرا انصاف ہو گیا۔ میں اپنے دعوے سے ہاتھ اٹھاتا ہوں۔“
بیٹے کی بات سن کر بادشاہ کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔ حکم دیا کہ اُسے خوش کر دو۔ پھر اشرفیوں کی تھیلیاں اُسے دیں۔ امیروں، وزیروں نے بھی اپنے پاس سے انعام دیا۔ شہزادے نے معافی کا حال سُنا تو اُس نے بیٹے کے پاس زیورات کی نشتی بھیجی۔

شکار کرنے چلے تھے

نواب حافظ رحمت خاں ہندوستان کے اُن نیک اور نامور حکمرانوں میں سے تھے جو اپنی بہادری اور انصاف پروری میں اپنی مثال آپ تھے۔ نواب صاحب کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ اُن کی حکومت میں سارے کام خدا ترسی کے ساتھ شریعت کے مطابق ہوں۔ جن لوگوں نے نواب صاحب کی تاریخ لکھی ہے وہ سب گواہ ہیں کہ حافظ صاحب کے عہد حکومت میں شیر اور بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔

ایک روز حافظ صاحب کے صاحبزادے حافظ محمد یار خاں پہلی بصیت کے جنگل میں شکار کو گئے۔ جنگل کے قریب پہنچے تو اپنے ساتھیوں اور ہاتھی گھوڑوں کو تو گاؤں میں چھوڑا۔ صرف محمد خاں جلی کو ساتھ لیا۔ یہ سردار شکار میں بڑا ماہر تھا۔ ابھی جنگل میں داخل نہیں ہوئے تھے کہ کچھ ہرن دکھائی دیے۔ ان کا چھپا کیا۔ قریب پہنچے تو حافظ محمد یار خاں ایک جگہ گھاٹ میں بیٹھے اور محمد خاں جلی کو حکم دیا کہ ہرنوں کو گھیر کر سامنے لاؤ۔

محمد خاں جلی چلا تو اُس وقت گاؤں کا ایک شخص اُس طرف اٹکا۔ محمد خاں نے اُسے ہرنوں کی طرف جانے سے منع کیا لیکن وہ نہ مانا۔ آگے بڑھتا چلا گیا۔ اُس کے پاؤں کی آہٹ پا کر ہرن بھاگ گئے اور اُن کی آن میں نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ محمد خاں کو بڑا غصہ آیا۔ اس نے گنوار کو گالی دی اور کہا ”تجھ کو کیا ہو گیا تھا کہ تو نے میری بات نہیں سنی اور میرا شکار نکال دیا۔“

گالی کے جواب میں گنوار نے بھی گالی دی اور بولا ”میں تیرے واسطے اپنا راستہ کیوں چھوڑ دیتا؟“

اس جواب پر محمد خاں نے اُس کے منہ پر طمانچہ مارا۔ وہ طمانچہ کھا کر بھاگا اور اپنے سات آدمیوں کو بلالایا اور ان کی کمک پا کر محمد خاں کے سر پر لاٹھی دے ماری۔ محمد خاں فوجی سردار اور بڑا قوی آدمی تھا۔ زخم کھا کر اس سے لپٹ گیا اور دے پنکا۔ اسی وقت حافظ محمد یار خاں بھی آگئے۔ لڑائی کا یہ رنگ دیکھا تو چھری محمد خاں کے ہاتھ میں تھما دی۔ محمد خاں کے ہاتھ میں چھری دیکھ کر دوسرے دیہاتی لاٹھیاں لے کر پل پڑے اور لڑنے لگے۔

یہ دونوں بہترین سپاہی تھے۔ سات آٹھ آدمیوں کو خاطر میں کیا لاتے۔ لیکن لاٹھیوں کی چوٹوں سے نہ بچ سکے۔ لڑتی رہے تھے کہ حافظ محمد خاں کے سوار اور پیادے اُن کو ڈھونڈتے ہوئے آگئے۔ گاؤں والوں نے لشکری آدمیوں کو دیکھا تو سمجھے کہ یہ دونوں یا تو شہزادے ہیں یا بڑے آفیسر۔ اب وہ سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ جنگل میں گھس کر ادھر ادھر چھپ گئے۔

حافظ محمد یار خاں نے اپنے آدمیوں کی مدد سے ان کو تلاش کرایا مگر ایک بھی ہاتھ نہ لگا۔ مجبور ہو کر ساتوں دیہاتیوں کی تیل گاڑیاں جو تریب ہی تھیں اور ایندھن سے لدھی تھیں۔ کھینچ کر پہلی بصیت لے گئے۔ تیسرے چوتھے دن دیہاتی ملک سیر خاں گورنر پہلی بصیت کے پاس پہنچے اور درخواست دی کہ کوئی شخص ہماری گاڑیاں جنگل سے باہر کر پہلی بصیت لے آیا ہے۔ گورنر نے پوچھا تم پہچانتے ہو؟ بولے

”جی ہاں۔ مگر ہم ملزموں کے بارے میں نواب صاحب کے سامنے کچھ عرض کریں گے۔“

ملک صاحب نے مقدمہ درج کر کے نواب صاحب کی خدمت میں بھیج دیا۔ وہاں سے ان سب کی طلبی ہوئی تو فریاد کی کہ حضور کے صاحبزادوں میں سے کوئی ہماری گاڑیاں اور تیل جنگل سے لے آیا ہے۔ نواب صاحب نے وجہ پوچھی تو دیہاتی گھبرائے اور سوچا کہ قصور تو اپنا ہے

ہنگی اور عجب کے لئے ان اپنے عجب کے لیے ہیں مگر وہ نہیں

نتیجہ اخذ کر کے اس نقص کو دور کیا جائے۔ ایک فقیر نے کہا کہ اس محل میں دو نقص ہیں۔
”ایک یہ کہ آپ اس میں ہمیشہ نہ رہیں گے۔ دوسرا محل ہمیشہ نہ رہے گا۔“

خلیفہ اس کلام سے اس قدر متاثر ہوا کہ وہ محل غریبا اور فقرا کے لیے وقف کر دیا۔

بیوہ کا جھوٹا بیوہ

خلیفہ الحکم بن خلیفہ عبدالرحمن ثالث کو اپنا محل بنوانا تھا۔ اتفاق سے جو زمین پسند کی گئی اُس میں ایک غریب بیوہ کا جھوٹا آتا تھا۔ اس بیوہ کو کہا گیا کہ یہ زمین قیثا دے دے۔ مگر اُس نے انکار کیا۔ خلیفہ نے زبردستی اُس زمین پر قبضہ کر کے محل بنوا لیا۔ اس بیوہ نے قاضی کی خدمت میں حاضر ہو کر اُس کی شکایت کی۔ قاضی نے اُسے تسلی دے کر کہا کہ تم اس وقت جاؤ میں کسی مناسب موقع پر تیرا انصاف کرنے کی کوشش کروں گا۔

خلیفہ الحکم جب پہلے پہل محل اور باغ ملاحظہ کرنے گیا تو اُسی وقت قاضی بھی وہاں خود ایک گدھا اور ایک خالی بوری لے کر گیا اور خلیفہ سے وہاں سے مٹی لینے کی اجازت چاہی۔ اجازت دے دی گئی۔ قاضی نے اُس بورے میں مٹی بھر کر عرض کی کہ مہربانی فرما کر اس بورے کے اٹھانے میں اس کی مدد کی جائے۔ خلیفہ نے اسے ایک مذاق سمجھا اور بورے میں ہاتھ لگا کر اٹھانے کی کوشش کی۔

چونکہ وزن زیادہ تھا خلیفہ سے ذرا بھی نہ اٹھا۔ اُس وقت قاضی نے کہا ”اے خلیفہ! جب تو اتنا سا بوجھ اٹھانے کے قابل نہیں تو قیامت کے دن جب ہم سب کا مالک انصاف کرنے کے لیے عرش پر جلوہ افراز ہوگا اور جس وقت وہ غریب بیوہ جس کی زمین تو نے بزور لے لی ہے اپنے پروردگار سے انصاف کی خواہاں ہوگی تو اس تمام زمین کے بوجھ کو کس طرح اٹھا سکے گا؟“

خلیفہ اس تقریر سے بہت متاثر ہوا اور فوراً اس محل کو معد تمام چیزوں کے اس بیوہ کو عطا کر دیا۔

وہ کچھ کہہ نہ سکے۔ نواب صاحب نے اطمینان دلایا کہ پورا پورا انصاف کیا جائے گا۔ گھبراؤ نہیں۔ مگر دیہاتی انصاف کا نام سن کر بوکھلا گئے تو جان بخشی کی درخواست کے بعد پورا حال سچ کہہ دیا۔

نواب صاحب نے حکم دیا کہ بیل گاڑیاں مع سامان اور ملزم حاضر کیا جائے۔ اس حکم کے بموجب حافظ محمد یار خاں عدالت میں حاضر ہوئے تو نواب صاحب نے بیٹے کو ڈانٹا اور کہا ”تم ان بے گناہوں کا مال کیوں چھین لائے؟“

بیٹے نے عرض کیا ”حضور! اس کا سبب ان سب سے پوچھ لیا جائے۔“ اور پھر اپنے زخم دکھائے۔
محمد خاں خلجی نے بھی اپنا سر اور کندھا کھول کر دکھایا۔ دیہاتیوں کی زیادتی ثابت ہوگئی لیکن نواب صاحب نے فیصلہ سنایا:

”ان بے چارے بے خبر لوگوں کا کوئی قصور نہیں۔ تم خود اس کے ذمہ دار ہو۔ خبردار پھر کبھی ایسی جرأت نہ کرنا۔ چونکہ یہ دیہاتی بے خبر تھے اس لیے ان سے کوئی مواخذہ نہیں ہو سکتا۔ جاؤ ان کی بیل گاڑیاں اور سامان واپس کر دو اور انہیں راضی کر کے خوش کرو۔“

حافظ محمد یار خاں اور محمد خاں خلجی نے یہ فیصلہ غنیمت سمجھا اور بہت کچھ دے دلا کر راضی نامہ داخل کر دیا۔ دیہاتی خوشی خوشی لوٹ گئے۔

عارضی رہائش گاہ

امیر المومنین مہدی نے ایک نیا محل تعمیر کروایا۔ خلیفہ نے فرمایا ”کسی شخص کو اس محل کے نظارے سے منع نہ کیا جائے۔ ناظرین یا تو دوست ہوں گے یا دشمن۔ اگر دوست ہوں گے تو محل دیکھ کر خوش و خرم ہوں گے اور ہمیں دوستوں کی خوش دلی مطلوب ہے اور اگر دشمن ہیں تو رنج اٹھائیں گے اور دل کوفتہ ہوں گے اور ہر شخص کی یہی مراد ہوتی ہے کہ دشمن کو رنج پہنچائے۔ نیز شاید وہ کوئی عیب ڈھونڈیں اور کوئی خلل کی بات بتائیں اور اس سے کوئی

عالم اسلام کے مایہ ناز دانشور، مصنف اور مفکر مولانا یوسف اصلاحی سے ایک دل پذیر گفتگو

اختر عباس

ہمارے پوری تاریخ
خواتین کی تعلیم
سے خالی ہے

۸۱ سال کی عمر میں جوانوں کی طرح متحرک اور خوش رہنے والے محمد یوسف اصلاحی بھارت میں واقع جامعہ الصالحات بریلی کے سربراہ ہیں، جہاں تین ہزار پچاس پڑھتی ہیں۔ یہ سچی عالمہ بن رہی ہیں۔ ۱۱۵۰ تو باہل میں رہتی ہیں۔ محدثہ، مفسرہ اور مفتیہ بناتے ہیں۔ اب تک ۲۴ رائج نکل چکے ہیں۔ یہاں سے فارغ التحصیل ہونے والی ایک طالبہ نے نیپال جا کر ایسا ہی مدرسہ قائم کیا ہے، جہاں ہر طرف صرف ہندو سنتے ہیں۔ اب وہ اسے سنتے ہیں، اس سے پڑھتے ہیں۔ ایسی ہی کتنی بچیوں کے ذہن اور زندگیاں بدل چکے ہیں۔ انھوں نے اپنی بچیوں کے لیے ایک رسالہ شروع کیا ”کڑی“ وہی رسالہ اب ہندوستان بھر میں شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ ان کے ۸ بچے ہیں۔ ۳ لڑکیاں اور ۵ لڑکے، بیٹا ڈاکٹر سلمان انگریزی میں بی بی عربی کا بھی ماہر ہے۔ ان کی تمام کتابوں کا ترجمہ کر رہا ہے جن کی تعداد ۶۰ ہے۔

”آپ“

شروع سے اصلاحی تھے۔ ”میرا سوال سن کر وہ مسکرائے۔“ ”نہیں یہ اصلاحی ان معنوں میں نہیں ہے۔ مدرسہ

اصلاح سے فارغ ہونے کے بعد اس مناسبت کے باعث یہ نام اختیار کیا۔ ۱۹۵۳ء کی بات ہے یہ۔ تب میں ۲۲، ۲۱ سال کا تھا، جب آداب زندگی لکھی، یہاں پاکستان میں آپ کے مخاطب صرف مسلمان ہیں۔ وہاں اس کو ہندو اور سکھ بھی اتنے ہی شوق سے پڑھتے ہیں۔ چونکہ اس میں براہ راست مسلمانوں سے خطاب نہیں ہے، اس لیے پڑھنے والا رد عمل کا شکار نہیں ہوتا۔ ہم نے سید ابوالاعلیٰ مودودی کو پڑھا، ان کی تحریروں کو، ہم کو ہضم کیا۔ اپنی سوچ اور روح کا حصہ بنایا، پھر خود لکھا۔ انھوں نے بھی تو الجہادی الاسلام ۲۸، ۲۹ سال کی عمر میں لکھ ڈالی تھی۔“ اس پر میں نے بات آگے بڑھائی۔

”بھارت، پاکستان کے علاوہ ان ممالک میں بھی جہاں جہاں اُردو پڑھنے والے ہیں، وہاں وہاں آپ کی کتابیں اور تحریروں شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ ایسی پذیرائی اور تعارف کا بھی سوچا تھا۔“

وہ بولے، ”جب لوگ یوں سامنے اور غائبانہ تذکرہ کریں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں۔ کبھی ذہن میں بھی نہیں تھا جو تحریروں اپنی بچیوں کے لیے لکھ رہا ہوں۔ وہ یوں مقبول ہوں گی۔“

☆ آپ کے ہاں ایک نئی چیز، نیا ٹریڈ دیکھنے میں آیا کہ ہندو اسلامی پیکچر سننے کیسے آجاتے ہیں۔ وہ بھی

ہزاروں کی تعداد میں..... ہمارے ہاں تو اپنے ہم مذہب کو بات سننے پر آمادہ کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔“ میری بات سن کر وہ مسکرائے ”وہاں واقعی بہت سے ہندو بھی کھلے دل سے سوچتے ہیں۔ اسلام کو سنتے ہیں۔ اس قدر آمادگی پہلے نہ تھی۔ جماعت اسلامی ہند کا ایک اخبار جو صرف ملیا لم زبان میں ہے۔ ”پربودھ نم“ کیرالا سے نکلتا ہے۔ ۵/۵ لاکھ سے زائد اس کی روزانہ کی اشاعت ہے۔ اس کا ایڈیٹر ایک پروفیشنل صحافی ہے اور نان مسلم ہے۔ وہاں اس طرح کے بہت بھلے لوگ ہیں۔ تو بین رسالت ﷺ کے مسئلے پر جب وہاں مسلمانوں کے جلوں اور ریلیاں نکلتیں تو کتنے ہندو اور سکھ ہمارے ساتھ تھے۔“ ☆ میں نے ایک اور وضاحت چاہی ”سنا ہے وہاں ہماری طرح کی جوشیلی اور جذباتی تقریریں نہیں ہوتیں؟.....“

”بالکل، یہ بات درست ہے۔ ہمارے موضوعات میں انسانی قدریں، اچھے رویے، سچ بولنا، چیزوں اور خدمات کی ملاوٹ و آمیزش سے پاک فراہمی، انسانی خدمت جیسی باتیں شامل ہوتی ہیں۔ وہاں حالات کی سختی اور پابندی ویسی نہیں ہے، جیسی آپ سوچتے ہیں۔ جمہوری قدروں کی پاسداری خاصی زیادہ ہے۔ لوگ اعتراضات کرتے ہیں۔ سوال اٹھاتے ہیں، ہم ان کے جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں، یوں بھی ہم ان کے قریب چلے

۱۹۸۱ء کی بات ہے گورنمنٹ ایس ای کا کالج بہاولپور سال دوم کا طالب علم تھا۔ جب میں نے پہلی بار اسلامی موضوعات پر مختلف مفکرین کو پڑھنا شروع کیا..... سید قطب، حسن الہیاء، محمد قطب، علامہ یوسف القرضاوی، صدر الدین اصلاحی، حمید الدین فراہی، جلیل احسن مدنی، عبدالغفار حسن، امین احسن اصلاحی، شبلی نعمانی، آبادشاہ پوری۔ مسائل اور معاملات پر آراء اور موقف ہی مختلف تھے۔ شرطیں بھی بھاری بھر کم تھیں، ان کے طرز فکر کو برحق ماننے سے دین آسان ہوتا دکھائی دیا، سوال یہ تھا کہ دینی معاملات اتنے آسان کیونکر ہو سکتے ہیں۔ تب چاچا جناب عبدالرب مجاہد نے (آج کل بہاول پور میں فارما سیکول کے پرنس سے وابستہ ہیں) ایک کتاب پڑھنے کو دی۔ نام تھا آسان فقہ..... اس کے دو حصے تھے۔ اول اور دوم، اس کتاب کا کمال یہ تھا کہ اس نے فقہ کے معاملے میں درپیش ہر مسئلے اور پریشانی کو گرد کی طرح جھاڑ دیا، میرے دل سے مصنف کے لیے بے شمار دعائیں نکلیں..... بعد میں آسان فقہ استعمال بھی خوب کیا۔ کئی لبرٹیز (آزادیاں) لیں، کئی جگہ اجتہاد کیا اور آسانیاں پائیں بلکہ اب تک پارہے ہیں۔ کتاب کے مصنف محمد یوسف اصلاحی تھے۔ ان کو ڈھونڈنا شروع کیا تو پتا چلا کہ انڈیا سے ہیں..... یوں ملاقات کا خیال دل سے نکالنا پڑا۔ ان کی تحریروں آتی رہیں۔ ان کی یاد تازہ کرتی رہیں۔ خاص طور پر ”شعور حیات“ نے کتنی ہی ذہنی انجھون کو دور کیا۔ نئے زمانے کی ڈکشن کے اعتبار سے یہ بے حد Motivational کتاب ثابت ہوئی اسے الہدیر جیلی کیشنر اردو بازار لاہور کے عبدالحمید احمد صاحب نے مختلف انداز اور بڑے سائز میں شائع کرنے کے کئی تجربے بھی کیے.....

یہ کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اتنے برسوں بعد ایک روز چاچا جناب ان سے ملاقات ہو جائے گی۔ سچ ہے کہ دل میں خواہش اور آرزو ہو تو اللہ جی کبھی نہ کبھی اس کے پورے ہونے کے اسباب بناتے ضرور ہیں..... ان سے ملنے کے بعد ایک بات جس نے مجھے اطمینان اور آسودگی سے ہم کنار کیا وہ یہ تھی کہ بطور عالم دین ان کے مزاج میں بہت نرمی اور نفاست تھی، گفتگو کے دوران رد عمل پیدا نہیں ہوتا۔ تردید کرنے کو دل نہیں جاتا۔ میں نے کتنی ہی اٹلے سیدھے سوال کیے، سیاسی اور سماجی حوالوں سے رونما ہوتی تبدیلیوں کے بارے میں جاننا چاہا۔ اس کی شخصیت اور پسند و ناپسند کے حوالے سے کئی سوال کر ڈالے۔ کسی ایک سوال پر بھی انھوں نے جارحانہ رویہ اپنایا نہ کسی جواب میں ویسا کوئی تاثر دیا۔ اہل علم اور اہل دانش کی یہی بات انھیں عام لوگوں سے ممتاز اور نمایاں کرتی ہے۔ ان کی باتوں کا وزن بڑھاتی، تاثیر کو پر لگاتی اور شہرت کو دور تک پہنچاتی ہے۔ ان کے معاملے میں یہ ہوا کہ یہ شہرت ذات سے زیادہ فخر پھیلانے کے کام آتی ہے اور بھارت میں ہزاروں ہندوؤں اور سکھوں کو بات سننے، پڑھنے پر آمادہ کرتی ہے اور کبھی پاکستان میں کراچی کے سخت دل کشم آفسر جیسے لوگوں کے دلوں پر آبشار کی صورت گرتی ہے۔ ان کے چاہنے والے آسٹریلیا سے امریکا تک پھیلے ہوئے ہیں۔

جاستے ہیں، کبھی وہ ہمارے قریب آجاتے ہیں۔ اصل میں اہل اسلام جب کسی طرف لگ جائیں تو نتائج ضرور برپا کرتے ہیں۔ دل کی یکسوئی اور نیت کی پختگی سے کیسے گئے کام میں خدا بہت کشش اور برکت ڈال دیتا ہے۔“ ☆ ”ہمارے ہاں پاکستان میں معاشی ترقی کے اثرات کو آپ لوگ کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟“ میں نے اب سوالوں کا رخ بدل کر پوچھا۔

وہ بولے: ”آپ کے ہاں تمدنی طور پر اور معاشی طور پر بہت تبدیلی آگئی ہے۔ بہت ارتقاء ہوا ہے۔ میں کئی

سال بعد آیا ہوں اور کئی دن انک رہ کر آیا ہوں یوں مجھے پاکستان اور اہل پاکستان کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ کچھ عرصہ قبل میں جاپان گیا ہوا تھا۔ وہاں کاروں کے کاروبار میں ہر طرف پاکستانی چھائے ہوئے ہیں۔ خود مجھے جن صاحب نے اپنے شوروم میں افتتاح کے لیے بلوایا تھا، وہ پاکستانی تھے اور بہت سمجھداری اور دیانت داری سے کاروبار کر رہے ہیں۔ ۵۰ ملین ڈالر ان کا سالانہ ٹرن اوور تھا۔ کئی جاپانی ان کے ملازم ہیں، مگر وہ اپنی تہذیب، زبان اور روایات کے کچے تھے۔ یہاں پاکستان میں مغربی

اسی وجہ سے میں نے اپنی ساری ڈگریاں ہی چھڑا دیں

تہذیب کی یلغار ہندوستان کی طرح کافی زیادہ ہے، مگر ہندو اپنے گھر میں خاصے مضبوط ہیں۔ آپ کے ہاں ویسی مضبوطی نہیں ہے، یہاں مغربی کلچر کے شغف اور اثرات بے پناہ ہیں۔ اس سیلاب کو روکنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نظر نہیں آرہی۔ انھوں نے دکھ بھرے لہجے میں کہا: ”ہندو اہل دانش اس حوالے سے اپنے ہاں باقاعدہ کام کر رہے ہیں، وہ اس کے مضمرات سے آگاہ ہیں اور اپنی قوم کو اس سے بچانے کے لیے سوچتے ہیں۔ پریشان ہیں۔“

س: جب آپ بولتے ہیں تو آپ کا انداز مولانا مودودی سے ملتا ہے!
ج: فقال ہوں نا ان کا، میں نے زندگی میں مولانا آزادی کی تقریر بھی سنی۔ ان کی نقل کرنے کی کوشش بھی کی۔ مگر ان کا انداز مجھے اچھا نہیں لگا۔
س: لفاظی کی وجہ سے؟
ج: لفاظی نہیں اصل میں تھوڑا سا اپنی شخصیت کو ابھارنا پڑتا ہے، نمایاں کرنا پڑتا ہے اور یہ مجھے گوارا نہیں تھا اس کے

مقابلے میں دیوبند کے حلقے میں ایک عالم تھے قاری طیب صاحب ان کا حال یہ تھا کہ اگر ان کو پڑھانے سے بٹھا دیا جائے کہ اسٹوڈنٹ بیٹھے ہیں کوئی آیت پڑھا دیجیے تو بھی وہ وہی کرتے ہیں اور اگر کہا جائے کہ یہ بہت سے لوگ سننا چاہتے ہیں آپ تقریر کر دیجیے تو بھی وہ کہتے اور کرتے تھے۔ ان کا انداز مجھے زیادہ پسند آیا۔ بجائے اس کے کہ مقرر اپنی علمیت، اپنی نقطہ آفرینی کا رعب بھمائے۔ اس کے پیش نظر یہ ہو کہ میں جو کہنا چاہتا ہوں سادہ الفاظ میں سننے والے سمجھ لیں۔ تو یہ جو دوسری بات ہے یہ پسند ہے مجھے۔ مقرر یہ نہ سوچے کہ میں نے کتنا پڑھا ہے یا کتنا رعب ڈالوں لوگوں پر اور اپنی علمیت کا کتنا اظہار کروں۔ اس کے بجائے پبلک کے سادہ انداز میں رہتے ہوئے ان کے دل میں اتر جائے تو وہ تقریر زیادہ اچھی معلوم ہوتی ہے، اس کا اثر بھی ہوتا ہے۔ اسی لیے مجھے یہ انداز اچھا لگا اور اسے میں نے اپنایا۔ میں گفتگو کے انداز میں بات کرتا ہوں۔
س: شاید ایسے لیے لوگ آپ کو بعد میں بہت ڈنوں تک یاد

نکلی جلتے کتھی، جب ایک باوردی صاحب لپک کے آئے اور بغیر اجازت لیے، بنا کوئی لفظ کہہ کر دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ یقیناً کسٹم انسپٹر کی یونیفارم میں ہونے کو انھوں نے اس بات کا حق اور لائسنس سمجھ لیا تھا۔
خوبصورتی سے بنے کراچی ایئر پورٹ پر ہونے والا یہ بد صورت واقعہ اس نوعیت کا پہلا ہوتا تو ضرور ٹیکسی ڈرائیور کو بھی حیرت ہوتی۔ اس نے ذرا سامھی چونکے بنا خاموشی سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ البتہ دو در دیس سے آنے والا مسافر حیران اور پریشان تھا کہ بظاہر یہ پڑھا لکھا آدمی ہے مگر اس نے مروتا بھی اجازت نہیں لی۔ دیکھا اور سوچا بھی نہیں کہ ٹیکسی پہلے سے لی جا چکی ہے، اس میں ایک مسافر بیٹھا ہے۔ یہ اخلاقی، تہذیبی اور کاروباری کسی طور پر مناسب حرکت نہ تھی۔

یہ واقعہ ۲۰ سال پہلے رونما ہوا تھا۔ مسافر کو آج تک یاد ہے، وہ اس کا آغاز اور اختتام دونوں نہیں بھلا پایا۔ ٹیکسی ایئر پورٹ سے باہر نکلی اور کسٹم انسپٹر نے مزے دیکھا تو ایک تختی اور دبیلے پتلے خاموش طبع مسافر کو کچھلی سیٹ پر اپنے مختصر سے وجود اور سامان کے ساتھ برامتاں پایا۔



”آپ پاکستانی تو نہیں لگتے۔“ وہ گویا ہوا۔

”جی میں ہندوستان سے آیا ہوں۔“

انسپٹر صاحب نے برا ترس کھا کر دیکھا

اور ہندوستان کے سیاسی اور سماجی حالات پر ایک مبلغ تبصرہ فرمایا۔ اس پر تلی نہیں ہوئی تو کہنے لگے۔

”کبھی اسلام کا مطالعہ ضرور کیجیے۔ آپ کے ہندوستان کے ہی ایک صاحب ہیں، جنھوں نے بڑا کام کیا ہے، بڑی کتابیں لکھی ہیں۔ بس ان کی کوئی ایک کتاب پڑھ لیجیے۔ کہیں سے حاصل کر لیجیے۔ آپ کو اسلام کے مزاج اور آداب کی سمجھ آ جائے گی، خود مجھے کئی سال پہلے ہندوستان سے آنے والے ایک مسافر کے سامان سے یہ کتاب ملی تھی۔ ”آداب زندگی“ نام تھا اس کتاب کا۔ کوئی مولانا یوسف اصلاحی اس کے مصنف تھے۔ کیا آدمی ہیں۔ بہت نفاست اور سادگی سے لکھتے ہیں۔ ایسا نقشہ کھینچتے ہیں کہ انسان ان کا مذہب ہی اختیار کر لے، ویسے آپ پڑھنا لکھنا تو جانتے ہیں ناں، کہنا سے پڑھا۔“

”جی میں نے مدرسہ اصلاح سے پڑھا ہے، یہ بریلی میں ہے۔ اس میں پڑھنے والے اصلاحی کہلاتے ہیں۔“ مسافر نے بڑی نیاز مندی سے جواب دیا ”اچھا اچھا۔ موقع ملے تو ضرور پڑھیے گا، وہ کتاب؟ پھر وہ جو کئے۔“

”آپ نے مدرسے کا نام کیا بتایا؟ ذرا اپنا نام بتائیں گے؟“ مسافر نے دھیمے سے لہجے میں کہا:

”جی میرا نام محمد یوسف ہے۔ مدرسے کی وجہ سے اصلاحی کہلاتا ہوں۔“

”آداب زندگی“ والے آپ ہی تو نہیں؟“

کسٹم انسپٹر نے فوراً ٹیکسی روکائی خدا جانے حیرت زیادہ تھی یا شرمندگی، اس وقت وہ شہید ملت روڈ پر ایک چوڑی سے گزر رہے تھے۔ اس نے لمحہ بھر کو سوچا، جیب سے دوسو روپے نکال کر ٹیکسی ڈرائیور کو تھماتے ہوئے بولا
”صاحب جہاں جانا چاہ رہے ہیں، انھیں چھوڑ آؤ۔ اور یہ لو کر ایہ۔“ ٹیکسی ڈرائیور بھی حیران پریشان، سوالیہ نشان بنا انھیں دیکھ ہی رہا تھا کہ کسٹم انسپٹر صاحب مسافر کو مسکراتا چھوڑ کر ٹیکسی سے اترے اور بھیڑ میں گم ہو گئے۔

وہی محمد یوسف اصلاحی میرے سامنے تھے۔ تعارف کا مرحلہ طے ہوا تو میں نے انھیں بتایا کہ بچپن سے انھیں پڑھتے آ رہے ہیں۔ قرآنی تعلیمات، راہ حق کے دو مسافر، آسان فقہ اول دوم سے لے کر شعور حیات اور آداب زندگی سبھی سبقاً سبقاً پڑھیں۔ پروفیسر ایوب منیر نے لقمہ دیا۔ ”اصلاحی صاحب! انھوں نے بھی نئی نسل کے لیے ۱۹۶۱ء کے علاوہ آج کی زبان اور بیان میں آداب زندگی کے لکھی ہے۔ یہ یہاں بڑی ہی مقبول کتاب ہے۔ ۱۵۰۰ سے زائد سکولوں میں ان کی کتاب پڑھائی جاتی ہے۔“ یہ سن کر انھوں نے بڑی محبت سے کہا: ”بہت مبارک کام ہے۔ مجھے ضرور سمجھو ایسے گا۔ ہم آپ کو اپنا ڈکڑی بھجوائیں گے یہ بڑی باقاعدگی سے ہر ماہ شائع ہوتا ہے۔“ ۲۰۰۶ء میں ان سے پہلی ملاقات تھی۔ چھ سال بعد ۲۰۱۲ء میں ان سے دوبارہ ملاقات ہوئی اب کے یہ موقع محمد عبدالشکور صاحب نے فراہم کیا۔ اپنی بیٹی عائشہ کی شادی کے لیے مولانا کو خصوصی طور پر انڈیا سے بلایا۔ لوگ وہاں سے فلمی ستارے منگواتے ہیں اور اپنی تقریرات کو ان کے وجود سے چکاتے ہیں۔ عبدالشکور صاحب نے وہاں سے ایک عالم بے بدل کو بلوایا اور بیٹی کا نکاح پڑھوایا۔ کھاریاں سے ۱۷ کلو میٹر دور وڈم ہاؤس چین کے وسیع، خوب صورت لان میں ملک بھر سے آئے چنیدہ مہمان اس یادگار تقریب کے گواہ بنے۔ تقریب کا آغاز اس قدر منفرد تھا کہ سب حیران رہ گئے۔ دوپہا کی تلاوت قرآن نے ایک ساں باندھ دیا۔ تلاوت کے بعد مولانا محمد یوسف اصلاحی کو اسٹیج پر بلایا گیا۔ انھوں نے خطبہ مسنون پڑھا پھر اس میں شامل مختلف سورتوں سے لی گئی آیات کا ترجمہ اور تشریح کی۔ یہ آیات آنحضرت ﷺ نے خود منتخب کی تھیں۔ صرف خوشی کی نہیں، اللہ کی کبریائی کی یاد دہانی کے ساتھ ساتھ موت کے بعد کی زندگی کا بھی تذکرہ تھا۔ ان کی مختصر گفتگو نے تقریب نکاح کا رنگ ہی بدل دیا۔ انھوں نے اعلان کیا ”عزیزم قاسم اور عزیز بی عائشہ، اس لمحے کے بعد اس معاشرے میں میاں اور بیوی کے طور پر بیچنے جائیں گے اور وہ تعلق ان کے لیے اللہ نے حلال کر دیا جو نکاح سے پہلے حرام تھا۔“ تقریب ختم ہوئی تو تمام مہمانوں کو میزبان اور ان کی اہلیہ نگہت شکور کی طرف سے ایک ایک کتاب کا تحفہ دیا گیا۔ کتاب کے اندر ایک منفرد خوبصورت خط تھا۔ اپنی بیٹی کی خوشی میں آنے پر شکر یہ کے ساتھ مولانا یوسف اصلاحی کی کتاب کا تحفہ تھا، جو انھیں اس تقریب میں آنے کی یاد دلاتا رہے گا۔

رکھتے ہیں۔ امریکہ اور آسٹریلیا میں جہاں جہاں آپ کی گفتگوئیں رہیں وہاں کے لوگ آپ کو محبت سے یاد کرتے ہیں۔
ج: یہ پذیرائی تو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے۔

س: مولانا آپ کو کیا لگتا ہے، اتنے برس دعوت کے میدان میں گزارنے کے بعد لوگوں میں دین کے حوالے سے سننے میں آمادگی بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے۔
ج: ہمارا اندازہ تو یہ ہے کہ عالمی سطح پر پورے عالم میں اس وقت اگر کوئی دین زیر بحث ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ باقی کسی دین پر کوئی گفتگو نہیں۔ آمادگی تو خوب بڑھی ہے۔

س: یہ کس بنیاد پر ہے؟

ج: یہ جو کچھ میں سن رہا ہوں مشاہدہ کر رہا ہوں، مختلف لوگوں کے جو سوالات ہوتے ہیں اور مجھ سے کرتے ہیں۔ میرا اندازہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کو لوگ سمجھنا چاہتے ہیں۔ آپ یہ دیکھیں کہ کسی ملت کے نوجوان اپنے اپنے دین کے بارے میں بالکل فکر مند نہیں ہیں سوائے مسلمانوں کے۔ مسلم امہ ایک ایسی امت ہے کہ اس کے نوجوان تو اپنے دین کے لیے فکر مند ہیں۔ سوچ بچار کرتے ہیں، غور و فکر کرتے ہیں، اجتماعات کرتے ہیں۔ ورنہ آپ امریکا جانیے تو عیسائیت پر کون آپ سے گفتگو کرے گا سوال کرے گا! کوئی نہیں۔ اسلام کے بارے میں بھی انھیں کچھ نہیں معلوم۔ ہمارے نوجوان بے عمل ہونے کے باوجود جان چھڑکتے ہیں جان قربان کرنا چاہتے ہیں محمد ﷺ پر۔ پوری دنیا میں اس وقت کسی کے پاس اپنے دین کی وضاحت کے لیے اتنا عظیم لٹریچر نہیں ہے جتنا مسلمانوں کے پاس ہے، قرآن کی ایک ایک تفسیر ۲۰،۲۰۰ جلدوں میں دستیاب ہے، ۵۰،۵۰ جلدوں میں لکھی گئی ہیں۔ ہزاروں تفسیریں ہر ایک زبان میں لکھی گئی ہیں، کسی زبان کو لوگوں نے محروم نہیں رکھا۔ آپ ہندوؤں کی گیتا کو دیکھیں۔ ہندی میں ہے بس وہی پیش کریں گے پھر ایک اور پبلو یہ ہے کہ

مسلمانوں کے پاس اپنے رسول ﷺ سے تعلق اور ان کی سیرت کی حفاظت کی اتنی کوشش، اتنی کاوش اور اتنی لگن ہے کہ ایک ایک لمحے کی رسول ﷺ کی بات موجود ہے۔ اسے پڑھتے پڑھاتے ہیں لوگ، محفلوں میں ذکر کرتے ہیں۔ جلوت کا موقع ہو جلوت کا موقع ہو، ایک ایک بات آئینے کی طرح روشن ہے۔ ایک اور بات ہے ہمارے پاس جو کسی اور امت کے پاس نہیں ہے وہ یہ ہے کہ نبی ﷺ ہمارے لیے آخری اتھارٹی ہیں۔ ہر امت محروم ہے اس سے ان کے پاس کوئی آخری اتھارٹی نہیں ہے۔

س: ہمارے پاس کیسی بھی دلیل ہو اور اگر یہ دلیل سامنے آجائے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے یہ فرمایا ہے تو قصہ ختم۔ دل بھی مطمئن، دماغ بھی مطمئن اب کسی دلیل کا کوئی ذکر نہیں۔
ج: اس کے بعد کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا..... بس قصہ ختم اللہ کے رسول ﷺ نے یہ کیا دل بھی متاثر، آنکھیں بھی متاثر، وجود بھی متاثر، رونگٹے بھی متاثر، یہ تعین کسی امت کو حاصل نہیں ہیں۔ آج پوری دنیا میں نوجوانوں کی جو بات کی ہے میں نے تو اللہ کا کوئی منصوبہ ہے۔ اس دین کو غالب کرنے کا ورنہ یہ دیکھیے کہ انگلینڈ، فرانس، امریکا کتنے مسلمان گئے۔ ان میں سے کوئی ایک مسلمان بھی دین کی دعوت کے لیے نہیں گیا۔ ۵۰ سے ضرب دینے گئے یا ۱۰۰ سے ضرب دینے گئے۔ مقصد تو یہی تھا۔ اس کے علاوہ تو کوئی اور وجہ نہیں تھی۔ لیکن وہاں جانے کے بعد انھیں ڈر ہوا کہ ہمارے بچے اسلام سے دور نہ ہو جائیں۔ عیسائی نہ ہو جائیں۔ دین سے بے بہرہ نہ ہو جائیں۔ اس خوف نے انھیں آمادہ کیا کہ خود مسجد کی طرف کچھ رغبت کریں، مسجد جانے لگے اور پھر ڈے سنڈے سکول کھولے۔ سنڈے، سچر ڈے سکولوں میں جو کتابیں کام آئیں ان میں سے دو ہماری بھی ہیں۔ آداب زندگی اور احکام فقہ یعنی آسان فقہ۔ یہ کورس میں شامل ہوئیں۔ ایک سے انھوں

نے زندگی کے آداب سیکھے اور دوسری سے مسائل۔

س: مسائل سیکھنے سے یاد آیا، ہماری تاریخ میں مسائل و معاملات کی راہنمائی میں عورتیں کہاں ہیں؟

ج: ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، عرب ان ملکوں میں عورتوں پر بڑی قید خاندان اور پابندیاں تھیں۔ یہ کہاں خواتین کو موقع دیتے کہ آپ دین سیکھیں، اسلام سیکھیں چنانچہ ہماری پوری تاریخ خالی ہے اس سے۔ یہ ۱۴ سو سال کی تاریخ سامنے ہے ہمارے، اس میں کوئی یونیورسٹی ہم نے خواتین کے لیے قائم نہیں کی۔ صرف مردوں کو دین سکھایا، عالم، فاضل، محدث، مفتی بنایا۔ محدثات، مفتیات، کوئی ذہن نہیں گیا ادھر، یہ الگ بات ہے کہ کسی عورت نے بھائی سے پڑھ لیا۔ بھائی نے ماموں سے پڑھ لیا کسی نے بچپا سے یا والد سے پڑھ لیا۔ کچھ ہو گیا تھوڑا بہت مگر باقاعدہ عالمہ، محدثہ، مفتیہ ہم نے بنانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ سنڈے سچر ڈے سکول جو مغرب میں چلے ان کا سارا کریڈٹ خواتین کو جاتا ہے۔ انھوں نے ان کا بندوبست کیا۔ بچوں کو لے گئیں، لے آئیں، گاڑی چلانا سیکھی۔ معلمات نہیں، پرنسپل نہیں پڑھایا لکھایا زیادہ تر حصہ اس میں خواتین کا ہے۔ دوسری طرف وہ بچے جنھوں نے سنڈے سچر ڈے سکول میں اسلام سیکھا یہ جب وہاں کے سکولوں میں گئے ان کے ذہن پر جو کچھ نقش تھا کہ انھوں نے اس کو باقی رکھا باوجود مغربی تعلیم کے پڑھنے کے۔ چنانچہ باپ ۷۰ سال کا ہے چہرہ صاف ہے۔ بیٹا ۲۲ سال کا ہے چہرے پر داغی ہے۔ لڑکی سکارف ڈال رہی ہے ماں شگے سر ہے۔ یہ جو تبدیلی آئی یہ اللہ کی طرف سے کوئی منصوبہ ہے اور اللہ نے کہا میرے کمزور بندو تم کچھ کر نہیں سکتے میں تمھارے لیے یہ مہیا کرتا ہوں تم صرف پڑو اور بھرو اس میں منصوبہ میرا ہے۔ چنانچہ سکارف کی جنگ لڑی بیچوں نے، آمنہ اور عائشہ

نے۔ لاہور کی تھی نا وہ، لندن میں انھوں نے جنگ لڑی جیت گئیں۔ فرانس میں یہی مقدمہ ہوا اور جیت گئیں۔

س: مصر میں کیا ہوا تھا؟

ج: مصر میں مقدمہ ہوا مصر کے مفتی نے فتویٰ دیا کہ کوئی ضروری نہیں چادر اور چار دیواری کی۔ لڑکیوں نے جلوس نکالا تھا اور کہا تھا مفتی صاحب آپ اپنی گھر کی بیٹیوں کو یہ فتویٰ دیں ہم اسلام کی بیٹیاں ہیں آپ سے فتویٰ نہیں لیں گی ہم۔

س: آپ نے بھی ۱۹۷۲ء میں خواتین کے لیے درس گاہ کا اہتمام کیا یہ اتفاقاً غلطی سے ہوا یا جو ۱۴۰۰ سال کا گپ تھا اس کو محسوس کر کے ہوا؟

ج: میرا خیال ہے کہ یہ مغرب کی وجہ سے ہوا ہے۔ ذہن ہمارا مغرب نے بنایا کہ خواتین کو آزادی حاصل ہو۔ اس آزادی میں ہمارا ذہن لگ گیا کہ ٹھیک ہے یہ بھی آدھی امت ہے اس کو بھی آزادی ملنی چاہیے۔ اس سے ہمیں یہ فائدہ ہوا کہ ہم نے ان کی الگ شخصیت کو تسلیم کیا اور پھر اللہ نے ہمیں ہدایت دی کہ کیوں نہ انھیں دین سکھایا جائے اور وہ بھی عالمہ فاضلہ بنیں۔

س: امریکا میں آپ کی سرپرستی میں ”وائی اسلام“ کا سلسلہ بڑا کامیاب ہوا ہے۔ اس کی کیا تفصیل ہے؟

ج: تعلیم جدید ہو یا قدیم دونوں میں لڑکیاں نوجوان لڑکوں سے آگے بڑھ گئیں۔ اس وقت امریکا میں جو پروجیکٹ چل رہا ہے کہ صرف اسلام ہی کیوں؟ (Why Islam)، ان لوگوں نے سڑکوں پر بڑے بڑے بورڈ لگائے ہوئے ہیں نیچے فون نمبر دیے ہوئے ہیں کہ ان پر کال کیجیے۔ لوگ کال کرتے ہیں اور اسلام کے بارے میں معلومات لیتے ہیں۔ اس میں جو لوگ مسلمان ہوتے ہیں۔ ان کی نسبت یہ ہے کہ اگر تین لڑکیاں اسلام لاتی ہیں تو ایک لڑکا اسلام لاتا

مصر میں لڑکیوں نے مفتی کے فتویٰ کے خلاف جلوس نکال دیا اور بولیں کہ ہم اسلام کی بیٹیاں ہیں آپ سے فتویٰ نہیں لیں گی

لندن اور فرانس میں سکارف کی جنگ لاہور کی بیچوں آمنہ اور عائشہ نے لڑی اور جیتی

ہے۔ بچوں اور بڑوں میں سب میں یہ نسبت ہے۔
خواتین کو جب موقع ملا تو انھوں نے ہر میدان میں کامیابی حاصل کی۔ دہلی میں جب بی اے کا ایف اے کا رزلٹ آتا ہے۔ ۱۰/۱۰ لوگوں نے اگر ٹاپ کیا ہے تو وہ اس میں لڑے کے ہیں باقی اٹھ لڑکیاں۔ لڑکیوں نے درس قرآن سیکھنے کے بعد درس قرآن کے حلقے قائم کیے۔
س: آپ کو کب خیال آیا خواتین کا اور آپ نے کب شروع کیا؟

ج: ۱۹۷۲ء میں خیال کیسے نہ آتا۔ ہمارے لوگوں نے سوچا کہ لڑکیوں کو بھی ناظرہ قرآن پڑھا دیں کچھ مسائل سکھادیں اور انھوں نے کچھ کیا بھی۔ پھر خیال آیا کہ لڑکیاں پڑھ رہی ہیں بی بی اے کر رہی ہیں انھیں دین کیوں ناسکھایا جائے پھر یہ شروع کر دیا۔ اس میں مخالفتیں بھی بہت ہوئیں۔ لوگوں نے دہلی میں دین کے خواتین کو نہیں پڑھانا چاہیے۔ ایک عالم نے کہا کہ ان کو مبینہ میں چھ دن تو قرآن ہاتھ میں لینے کی اجازت نہیں تو اللہ ہی کی طرف سے ہے یہ کہ قرآن کو ہاتھ نہیں لگنا، سبق تو ان کا رہ جائے گا۔ میں نے جواب میں کہا کہ ۶ دن اللہ نے منع کر دیا اور ۲۳ دن آپ مار ڈالیے۔ تکمیل ہو جائے گی ان کے مارنے کی، آپ کو کیا ملے گا؟

س: رسالت مآب ﷺ کے عہد میں دین کے علم میں ایک خاتون ہی سب سے زیادہ آگے تھیں حضرت عائشہؓ۔
ج: ہماری کوششوں یا علماء کی کوششوں میں مشیت ایزدی کا دخل زیادہ تھا، ہمارا کم تھا۔ ہمارے یہاں جو خواتین کا مدرسہ ہے وہاں سے ہر سال ۱۰۰ سے زائد عالمات فارغ ہوتی ہیں اور ۸۰، ۷۰۰ فاضلات فارغ ہوتی ہیں۔ ہماری خواہش یہ ہے کہ لڑکیاں بی اے، ایم اے، پی

ایچ ڈی سے محروم رہیں۔ صرف عالمہ رہیں فاضلہ رہیں۔ یہ بہت بڑی بات ہو گی لیکن جب آپ پڑھے لکھے لوگوں میں بیٹھتے ہیں تو آپ دینی اصلاحات میں بات نہیں کر سکتے۔ انڈیا میں جکل کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی ۹۶ فیصد بچے اور بچیاں سکولوں اور کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ ۴ فیصد دینی تعلیم کی طرف ہیں اور ۴ فیصد کا ۸۰ فیصد عالم فاضل بننے میں باقی ۲۰ فیصد نماز قرآن سیکھ کے فارغ ہو جاتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری بنیاں عالمہ فاضلہ بنیں اور اسی میں بچپان ہوان کی مگر اس میں ہمیں کامیابی نہیں ہو رہی۔

س: بڑوں سے لوگ بھگت رہے ہیں کہ جو مدارس کے بچے ہیں۔ جو بچہ ایم اے کے پیپر دیتا ہے وہ واپس نہیں آتا۔ جو محنت ان پر کی ہوئی ہے وہ ضائع جاتی ہے؟ وہ ایم اے کی ڈگری کے حساب سے نوکری ڈھونڈ لیتا ہے۔

ج: کچھ غلطیاں، کوتاہیاں علماء کی تھیں کیونکہ انھوں نے دین کو بال منڈا ان تک، داڑھیاں لمبی کرنے تک اور پا جائے کو اونچا باندھنے تک محدود کر دیا تھا اسی سے ناپتے تھے اور اسی سے پچھانتے تھے۔ میں علمی گھرانے کا آدمی ہوں مجھے اس سختی سے نفرت ہوئی اور میں نے سر پر انگریزی بال رکھے جو کہ ہمارے گھر میں بہت بڑا جرم تھا۔ مجھے نفرت ہوتی تھی کہ زندگی یہ ہے اور وہ ان چیزوں سے ناپ رہے ہیں۔ نبی پاک ﷺ کی پوری مکی زندگی میں ایک لفظ بھی نہیں ملتا کہ انھوں نے کہا ہو داڑھی رکھو۔ جب مدینہ ہجرت کر کے آئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہودی مخالفت کرو۔ مونچھوں کو پست کرو اور داڑھیاں بڑھاؤ۔

میرے پاس پنجاب یونیورسٹی کی مٹی فاضل، بی اے فاضل کی ڈگریاں تھیں سب پھاڑ دیں۔ میں نے طے کیا

کہ اس میں اپنا تعارف کرانا ہے نا ملازمت کرنی ہے۔ کوئی سند نہیں میرے پاس۔ بس یہ چاہا کہ قرآن و سنت میں مہارت پیدا کروں اور میری شناخت یہی ہو۔ پھر میں نے محنت کی، مطالعہ کیا اور کچھ کتابیں بھی لکھیں۔ اللہ نے یہی پہچان بنا دی۔

س: کتنے سال کی عمر میں کتابیں لکھیں؟
ج: ۲۰ سال کی عمر سے لکھنا شروع کیا۔ آداب زندگی ۲۵ سال کی عمر میں لکھی اور اس کے بعد آسان فقہ، سب سے پہلی کتاب قرآنی تعلیمات لکھی۔ قرآن کو موضوعات کے اعتبار سے تقسیم کر کے لکھا۔ ”شعور حیات“ الذکر کی رسالہ کے ادارے ہیں۔ جو کہ میں نے چل پھر کر لکھے ہیں۔

س: مولانا آپ نے ۳۰، ۴۰ سال پہلے خواتین کی تعلیم کے حوالے سے سوچا آپ اس دور کے تقاضے اور بڑھ گئے ہیں آپ کو نہیں لگتا کہ ابھی بہت گپ ہے۔ گپ کہاں پر ہے؟
ج: میرے خیال میں جس دور میں ہمارا ذہن اصلاح، تبدیلی اور ترقی پر لگا تھا ان مسائل کی نسبت اب دنیا بہت آگے آگئی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ گہرائی سے سوچنا اور مقابلہ کرنا چاہیے۔ مگر کوئی شخصیت نظر نہیں آتی کہ کہاں سے شروع کریں۔ مثال کے طور پر کوئی بندہ آکر جمعیت کے طالب علموں کو یہ بتاتا ہے کہ مولانا مودودیؒ نے یہ کہا تھا کہ تحقیق کریں، مگر کیا تحقیق کریں، کیسے تحقیق کریں، یہ کوئی نہیں بتاتا۔ مودودیؒ صاحب کی کتاب کے بعد خرم مراد کی دو تین کتابیں تھیں۔ ورنہ کون ہے اور کس نے بات آگے بڑھائی۔ ہم نے عام مسلمانوں کو مد نظر رکھ کر آداب زندگی لکھی۔ جو ہر جگہ مقبول ہوئی۔ تبلیغی جماعت والے پہلا صفحہ پھاڑ کے آگے کی کتاب پڑھتے ہیں اور اپنے بچوں کو بھی پڑھاتے ہیں۔ اپنے بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ جو ہم نے شروع کیا تھا اس کی تکمیل کر لیں اور لحد میں اتر جائیں

بس۔ باقی تو کرنے کے اتنے کام ہیں کہ سوچتے جائیں اور کرتے جائیں۔ اللہ نے علم دیا ہے لوگ خود اپنا دیکھیں کہ وہ کیا کیا گپ پورا کر سکتے ہیں۔ اپنی توجہ اور صلاحیتوں سے ساری عمر دوسروں سے ہی کیوں تمنا اور توقع رہے کہ وہ گپ

(Gap) پورے کریں۔

س: بھارت کی آئی ایس او اور پاکستان کی اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوانوں کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ج: میں جمعیت کے جلسہ میں گیا تھا۔ مولانا مودودیؒ کے گھر پر تربیت گاہ تھی۔ انھوں نے اپنی شوراؤں اور ناظموں کو بلایا تھا۔ میرے خیال میں سو یا سو اسو کے قریب بچے تھے۔ ہندوستان میں ایس آئی او ہے یہاں پر جمعیت ہے۔ ہندوستان میں اور یہاں میں فرق یہ ہے کہ ہندوستان کی ایس آئی او میں فرض کریں سو بچے آکر بیٹھے ہیں تو پچاس کی داڑھیاں ہوں گی اور پچاس کی نہیں ہوں گی۔ یہ ایک علامتی بات کہہ رہا ہوں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ دین داڑھی میں ہے، نہ داڑھی دین میں ہے اور نہ دین میں داڑھی ہے۔ یہ بات اپنی جگہ ایک سوچ کی علامت ہے۔ یہاں میں گیا جمعیت کے جلسے میں صد فی صد چہرے پر داڑھیاں تھیں۔ جس ملت کے نوجوان اسلام کی علامت کو اس طرح پیش کریں اس ملت کا مستقبل اگر تباہ نہ ہوگا نہیں ہوگا تو کس کا ہوگا۔ اس لیے کہ کسی ملک کے نوجوان اس ملک کے مستقبل کا آئینہ ہوتے ہیں۔

س: آپ کے ہاں جماعت کی اثر پذیری بڑھی ہے یا کم ہوئی ہے بچے سالوں میں؟
ج: یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ گھٹی ہے، کیونکہ جو عہدہ داران ہیں وہ کچھ نہ کچھ تو بڑھائیں گے نا۔ اضافہ تو ہے ارکان بڑھ رہے ہیں اور کام بھی بڑھ رہا ہے۔

س: ویلفیئر پارٹی بننے سے کوئی فرق پڑے گا دعوت پہ یا مسلمانوں اور جماعت اسلامی ہند کے امتحان پر؟

ج: دونوں باتیں ہو سکتی ہیں۔ پیچھے بھی جا سکتے ہیں اور اگر اللہ کو منظور ہوا تو کامیابی بھی ہو سکتی ہے۔ کیونکہ لوگوں کو سمجھ نہیں آتی کہ کیسے لوگ ہیں سیاسی ہیں یا دینی؟ کیا پہچان ہے ان کی۔ ظاہر ہے اگر ہم سیاست میں داخل ہوں گے تو ہمارے اکثر صرح شام سیاسی کام لے جاتے ہیں اور یہاں تک لے جاتے ہیں کہ ہماری نمازیں بھی رہ جاتی ہیں اور پھر لوگ کہتے ہیں کہ چھوڑو یا یہ تو سیاسی لوگ ہیں

Why Islam? امریکا کی سڑکوں میں لگے بڑے بڑے بورڈوں پر
۳۳



اعلیٰ تعلیم کے نامور تعلیمی اداروں کے ذہین طلبہ کے ساتھ تبادلہ خیال کے لیے

اردو فورم کا افتتاحی اجلاس اعزاز یونیورسٹی آف گجرات نے پایا

وائس چانسلر ڈاکٹر نظام الدین نے آزاد سوچ اور اظہار کو سراہا
اردو زبان سے محبت، وطن اور زبان سے ایک درجہ اور بلند ہے

رپورٹ: حنا انور

کچھ نہ کچھ مطالعہ تو کرتے ہیں۔
اس لیے کچھ کتابوں کا بتائیں جن کا نوجوان مطالعہ کریں؟
ج: میرا خیال یہ ہے کہ نوجوانوں کو براہ راست قرآن
سے جوڑنے کی کوشش کریں کیونکہ اصل کتاب تو وہی ہے۔
انقلابی کتاب تو صرف قرآن ہے۔ اس کو پڑھتے وقت یہ
تاثیر نہیں ہوتا کہ میں فلاں سے متاثر ہو رہا ہوں۔ بلکہ یہ
تاثیر ہوتا ہے کہ میں اللہ سے بڑا ہوں اور یہ اتنی بڑی
عظمت ہے کہ اس کے بعد کسی عظمت کا تصور نہیں ہوتا۔
ڈرائیور دوبار دروازہ کھول کر دارالحدوبہ (مہمان
خانے) کا دروازہ دیکھ چکا تھا جہاں مولانا بستر پر نیم دراز
تھے اور ہم کرسیوں پر بیٹھے پوری توجہ سے انھیں دیکھ اور سن
رہے تھے۔ لاہور آنے کے بعد طویل دوروں اور پچھڑ کی
وجہ سے وہ دو تین روز سے بخار کا شکار تھے۔ اس کے
باوجود چہرے اور ہنسنے پر کسی اضمحلال کے آثار نہیں تھے۔

میں نے اجازت لینے کے لیے اٹھتے ہوئے پوچھا
”مولانا موسم کا اثر ہے یا تھکاوٹ کا؟“ شرارت کو سمجھتے
ہوئے بولے، ”میں اختر عباس! ہماری طرح ۸۰ء کے سن کو
پہنچو گے تو پھر دیکھیں گے کتنا سفر کرتے ہو، کتنا گھومتے ہو؟
اس بات کا جواب دینے کے لیے کسی راکٹ سائنس
کی ضرورت نہیں تھی۔ اللہ اور اس کے دین کی محبت کے
جس چشمے سے انھوں نے پانی پیا ہے۔ وہی فی الواقع
آخری سانس تک ٹھکنے نہیں دیتا۔ چھوٹی موٹی بیماری کہاں
راہ کھونا کرنے کی ہمت اور طاقت دکھا پاتی ہے۔

سالوں پہلے سنا تھا اب دیکھ بھی لیا کہ جب کسی سے مل
کر رعب یاد آئے تو سمجھو کسی بھلے آدمی سے ملاقات ہوئی تھی۔
منشورات کے مدارالمہام پروفیسر مسلم سیاح صاحب جو ممتاز
دانشور اور صاحب فکر خرم مراد کے بھائی ہیں، بھی اس دوران
تشریف لے آئے تھے۔ عمران ظہور غازی، جنھوں نے اتھرو پو
کے لیے وقت اور جگہ کی فراہمی اور دستیابی کے لیے پوری ذمہ
داری نبھائی تھی ابھی کمرے میں ہی تھے، جب ہم نے مولانا
سے اجازت چاہی اور ان کے کمرے سے باہر آ گئے۔ منصوبہ
کی اس ہستی میں دن کے ۱۰ بجے بھی سکون کی حکمرانی تھی۔ ■

ایسے ہی مذہبی لبادہ اوڑھے ہوئے ہیں۔ ہم اپنی شناخت کو
قائم رکھنا چاہتے ہیں اور دینی انقلاب لانا چاہتے ہیں۔
س: ذاکر ٹانیک کی نہ تو کوئی جماعت ہے اور نہ کچھ
پھران کو پذیرائی کیوں ملی؟

ج: خوش گمانی تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انھیں ایک
اس راہ پر لگایا اور یہ کام بھجایا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ
انھوں نے موجودہ دور کی تعلیم اور ضرورت کے مطابق تعلیم
دینے کی کوشش کی۔ ہمارے پرانے علماء، سائنس اور
ٹیکنالوجی کی زبان میں تعلیم نہیں دے سکتے تھے۔ اس لیے
انھیں اس چیز کی ضرورت محسوس ہوئی ہم جب گفتگو کرتے
ہیں تو سو سال پرانی اصطلاحوں اور طریقوں سے کرتے ہیں
تو ظاہر ہے وہ آج کے نوجوانوں کی سمجھ میں نہیں آتی۔

س: آپ کو کیا لگتا ہے اگلے دس سال میں کیا کیا
تبدیلیاں ہوں گی دونوں ملکوں میں؟
ج: علمی و فکری میدان میں مجھے تو کوئی خاص تبدیلی
نظر نہیں آتی۔ بہر حال کچھ فرق تو ضرور آئے گا۔ کچھ
زبانیں، نئے طریقے اور نئی چیزیں تو ضرور آئیں گی
جماعت میں لیکن کوئی مضبوط یا ٹھوس قسم کی تبدیلی مجھے نظر
نہیں آتی۔ دونوں ملکوں کے قرب اور دوری کی یہاں کے
لوگوں کو زیادہ فکر نہیں ہے۔ ہمارے ہاں ہجرات میں کچھ
سنجیدگی ہے لیکن سوچنے کے باوجود ان کا جو بغض ہے
اسلام اور مسلمانوں کے خلاف وہ کم نہیں ہوتا۔ آپ تو
بھول جائیں گے سب کچھ مگر وہ بے ایمان بھی ہیں اور
بغض رکھنے والے بھی۔ ہاں اگر بڑے میاں جو اس وقت
کے بڑے میاں ہیں وہ اگر کوئی مفاد بھادیں تو شاید بدل
جائیں کہ آپ کا بڑا مفاد اس میں ہے یا ایسے کر لویا مجبور
کریں تو حالات بھی بدل جائیں گے اور آتا جانا بھی
شروع ہو جائے گا۔

س: آپ کو مطالعہ تو بہت زیادہ کرنا پڑتا ہوگا؟
ج: نہیں زیادہ مطالعہ تو نہیں کرتا کیونکہ سفر میں رہنا
ہوتا ہے۔ اتنا نام نہیں مل پاتا۔ لیکن اس کے باوجود بغیر
مطالعہ اور مشاہدہ کے اس دور میں زندہ رہنا تو مشکل ہے

”اُردو فورم“ کے نام سے نو جوانوں کے لیے ایک نئے پلیٹ فارم کی بنیاد رکھی گئی ہے تاکہ آج کے مسائل و احوال پر نو جوانوں سے براہ راست تبادلہ خیال ہو سکے۔ طلبہ و طالبات میں معیاری ادب لکھنے اور پڑھنے کا نہ صرف جذبہ پیدا کیا جاسکے بلکہ ایسے مواقع فراہم کیے جائیں جن کے تحت ان کی سوچ کو بھی پذیرائی دی جاسکے۔ اس سلسلے میں اُردو ڈائجسٹ کی ٹیم نے نہ صرف پاکستان کی معروف جامعات کے شعبہ ہائے صحافت اور شعبہ اُردو کو شامل مشورہ کیا ہے بلکہ لاہور سے دور دیگر شہروں ملتان، بہاولپور، سرگودھا، فیصل آباد اور گجرات کی یونیورسٹیوں کو بھی اُردو فورم میں بھرپور شمولیت کا موقع دینے کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔ اس سلسلے میں اُردو فورم کے افتتاحی پروگرام کے لیے گجرات یونیورسٹی کو چنا گیا۔

☆ گجرات یونیورسٹی کے بارے میں سنا تو بہت تھا لیکن دیکھنے کا اتفاق اب ہوا۔ لاہور سے تین گھنٹے کا سفر طے کر کے جب گجرات یونیورسٹی پہنچے تو گیسٹ سے داخل ہوتے ہوئے منفرد طرز کی خوبصورت عمارت کو دیکھ کر آنکھیں اور دل دونوں مسرور ہوئے۔ ایڈیٹر صاحب کو اس یونیورسٹی کا جدید، منفرد اور سرکاری یونیورسٹیوں کے روایتی طرز تعمیر سے بالکل مختلف طرز تعمیر بہ حد بھایا۔ جس کا ذکر انھوں نے اپنی گفتگو میں بطور خاص کیا۔

☆ سنٹر آف میڈیا اسٹڈیز کے چیئر مین ڈاکٹر زاہد یوسف اور دیگر اساتذہ نے اُردو ڈائجسٹ کی تین رکنی ٹیم کا پُر تپاک استقبال کیا اور میڈیا ہال تک لے گئے۔

☆ اُردو فورم کی تقریب کا باقاعدہ آغاز تلاوت کلام اور نعت رسول ﷺ کے ساتھ ہوا، بعد ازاں شرکائے محفل سے مہمانوں کا تعارف ہوا۔ پروگرام کے پہلے حصے کی میزبانی عمیر ندیم نے کی۔ شرکاء بہت ترتیب اور قاعدے سے بیٹھے تھے۔ اظہار خیال کرنے والے طلبہ و طالبات کی نشستیں الگ سے تھیں۔

☆ بڑے شہروں کے بڑے بڑے اداروں میں پڑھنے والے طلبہ و طالبات ذہن نہ بھی ہوں لیکن با اعتماد ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن ایک چھوٹے شہر میں پڑھنے والے طالب علم بھی اتنے با اعتماد ذہن اور Out Spoken ہوں گے، ایسا سوچا نہ تھا۔ گجرات یونیورسٹی کے اُردو فورم میں حصہ لینے والے طالب علموں کی عمدہ شرکت نے ہمارے دل جیت لیے۔

☆ اُردو فورم کی پہلی نشست کی صدارت وائس چانسلر ڈاکٹر نظام الدین صاحب نے فرمائی۔ انھوں نے کہا کہ اُردو ڈائجسٹ کا اُردو صحافت میں بہت بڑا نام ہے اور اُردو

ڈائجسٹ نے ہمیشہ سیاسی و سماجی مسائل پر ایک غیر جانبدار تجزیہ دیا ہے۔

☆ انھوں نے کہا کہ یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کو چاہیے کہ وہ اُردو ڈائجسٹ کے گزشتہ مضامین کی فہرست کو لے کر اس کے مختلف تاریخی موضوعات پر ریسرچ کریں۔

☆ تحقیق کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انھوں نے کہا کہ باہر کی یونیورسٹیاں اسی لیے کامیاب ہیں کہ وہاں ریسرچ کا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ انھوں نے اُردو فورم کے پہلے پروگرام کے لیے یونیورسٹی آف گجرات کے انتخاب کو سراہا، جہاں اس وقت ۱۸ ہزار طلبہ و طالبات مختلف شعبوں میں زیر تعلیم ہیں۔ اس فورم نے مختلف اور آزاد طریقے سے سوچنے اور خیالات کے اظہار کا موقع دیا۔

☆ سوشل سائنسز کے ڈین ڈاکٹر فارش اللہ یوسرٹی نے کہا، اُردو ڈائجسٹ نے ہر نسل کی اخلاقی رہنمائی کی ہے۔ میرے طالب علمی کے زمانے میں طالب علموں کی شخصیت کو دیکھ کر اندازہ لگایا جاتا تھا کہ وہ کس قسم کے رسالے یا کتابیں پڑھتے ہیں۔ جس کی شخصیت متاثر کن ہوتی اسے اُردو ڈائجسٹ کا قاری سمجھا جاتا تھا۔

☆ مہمان خصوصی اُردو ڈائجسٹ کے مدیر اختر عباس تھے۔ انھوں نے کہا جس کی سوچ بڑی ہوگی وہ ہی بلندی کی طرف جائے گا جو پانی کی سطح پر تیرتا رہے گا، وہ کبھی گویہ مقصود تک نہیں پہنچ سکتا۔

☆ انھوں نے کہا اُردو ڈائجسٹ گزشتہ ۵۲ سال سے علم و دانش کے گہر تلاش کر کے اپنے قارئین تک پہنچا رہا ہے۔ اُردو فورم بھی اس سلسلے کی ایک نئی کڑی ہے۔

☆ اُردو سے محبت اور تعلق اصل میں ملک سے محبت اور تعلق سے ایک درجہ اور آگے ہے کہ ہمارا تو سارا دینی

سرمایہ بھی اسی زبان میں ہم تک پہنچا ہے۔ زبانیں، تہذیب و تمدن، علم و آگہی اور فہم و فراست کی امین ہوتی ہیں۔ اُردو کی نفاست، وسعت قلبی اور ہر زبان کے لفظوں کی خوش دلی سے میزبانی کی صفت نے تو اسے اور بھی محبوب صفت بنا دیا ہے۔

☆ پہلے سیشن کے اختتام پر اوپن سیشن کا آغاز ہوا۔ اس میں طلبہ و طالبات نے اُردو ڈائجسٹ کے مدیر سے خوب سوال و جواب کیے۔ بار بار قہقہے بھی گونجتے رہے۔ سوال ابھی جاری تھے کہ ۳ بجے شام بسیں چلنے کا وقت ہو گیا۔ طلبہ و طالبات جانے پر آمادہ نہ تھے۔ اس لیے سکون سے بیٹھے سوال کرتے اور جواب لیتے رہے۔ یاد رہے یونیورسٹی شہر سے کئی کلومیٹر باہر واقع ہے۔ جب ہال بند کرنے والے صاحب کی بس نے ہارن دینے شروع کر دیئے تو پروگرام کو مجبوراً سیٹنا پڑا۔ ڈھیروں طلبہ نے جلدی جلدی آؤ گراف لے لیے۔

ایک طالب علم نے پوچھا کہ اب جب انفارمیشن ٹیکنالوجی کا زمانہ ہے۔ ہم کیسے کتب بینی کی عادت ڈالیں؟ اختر عباس صاحب نے اس کا تفصیلی جواب دیا کہ دنیا بھر میں صبح جب لوگ آفس، ٹرینوں، گاڑیوں یا بسوں میں جاتے ہیں تو وہ آتے، جاتے، بیٹھے حتیٰ کہ کھڑے ہو کر بھی کتابیں پڑھتے ہوئے جارہے ہوتے ہیں اور وہاں لوگوں میں پڑھنے کا کتنا شوق ہے، اس کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ بہری پوٹری مصنفہ (J.K. Rowling) کا ابھی حال ہی میں بڑوں کے لیے پہلا ناول شائع ہوا ہے۔ رات کو لوگ لائینوں میں کھڑے تھے تاکہ صبح سب سے پہلے وہ ناول خرید سکیں۔



عفت مسعود

محمد شہباز

محمد عباس رحیل

فضل ذکی

فیصل شہزاد

استقامت منور

عائشہ اشتیاق

روانہ عزیز

محمد حسان ارشد

صاحب فکر اور مطالعہ کے شوقین نو جوانوں کے لیے بہترین کیریئر کون سا ہے؟

جوان اور اکلوتے بیٹے کی موت پر انصاف مانگتا سابق ڈی ایس پی پولیس، اورنگزیب خان۔

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کراچی میں روزانہ ایسی لکٹی ہی کہانیاں جنم لیتی ہیں اور اپنی موت آپ ہی مر جاتی ہیں۔ نیا کیا ہے اس کہانی میں؟ بس ایک عام سے قتل کی واردات ہی تو ہے؟ جسے سمجھنے کے لیے نہ تو شرک ہو مگر جیسی ہوشیاری درکار ہے نہ ہی جگسا پزل کے ٹکڑے جوڑ کر سرا تلاش کرنے کی۔

مدیحہ انور، واشنگٹن

آئیے ہم بھئی آنکھیں بند کر لیں

نیا کیا ہے اس کہانی میں.....

بس ایک عام سے قتل کی واردات ہی تو ہے
کراچی میں اس سال ۲۰۱۷ء میں تو پہلے ہی گر چکی ہیں

تو سادہ سی ہے..... بالکل عام
سی..... آپ کے اور میرے اسی
معاشرے کی..... ہمارے اپنے وطن
کی..... مملکتِ خدا داد پاکستان کی۔

کہانی کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ وہن بنی ایک لڑکی
وہن کو چھیڑتا ڈیرے کا نوکر، نوکر کی بدتمیزی پر اپنی بہن کی
حفاظت کرتا شاہ زبیب، شاہ زبیب کی 'بدتمیزی' پر اسے
موت کے گھاٹ اتارتا ڈیرے کا بیٹا۔ ٹی وی پر اپنے

کچھ کر کے دکھاتے ہیں اور کتابی علم کے ساتھ ساتھ مہارت
اور اپنا رویہ (Attitude) مثالی بناتے ہیں اور اداروں میں
جا کر ویلویو add کرتے ہیں۔

☆ انھوں نے کہا کہ نوجوانوں کو میگزین میں آنا
چاہیے، بے شک یہ بے حد مشکل کام ہوتا ہے۔ جو صاحب
فکر ہو، جو صاحب مطالعہ ہو، اس کے لیے بہترین کیریئر
ہے۔ ہاں جو اخباروں کی سرخیاں پڑھ کر میگزین میں جانا
چاہے وہ وہاں نہیں چل سکتا۔ اخباروں کے کالم اور خبریں
پڑھ لینے سے آپ مصنف اور صحافی نہیں بن سکتے۔

☆ یہ اوپن ڈسکشن میں دے گئے موضوع "نئی نسل
پریشان کیوں رہتی ہے؟" پر جن طلبہ و طالبات نے اپنی
عمدہ آراء پیش کیں ان کے نام یہ ہیں۔

سمسٹر ۷: عفت مسعود، معظّمہ فیاض، آمنہ میر،
فہد شہزاد، عمار گوندل، محمد اسامہ رسول، محمد شہباز، ظہیر احسن،
سید عابد رضا کاظمی، رومانیہ بیٹ، زین ارشد۔

سمسٹر ۵: احتشام منور، نائمہ افضل ذکی، نائلہ اشتیاق،
عمر رضا اور محمد فرحان ارشد۔ ایڈیٹر صاحب نے بطور خاص
ان کے عہدہ اظہار خیال کی تحسین کی اور ان کے اخلاقی نقطہ
نگاہ کی بھی قدر کی۔

☆ طلبہ و طالبات نے اردو ڈائجسٹ دفتر کے دورے
(Visit) کی خواہش ظاہر کی جس پر جناب ایڈیٹر نے
پُر تپاک انداز میں ان کی خواہش کی تکمیل کا وعدہ کیا۔

☆ فورم کے موقع پر اردو ڈائجسٹ کی جانب سے ٹیم
ممبر غلام سجاد نے اسٹال بھی لگایا اور تمام شرکاء کو
اردو ڈائجسٹ کے شمارے بطور تحفہ دیے۔

☆ اختر عباس صاحب نے خاص طور پر پروگرام
کے صدر وائس چانسلر صاحب کو چند عہدہ کتابیں بطور تحفہ
پیش کیں۔ جو اب وائس چانسلر صاحب نے اپنے دفتر میں بلاوا
کر باقاعدہ اہتمام سے کتابوں کا جوابی تحفہ عطا فرما کر
ثابت کیا کہ وہ علمی ادھار کے قائل نہیں۔

☆ ایک طالب علم نے پوچھا کہ اردو ڈائجسٹ میں
نوجوانوں کو کس طرح شامل کرتے ہیں؟ جس پر اختر عباس
صاحب نے کہا کہ نوجوانوں کو شامل کرنے کے لیے ان کی
دلچسپی کے مضامین، ان کے کیریئر کی بہتری کے لیے
مشورے، دنیا کے کامیاب لوگوں پر تحریریں، پاکستان کے
برنس رول ماڈلز، اسلامی تاریخ کی قابلِ فخر شخصیات، سماجی
سطح پر ہونے والی تبدیلیوں پر رہنمائی کے ساتھ ساتھ
نوجوانوں کے لیے کونز اور کتابوں کے تحائف اس سلسلے کی
کڑی ہیں۔ اس کے علاوہ نئے لکھنے والوں کے لیے بھی
رسالے کی ایک پوری کاپی مختص کی گئی ہے۔ طیب اعجاز
صاحب باہر سے نوجوانوں کی پسند کے بڑے عمدہ رسائل
لے کر آتے ہیں۔ ان سے بھی بڑی مدد ملتی ہے۔

☆ "نئی نسل پریشان کیوں رہتی ہے؟" پر بات
کرتے ہوئے پہلے پہل طلبہ و طالبات کی باتوں میں
ماپوی جھلک رہی تھی۔ انھیں لگ رہا تھا کہ پانی، گیس اور
بجلی کا فقدان ان کی کامیابی کی راہ میں بڑی رکاوٹ ہے۔
دو تین گھنٹوں کے سوال و جواب کے بعد ان میں ایک
امید کی لہر دوڑ چکی تھی کہ یہ مسائل تو

ع یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے
کے مصداق پریشان کرنے کے لیے نہیں ہیں۔

☆ اختر عباس نے کہا کہ ہر انسان میں کچھ نہ کچھ
کرنے کی صلاحیت ضرور ہوتی ہے لیکن اسے نکھارنے
(Polish کرنے) کے لیے ایک اچھے استاد یا
(Mentor) کی ضرورت بہت اہم ہے۔

☆ انھوں نے کہا کہ کچھ لوگ یونیورسٹی میں ۴ سال
لگانے کے بعد بھی غیر یقینی صورتحال میں ہوتے ہیں کہ
انھیں نوکری ملے گی یا نہیں جب کہ کچھ لوگوں میں اتنا کرنٹ
(Spark) ہوتا ہے کہ ابھی ڈگری ان کے ہاتھ میں بھی
نہیں آئی ہوتی اور بڑے بڑے ادارے انھیں بہت عزت
اور پیار سے رکھ لیتے ہیں۔ یہ تب ہوتا ہے جب آپ انھیں

شاہ زیب کے قتل کی مذمت پرفیسر بک پر ایک 'ہجج' بھی بنایا جا چکا ہے، جسے اب تک ۸۶ ہزار سے زائد لوگ 'لائیک' کر چکے ہیں اور ان کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ مبارک

اور سب سے بڑھ کر قتل کے اہم ترین مجرم شاہ رخ جتوئی کے والد نے ٹی وی پر آکر ایک بیان میں یہ نوید سنائی ہے کہ شاہ رخ اس واقعے کی رات ہی اپنی پڑھائی مکمل کرنے کی غرض سے بیرون ملک جا چکا ہے۔ بہت مبارک !!!

نہ جانے کیوں شاہ زیب کے قتل کا دل پہ ایک بوجھ سا دھرا ہے جو سر کرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ کبھی سوچتی ہوں کہ بھلا ایک جو شیلہ ۲۰ سالہ لڑکے کے وہم و گمان میں بھی ہو گا کہ اپنی دلہن بنی بہن کو میدیہ طور پر ایک ڈیرے کے بدست اور بدتمیز نوکر سے بچانے کا تاوان اسے اپنی موت کی صورت ادا کرنا پڑے گا۔۔۔۔۔ اور وہ خود بھی شہر کراچی میں روز جنم لینے والی ایسی سیکڑوں کہانیوں میں سے ایک کہانی کا کردار بن جائے گا؟

ایک ایسی کہانی جو چند دن میڈیا پر باہا کار بچانے کے بعد آہستہ آہستہ دیگر اہم خبروں میں دفن ہوتی چلی جائے گی اور رہی بات معاشرے کی..... تو معاشرے کی یادداشت میں بھلا ایسی کہانیوں کو جگہ دینے کی گنجائش ہی کہاں ہوتی ہے؟

آئیے شتر مرغ کی طرح ریت میں دھنسا اپنا سر تھوڑا اور دھنسا لیں..... شاہ زیب کے قتل پر معاشرے کی روایتی بے حسی، وڈیرہ سٹم اور ناانصافی کے ناسور پر لعنت ملامت کریں۔ ٹی وی سکرین پر ایک بوڑھے باپ کا غم زدہ چہرہ دیکھ کر چند لمحوں کو دل موس لیں اور پھر ٹی وی چینل بدلتے ہوئے بے دلی سے دعا کریں کہ خداوند کریم ہمارے ملک کا نظام غیب سے ٹھیک کر دے جس میں ہمیں کچھ نہ کرنا پڑے۔

تو پھر گرین اچ یونیورسٹی میں میڈیا سائنسز پڑھنے والے ۲۰ سالہ شاہ زیب کے جسم میں اترنے والی گولیوں کا ماتم کیوں؟ کیا شہر کراچی نے اس سے پہلے کبھی جوان لاشوں کو کندھا نہیں دیا؟

آئی۔ جی سندھ فیاض لغاری بتاتے ہیں کہ ۲۰۱۲ء میں کراچی میں ۱۷۰۲ افراد کو قتل کیا گیا۔ انسانی حقوق کمیشن پاکستان کے مطابق یہ تعداد ۲ ہزار کے لگ بھگ ہے۔ انگریز ٹی وی کی ویب سائٹ دنیا کے سب سے بڑے ۱۳ شہروں میں سے کراچی کو خطرناک ترین قرار دیتی ہے۔ دنیا ٹی وی کے مطابق گزشتہ برس کراچی میں ۵۵۳ بوری بند لاشیں برآمد ہوئیں۔ بھتہ وصولی اور بھتہ مافیہ کے اعداد و ستیاہ نہیں۔ فیکٹریوں میں 'اچانک' بھڑک اٹھنے والی بھیاں آگ کے واقعات تو اب جیسے معمول کی بات ہے۔ ایسی ہی ایک آگ میں ۳۰۰ سے زائد عورتیں اور مرد جل کر جھسم ہو گئے اور اس سے خوفناک بات یہ ہے کہ جل کر مرنے والوں کی کوئی بات بھی نہیں کرتا۔ موت کا سناٹا تو سنا تھا۔ کراچی میں یہ خوف کا عجب سناٹا ہے۔

بس انہی معمولی واقعات میں سے ایک واقعہ ہے، اس بد نصیب لڑکے کا جو اپنی بہن کے ویسے سے واپس آیا اور ٹارگٹ کلنگ کا نشانہ بن گیا۔ لیکن اس واقعے کے معمولی ہونے کے باوجود اہل پاکستان کی 'شفقی' کے بہت سے پہلو ہیں۔ چیف جسٹس صاحب اس قتل کا ازخود نوٹس نہ لیتے تو ملزم کی گرفتاری تو دور رہی، کسی نے ذکر بھی نہیں کرنا تھا۔

سنا ہے خاصی پس و پیش اور معروف سیاستدان نمیل گبول کے اثر رسوخ استعمال کرنے کے بعد درخشاں پولیس اسٹیشن، کراچی میں قتل کی ایف آئی آر درج کی تھی۔ ملک بھر اور بالخصوص کراچی کی سرکردہ سیاسی جماعتوں نے شاہ زیب کے قتل کی مذمت کی جب کہ سول سوسائٹی نے کراچی پریس کلب کے باہر مظاہر کے خلاف لپے کا ڈز اٹھا کر اور موسم بٹیاں جلا کر اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ مبارک

ربیع الاول کی دعوت

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت..... یتیم سے شفقت

کیا ہی ماہ مبارک ہے کہ کتنے ہی مہینے اور سال اس کے سامنے دست بستہ کھڑے ہیں۔ کتنے ہی زمانے اس کی چوٹ تھامے درود و سلام بھیج رہے ہیں۔

اللَّهُمَّ صَلِّ عَلَى مُحَمَّدٍ وَعَلَى آلِ مُحَمَّدٍ

نبی رحمت ﷺ کے غلط عظیم کی تفصیلات ایک بحر ہے کراں ہیں کہ جنہیں سینا محال ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے آپ کو مجسم قرآن کہا تھا۔ آپ ﷺ کے اسوہ حسنہ سے ہی دنیا انقلاب آشنا ہوئی۔ انسان نے اپنے آپ کو پہچانا انسانیت کی رفعتوں کو پایا زندگی کا قرینہ سیکھا مقصد حیات سے آگاہی حاصل کی۔

الْمُرْجَلُ لَكَ يَتِيمٌ فَافْوَيْ

کیا اس (اللہ) نے تم کو یتیم نہیں پایا اور پھر ٹھکانا فراہم کیا (سورۃ الضحیٰ - آیت ۶)

آپ ﷺ خود بھی ایک یتیم تھے اور اسی لئے جہاں آپ ﷺ اوروں کے ساتھ صلہ رحمی، عدل، پاک دامنی، صداقت و درگزر کا بیکر تھے وہاں مسکین، یتیموں اور خصوصاً یتیموں کے لئے سب سے بڑھ کر بیکر وجود دھتا تھے۔ ماورق الاول آپ ﷺ کی حیات مبارکہ کو مکمل اور بھرپور اسوہ سمجھتے ہوئے عمل کر کے دعوت دیتا ہے۔

آج کی اسلامی دنیا کا سب سے بڑا راک سٹار

سمیع یوسف

اس کے اسلامی گیت ۳ کروڑ ۲۰ لاکھ فروخت ہو چکے

ٹائم میگزین: ”اسلام کا سب سے بڑا راک اسٹار“
گارڈین: ”مشرق وسطیٰ کا سب سے بڑا سٹار ایک برطانوی۔“

انڈیپنڈنٹ: ”اسلامی موسیقی میں سب سے بڑا نام، دنیا بھر میں۔“

الجزائر: ”لاس اینجلس، پیرس اور دمشق میں سٹیڈیم بھرنے والا اور ترکی میں ٹریک جام کرنے والا۔“
یہ کون ہے، جس کی دنیا بھر میں اس قدر شہرت ہے اور میڈیا بھی اس کا دیوانہ ہے۔

یہ ہے سمیع یوسف!
جی ہاں وہی سمیع جس نے ۳۰ سال کی عمر میں موسیقی بھائی شروع کی اور ۵ سال کی عمر سے اسٹیج پر آنے لگا۔
سمیع نشید کی دنیا کا سب سے بڑا نام ہے۔

سمیع آذربائیجان نسل سے ہے، جولائی ۱۹۸۰ء ایران میں پیدا ہوا، تین سال کا تھا، جب انگلینڈ چلا گیا۔
سمیع کی پہلی البم، ’المعالم‘، ۲۰۰۳ء میں منظر عام پر آئی، جس کی ۳۰ لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں۔



ولی زاہد

’المعلم‘، حرولعت کا ایک مجموعہ تھی۔ نشید جیسے ’خالق‘ (The Creator) اور ’دعا‘ (Supplication) اللہ تعالیٰ سے منسوب ہیں۔ ’یا مصطفیٰ ﷺ‘ اور ’المعلم‘ حضور اکرم ﷺ کی سیرت کے پہلو اجاگر کرتی ہیں۔ ’المعلم‘، الہم نے موسیقی کی دنیا میں ایک نئی صنف کو جنم دیا، جسے اسلامی پاپ یا Spiritique کہا جانے لگا ہے۔ اسے صرف دنیا کے مسلمان جوانوں نے ہی پسند نہیں کیا بلکہ اس پر دنیا کی یونیورسٹیاں اور تھنک ٹینک تحقیق بھی کرنے لگے ہیں۔ لندن کی یونیورسٹی Roehampton نے سمیع کو ڈاکٹر آف لیٹریز کی اعزازی ڈگری دی جو اس سے قبل تارنخ دان مارک ٹوین، ہیری ہائسٹر کی خالق، جے کے رولنگ اور شاعر رابرٹ فراسٹ کو ملی تھی۔

سمیع کی موسیقی نہ صرف انگلینڈ اور امریکا میں مشہور ہوئی، بلکہ وہ مشرق وسطیٰ اور ترکی میں بہت مقبول ہوا۔ ترکی کے تاسم اسکوائر میں اس کو سننے کے لیے ڈھائی لاکھ لوگ آئے۔ جب ٹائم میگزین نے اس کو اسلامی دنیا کا سب سے بڑا راک اسٹار قرار دیا تو سمیع نے کہا کہ میں راک اسٹار نہیں ہوں۔ میں تو صرف اچھی موسیقی تخلیق کرنا چاہتا ہوں۔

سمیع کی دوسری البم ’My Ummah‘ جولائی ۲۰۰۵ء میں آئی۔ اس کی ۴۰ لاکھ سے زیادہ کاپیاں فروخت ہوئیں۔ اس البم کی سب سے خوبصورت حمد ’Hasbi Rabbi‘ ثابت ہوئی۔ اس میں سمیع ۴ ربائلوں میں مختلف پیشوں سے منسلک نظر آتا ہے۔ لندن میں ایک عملی مسلمان بزنس مین، تاج محل، آگرہ بھارت میں فٹ بال کھیلنے والا اور بچوں کو تعلیم دینے والا، ترکی میں وائٹن بجانے والا اور مصر میں ایک کارپینٹر۔ یہ حمد ۴ زبانوں میں گائی گئی اور سمیع کی سب سے معروف نشید ہے۔

سمیع کی تیسری البم ’Wherever you are‘ ۲۰۰۹ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کا سب سے معروف نشید ’You came to me‘ ہے۔ جو نبی ﷺ سے منسوب ہے۔ اس کی ویڈیو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ البم ۵۰

لاکھ سے زیادہ فروخت ہوئی۔

سمیع کی مقبولیت کو دیکھتے ہوئے دنیا کے بڑے بڑے اداروں نے اس سے راہ ورسم بڑھائی ہے۔ قطر کی خاتون اول نے اسے اپنا عالمی ایمبیڈر بنایا۔ سعودی عرب کے بین الاقوامی میڈیکل سنٹر نے Healing نام کی نشید کی ویڈیو بنوائی، اقوام متحدہ نے Save the children نام کے ۲۰۱۰ء کے پاکستان میں سیلاب سے متاثرین کے لیے ’Hear your call‘ کے نام سے انگریزی اور اردو میں نشید سے فنڈ جمع کیے۔ سمیع نے اسلامی اداروں اسلامک ریلیف اور مسلم ریڈیو کے لیے بھی نشید گائی ہیں۔ ’اسلام‘ کے نام سے نشید اس کی سب سے تازہ ویڈیو ہے جو دسمبر ۲۰۱۲ء میں ریلیز ہوئی۔ سلام نشید ۲ کروڑ سے زیادہ فروخت ہوئی ہے۔

سمیع یوسف اب مسلمان نوجوانوں کے لیے امید کا پیغام ہے۔ اللہ نے اس کو خوبصورت شکل، اچھے اخلاق اور اعلیٰ تعلیم سے نوازا ہے۔ سمیع عاجزی، خدمت اور نیکی کا درس دیتا ہے۔ فیس بک پر اس کے مداحوں کی تعداد ۳۰ لاکھ سے زائد ہے۔

ولی کی پسندیدہ نشید:

سمیع کی یہ نشید سننے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں:
۱۔ Hasbi Rabbi اللہ کی حمد، ۴۰ ممالک، ۴ زبانیں، سمیع کے ۴ روپ بہت معروف اور آپ بہت پسند آئے گی۔

۲۔ You cam to me۔ نبی ﷺ کی شان میں، ہر اُس لمحے میں جب مایوسی اور افسردگی تھی آپ تشریف لائے۔

۳۔ Supplication۔ دعا کہ اللہ میری نیکیاں کم اور گناہ زیادہ ہیں، پر میری آنکھوں میں آنسو ہیں مجھے معاف فرما۔

۴۔ سلام۔ ۲ کروڑ سے زیادہ فروخت ہونے والی نشید۔

۵۔ Healing۔ شاید سب سے خوبصورت ویڈیو۔



ہارمان لیتے تو کب کے میدان سے باہر ہوتے
 ہاکی میں نام کمانے والے تین بھائیوں ریحان، رضوان اور عمران کی بولولہ انگیز داستان

تحریر و تہذیب: اختر عباس

دھمکیوں، دھرنوں اور دھماکوں سے ڈری سہی قوم کو کہیں سے تازہ ہوا کا جھونکا آجائے تو کئی روز حیرت کے مارے یقین نہیں آتا، لگتا ہے اتفاق سے ہو گیا ہوگا، ضرور اتفاقی حادثہ ہوگا۔ ایسے میں قومی ہاکی ٹیم نے برسوں بعد ایک چھوڑ، دو مسلسل خوشی کی خبریں دیں تو قوم کے چہرے پر بھی مسکراہٹ آگئی۔ ریحان بٹ نے جہاں برسوں اچھی ہاکی کھیلی، ٹیم کی قیادت کی، جاتے جاتے اپنے چھوٹے بھائی عمران بٹ کو پوری ٹیم کے پشت پناہ کے طور پر ایک بہادر گول کپیر کا تحفہ بھی دیتے گئے۔ تینوں بھائیوں کا گرم جوش سے استقبال ہوا، کچھ دیر طیب اعجاز صاحب کے مہمان ہوئے۔ اس دوران ہم نے ان کے والد ثاقب بٹ صاحب سے ملاقات کر لی ان کے بعد ریحان کی باری آئی، پھر عمران اور آخر میں رضوان سے خوب باتیں ہوئیں۔ تصاویر اور گفتگو کا بھرپور سیشن بورڈ روم میں ہوا۔ آئیے پہلے ملتے ہیں ریحان بٹ سے

بعد زیادہ سب گول (۲۱۶ گول) کرنے کا ریکارڈ بنایا تھا۔ انھوں نے سوالات کے بڑے دلچسپ جوابات دیئے۔
 ہم نے انھیں یاد دلایا کہ آپ

شکل و خوش مزاج ریحان بٹ پاکستان قومی ہاکی ٹیم کے کئی سال کپتان رہے۔
 آج کل ہالینڈ کلب کے لیے کوچنگ کرتے ہیں۔ وہی ہالینڈ جہاں کے ڈریگ فلیکر بویلنڈر نے پاکستانی سہیل عباس (۳۳۸ گول) اور خالد بشیر کے

خوش

ہاکی کا اشارت

محلے سے دو چار لڑکے اکٹھے ہو جاتے اور کھیلنے چلے جاتے۔ زیادہ شوق اس بات کا ہوتا کہ گراؤنڈ میں گھاس نہیں ہے وہ کوئی اور ہی چیز ہے، وہاں جاکے کھیلنا ہے۔ ایک دن میں کھیل رہا تھا تو گورنمنٹ ماڈل ٹاؤن ہاکی اسکول کے سپورٹس ٹیچر نے کہا کہ ہمارے اسکول کی ٹیم کی طرف سے کھیلو گے۔ میں نے کہا ہاں تو پھر ماڈل ٹاؤن ہاکی اسکول میں داخلہ لے لیا اور وہاں سے میری ہاکی کا اشارت ہوا۔ اسکول میں مجھے تمام سہولتیں ملیں، فیس، معاف، اور کینٹین سے جو کچھ کھاتا، اس کا بل کاغذ ادا کرتا۔ میں اسکول میں پڑھنے کے لیے نہیں گیا تھا بلکہ کھیلنے کے لیے گیا تھا۔

عمرے کا کلکت

ماڈل ٹاؤن ہاکی اسکول کا بیچ ہوا تو ہم دونوں بھائی کھیلے۔ ۷ سال بعد یہ اسکول پہلی دفعہ ثرائی جیت گیا تو پرنسپل نے اسکول کو چھٹی دے دی۔ رضوان بیٹ کھلاڑی ڈکٹیٹر ہوا اور اسے عمرے کا کلکت ملا۔

گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ

میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے کی باری آئی تو باقی لڑکوں کے نمبر ۷۰ سو سے زیادہ تھے جب کہ ہم دونوں بھائیوں کے ۴۰ سو سے اوپر۔ ہم نے پھر سپورٹس کی بنیاد پر گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا۔ جب داخلہ ہو گیا تو میں نے فارم پر جزل سائنس کے مضامین لکھے۔ مجھے پرنسپل خالد آفتاب صاحب نے بلایا اور کہا کہ بیٹا یہ مضمون آپ سے

صلاح الدین ۱۹۹۲ء میں پاکستان کی جیتی ہوئی ٹیم کو ہرا کر لے آیا۔ ۲۰۰۰ء میں سڈنی اولمپکس میں یہ پھر ٹیم کو ہرا کر لے آیا۔ وہ ہاکی میں بھی اپنا بزنس ڈھونڈتا۔ ہم بھارت بیچ کھیلنے گئے تو یہ کوچ اور میں کپتان تھا۔ ایئر پورٹ پر ۸، ۱۰، ۱۲ بڑے بڑے کارٹن پڑے تھے۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہے تو کام کرنے والے لڑکے نے کہا کہ صلاح الدین صاحب نے یہ سامان منگوایا ہے۔ میں نے کہا جو سامان آنا تھا اس کا مجھے بھی تو پتا ہونا چاہیے۔ سچ بتاؤ، اس میں کیا ہے؟ لڑکے نے کہا کہ اس میں چاندی کے برتن ہیں۔ کراچی ایئر پورٹ پر جب ہم اترے تو سامان ہیٹ پر آیا ہی نہیں چھپے سے ہی چلا گیا تو میں نے جا کے فیڈریشن سے کہا کہ ٹیم کیا رزلٹ دے، جب ٹیم کے ساتھ ہی سرگلنگ ہو رہی ہے تو یہ بات جب صلاح الدین کو پتا چلی تو اس نے مجھے ٹیم سے ہی نکال دیا تھا۔ ہم تاریخ میں کبھی ایشیاء میں چھٹے نمبر پر نہیں آئے۔ صرف صلاح الدین کے ہوتے ہوئے آئے۔

۱۵ اردن میں ۱۵ لاکھ کا روح افزا

کراچی میں ۱۵ روزہ کیمپ تھا تو مجھے ہیڈ کوچ کا فون آیا کہ ریحان آپ لوگ ۱۵ اردن میں ۱۵ لاکھ کا روح افزا اور ملک شیک پی گئے؟ میں نے کہا سر ملک شیک تو ہمیں ملتا ہی نہیں ہے اور روح افزا ہم تقریباً چھپکا پیتے ہیں تاکہ فیت نہ بڑھے۔ پھر میں نے پوچھا، بل کون سے ۱۵ لاکھ کا ہے تو انھوں نے بتایا، صلاح الدین نے مجھے ۱۵ لاکھ کا بل بھیجا ہے۔ میں نے کہا کہ سر ہمیں تو کچھ نہیں ملا وہ سارا روح افزا کھر لے گئے ہوں تو پتا نہیں۔

کپتانی کا یادگار دور

جب میں کپتان تھا تو میری قیادت میں پاکستانی ٹیم نے برازیل میڈل ۲۰۰۶ء دوہا، کامن ویلتھ گیمز ۲۰۰۶ء سلور میڈل، ایشیاء فور میں ۲۰۰۸ء میں گولڈ میڈل حاصل کیے۔

کرتے ہیں اور بعد میں ڈیفنس۔ جب ہم ۶، ۵، ۴ ساتھ انیک کرتے ہیں اور ادھر سے کاؤنٹر انیک ہوتا ہے تو پیچھے گپ ہونے کی وجہ سے ہمارے لیے ہمیشہ مسئلہ ہو جاتا ہے۔

شہباز سینئر میرا آئیڈیل کھلاڑی

شہباز سینئر میرا آئیڈیل تھا۔ بچپن میں اسے کھیلتے دیکھا تو ہاکی کا شوق پیدا ہوا۔ ایک مرتبہ وہ ہاکی کھیل رہا تھا اسکول میں تو اس کے ساتھ تصویر بنوانے کے شوق میں گیٹ سے ۲۰ گھنٹے انتظار کرتا رہا۔ شہباز سینئر میں خداداد صلاحیت تھی، ورنہ وہ ٹریننگ بھی اتنی نہیں کرتا تھا مگر بہت اچھا بھی کھیلتا تھا۔ وہ بال کو تیزی سے چلاتا جاتا اور پھر ایک دم اچانک روک لیتا تھا اور گورے آگے جا کے گرتے تھے۔ اس کی ایک تصویر ہے جس میں وہ جرمنی کے خلاف کھیل رہا ہے وہ بال کو آگے پھینک رہا ہے اور ۳ گورے اس کے قدموں میں گرے ہوئے ہیں۔ شہباز آؤٹ آف ڈی جو کام کرتا تھا وہ کوئی اور کھلاڑی نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے شہباز سینئر کے ساتھ ایک بیچ کھیلا اس کے بعد وہ ریٹائر ہو گیا۔ وہ میرا آئیڈیل کھلاڑی ہے۔

صلاح الدین ہمیشہ میڈیا کی انگلی پکڑتا ہے

صلاح الدین میڈیا کی انگلی پکڑ کے آگے آیا۔ صلاح الدین پاکستان کا پہلا کوچ ہے جو تنخواہ پر (Paid) آیا تھا اور اس کی وجہ سے اس بات کا رجحان بڑھا کہ جو بھی سکھانے آتا ہے، کہتا ہے کہ مجھے کیا دیں گے؟

بھائیوں سے پہلے یہ اعزاز صرف بہادر پور سے تعلق رکھنے والے پاکستانی ہاکی ٹیم کے اشارت علی اور کلیم اللہ کی فیملی کو ہی حاصل تھا کہ مطیع اللہ کے بعد اس فیملی کے دو بھائیوں کو ملک گیر شہرت ملی تھی۔

”جب سے عمران ٹیم میں آیا ہے۔ ہماری فیملی ہاکی کے حوالے سے مشہور ہو گئی ہے۔“

ریحان کے خیال میں ہاکی کی ایک ہی اکیڈمی ہونی چاہیے۔ جہاں ۳۰، ۳۵ لڑکے ہوں اور ان کو ٹریننگ دی جائے۔ پاکستان ہاکی فیڈریشن والوں نے ہر جگہ اکیڈمی بنا لی ہے۔ اسی لیے تو ان سے لڑکے سنبھالے نہیں جا رہے۔ نہ معیار بہتر ہو رہا ہے نہ ٹیم میں ضرورت پوری ہو رہی ہے۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر آج بھی ہاکی میں Turning اور دوسرے اصول واپس آجائیں تو پاکستان ہاکی میں راج کرے گا۔ گوروں کا جسم لچکدار نہیں اور ہمارے جسم ان کی نسبت لچکدار ہیں۔ وہ بال کو سنبھالنے میں مشکل کا سامنا کرتے ہیں جب کہ ہم بال کو کہیں سے بھی گھما کے لے جاتے ہیں۔ ریحان کا کہنا ہے انھوں نے اپنے فائدے کے لیے قوانین تبدیل کیے۔ اپنے لیے آسانی اور ہمارے لیے مشکل پیدا کر دی۔

آج کی ہاکی ۱۰ ارسال پرانی ہاکی کی نسبت زیادہ فاسٹ ہو چکی ہے۔ انھوں نے ہاکی کے اصول تبدیل کر کے اسے اتنا فاسٹ کر دیا ہے کہ یہ ایک قسم کی فٹ بال بن گئی ہے۔ گورے پہلے دفاع (Defence) کرتے ہیں اور بعد میں انیک (Attack)، جب کہ ہم پہلے انیک

حاکم علی زرداری میرے ساتھ ہی فلم پروڈیوسر بنے۔

اس سے پہلے وہ حاکم علی عطر والے مشہور تھے۔

شاہ عالمی میں ان کی دکان تھی۔

نہیں پڑھے جائیں گے۔ آپ آئرس کے مضامین لکھو۔
پھر انھوں نے فارم مجھ سے لے کر خود ہی پنجابی، لائبریری
سائنس اور فزیکل ایجوکیشن کے مضامین لکھ دیے۔

۲۳ سال بعد جی سی کو کیسے جتایا؟

کالج کا ہمارا پہلا سال تھا اور انٹر کالجیٹ سپورٹس
کے مقابلے ہوئے۔ ایم، اے، او کالج گزشتہ ۲۲ سال
سے چیمپین تھا اور ہم اس کے خلاف فائنل میں جا کر
ایک، دو سے ہار گئے۔

میں نے اپنے سپورٹس ٹچر سے کہا کہ اگلے سال میرا
آخری سال ہے اگر آپ ٹیم مجھے میری مرضی کی بنانے
دیں تو میں آپ کو چیمپین شپ جیت دوں گا۔ انھوں
نے میری بات مان لی اور کہا کہ تم آزادی سے لڑو گے
انتخاب کرو۔ اسی دوران نئے داخلوں کے ٹرائل شروع ہو
گئے۔ میرے ماموں کا بیٹا اسد ہے، میں نے اسے کہا کہ

آپ پیڈ پہن کے آ جانا، میں آپ کو گورنمنٹ کالج میں
داخلہ دلوا دوں گا۔ دوسرے دن میرا کزن آ گیا۔ ایک اور
لڑکا بھی پیڈ پہن کے آیا ہوا تھا۔ اس کا قد بھی اچھا تھا اور
کھیلتا بھی اچھا تھا۔ میں نے اپنے ماموں کے لڑکے سے
کہا کہ اگر میں ٹیم میں اس لڑکے کو نہیں ڈالتا تو اس کے
ساتھ زیادتی ہوگی۔ ایسا کرو تم گھر چلے جاؤ میں اسے ٹیم
میں شامل کر لیتا ہوں۔ آپ کو بعد میں بھی موقع مل جائے
گا۔ جس لڑکے کو میں نے ٹیم میں شامل کیا۔ آج وہ
پاکستان قومی ٹیم کا گول کیپر سلمان اکبر ہے۔ اگر اس وقت
میں اسے ٹیم میں شامل نہ کرتا تو یقیناً وہ دل چھوڑ دیتا اور
پھر شاید کبھی ہاکی نہ کھیلتا۔

اولمپک ۲۰۱۲ء میں، میں نے اپنی زندگی میں سب

سے زیادہ مشکل وقت کا سامنا کیا۔ اس سے پہلے میں نے
کبھی ہاکی کھیلنے وقت اتنی مشکل کا سامنا نہیں کیا تھا۔ اس
مشکل کی وجہ یہ تھی کہ میں نے ریٹائر ہونا تھا۔ اس لیے
مجھے سخت محنت کرنا پڑی۔

بڑے گر کی بات

مجھے میرے سینئر نے ایک بڑے گر کی بات سمجھائی
تھی کہ اگر تم گراؤنڈ میں اچھا کھیلو گے تو لوگ تمھیں
سپورٹ کریں گے، یہاں تک کہ قتل بھی کر دو تو وہ تمھارا
ساتھ دیں گے اور اگر گراؤنڈ میں نہیں کھیلو گے تو باہر
نمازیں بھی پڑھو۔ تو لوگ آپ کی عزت نہیں کریں گے۔
میں نے ہمیشہ گراؤنڈ میں اچھی پرفارمنس دی اور باہر کبھی
کسی نے میری طرف ایک انگلی بھی کھڑی نہیں کی۔

ہالینڈ میں ہاکی کا نظام

ہالینڈ والوں کا ایک سسٹم بنا ہوا ہے۔ ہر سال ان کی
ایک لیگ ہوتی ہے۔ ۱۰ ٹیمیں ان کی اوپر ہیں اور
۱۰ ٹیمیں نیچے ہیں جو اوپر والی ٹیم کی آخری لیول کی ۳
ٹیمیں ہوتی ہیں وہ نیچے آ جاتی ہیں اور نیچے والی جو
۳ بہترین ٹیمیں ہوتی ہیں وہ اوپر چلی جاتی ہیں۔ ان کا ہر
ہفتے میچ ہوتا ہے۔ ہر ٹاؤن کی اپنی ٹیم ہوتی ہے اور اس
ٹاؤن میں رہنے والے لوگ اس ٹیم کی مالی سپورٹ کے
لیے چندہ دیتے ہیں۔ چندہ دینا ہر گھر پر لازم ہے اور ہر
گھر سے ایک بچہ کھیلنے کے لیے ٹیم کا حصہ بھی لازمی بنتا
ہے۔ جب کسی بچے کی کونٹی بچہ کھیل رہا ہوتا ہے تو وہ چندہ
بھی آسانی سے دے دیتے ہیں۔ ان ٹیموں کو ان کی
سوسائٹی چلاتی ہے اور گورنمنٹ کا ان سے کوئی لینا دینا

میں اسکول پڑھنے کے لیے نہیں کھیلنے کے لیے گیا تھا

میرا کینیٹین پہ کھانے پینے کا سارا بل اسکول والے ہی دیتے تھے

ریحان اور عمران دونوں کا اسٹارٹ ایک جیسا ہے۔ ثابت بٹ

پیشے کے لحاظ سے میں فلم پروڈیوسر تھا۔ میرے بچوں میں سب سے زیادہ ریحان کو ہاکی کھیلنے کا شوق تھا۔ یہ گھر سے چوری
چھپے ہاکی کھیلنے کے لیے نکل جایا کرتا اور اکثر مجھ سے مار بھی کھاتا۔ جب یہ ماڈل ٹاؤن ہائی سکول میں داخل ہوا تو وہاں اس نے
باقاعدہ سکول کی طرف سے ہاکی کھیلنا شروع کی۔ ریحان کو پانچویں کلاس سے ہاکی کھیلنے کا شوق پیدا ہوا۔ میرے تینوں بیٹوں
کا گورنمنٹ کالج لاہور میں فرسٹ اسٹیر میں داخلہ سپورٹس کی بنیاد پر ہوا۔ یہ بات کہ بچے ہاکی میں کیوں گئے۔ فلم لائن میں کیوں
نہیں آئے تو میرا اصول ہے کہ جہاں باپ کام کر رہا ہو، وہاں بیٹے کو لے کر نہیں جانا چاہیے۔ کیونکہ جو باپ کی باتیں ہوتی ہیں
وہ بیٹے کے سامنے آ جاتی ہیں اور بچوں کے دل میں باپ کی عزت نہیں رہتی۔

صدر آصف علی زرداری کے والد حاکم علی بھی میرے ساتھ ہی فلم پروڈیوسر بنے۔ انھوں نے بھی ۲۲ فلمیں بنائی تھیں۔ ان کی شاہ عالم
میں عطری دکان تھی۔ جس کی وجہ سے یہ حاکم علی عطر والے مشہور تھے۔ میں نے جو فلمیں بنائیں ان میں جان سن، ہیرا پھیری، معاشرہ
اور ایک پشتو فلم شامل ہیں۔ دشمن سے ٹکڑ میری آخری فلم تھی۔ سلطان راہی اس میں ہیرو تھا۔ وہ مر گیا تو فلم میں نے بند کر کے رکھ
دی۔ پبلک نے اس کی فلمیں دیکھنا ہی بند کر دی تھیں۔ میں فلموں میں کیسے گیا؟ کی کہانی یہ ہے کہ میرے والد نے ۱۹۲۸ء میں
”کرہ دیش“ کے نام سے فلم بنائی تھی۔ مجھے کیرہ دیش کا شوق تھا، کیرہ دیش کے فلم اور پھر فلم انڈسٹری میں گھس گیا۔

بچپن میں یہ دونوں بھائی ریحان اور رضوان ہاکی کھیلنے نکل جاتے تو محلے والے کہتے کہ بچے آوارہ ہو گئے ہیں۔ باپ ہونے
کے ناطے یہ باتیں تکلیف دیتی تھیں۔ یہ تو بل کلب میں پریکٹس کرتے تھے، وہ کلب پیسے نہیں لیتا۔ آج بھی جو لڑکے ہاکی کے
شوقین ہیں مگر ان کے پاس پیسے نہیں تو یہ کلب انھیں مفت میں ٹریننگ دیتا ہے۔

عمران نے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لینے کے لیے گول کیپر کی ٹریننگ لی، مگر نہ ہو سکتا ہے یہ کبھی گول کیپر نہ بن پاتا۔ جب
معاشرے میں لوگ سپورٹس کی بنیاد پر داخلہ لینے والے کو نکملا سمجھتے ہیں۔ لیکن جب ریحان کو شہرت ملنا شروع ہوئی تو پھر سب
کہتے کہ ہمیں تو پہلے ہی پتا تھا کہ یہ بہت بڑا کھلاڑی بنے گا۔

طویل عرصہ تک یہ ہوتا رہا کہ ریحان بہت اچھی ہاکی کھیلتا مگر اسے ٹیم میں شامل نہ کیا جاتا۔ حنیف خان نے ریحان کو ٹیم میں
شامل کیا اور بعد میں عمران کو بھی اسی نے ہی ٹیم میں شامل ہونے کا موقع دیا۔ ٹیم کھیلنے کے لیے غیر ملکی دورے پر گئی تو ریحان کو
ساتھ لے گئے مگر اس کو کھلانا نہیں۔ لندن میں، چین میں کہیں نہیں۔ جب چیمپین ٹرافی کھیلنے جرمنی پہنچے تو حنیف خان نے طاہر
زمان کو فون کیا جو ہیڈ کوچ تھا اور کہا: ”مگر اس لڑکے کو کھلانا ہی ہے تو کھلا کے نکالنا۔ ہیڈ کوچ کو غصہ آیا اور اس نے اسے بلا کے گالی

دیتے ہوئے کہا کہ جا تو بھی کھیلنے کا شوق پورا کر لے۔ اس وقت بھارت کے خلاف
آخری ۶، سیرمنٹ کی ٹیم باقی تھی۔ جب یہ میدان میں اترا اور اس نے بھارت کے
خلاف ۲۲ گول کیے اور پھر ونگ گول کیا تو اسی طاہر زمان نے کہا کہ اب تو یہ پاکستان کا
جوانی بن گیا ہے، اب اسے کون نکالے گا؟

دونوں بھائیوں کا اسٹارٹ ایک جیسا ہے۔ ریحان چیمپین ٹرافی میں بھارت کے خلاف
گول کر کے ٹیم میں آیا اور عمران بھی چیمپین ٹرافی میں بھارت کے خلاف میچ میں گول بچا کر
ٹیم کا حصہ بنا۔ پاکستان کے پاس اس وقت کوئی اچھا گول کیپر نہیں ہے اگر عمران تھوڑی سی اور
محنت کر لے تو اس کا مستقبل بن جائے گا۔



نہیں ہے۔ میں ۲۲ سال وہاں رہا، روز ۲۲ سے ۲۴ بجے تک میں ان کو سکھانے کے لیے وقت دیتا تھا جس کے لیے فی سچہ مجھے ۲۰ روپے دیے جاتے تھے۔ میرے جانے پر وہاں بہت خوشی اور جوش تھا۔ انھیں بتایا گیا تھا کہ پاکستان کا مشہور کھلاڑی ہے اور دنیا میں اس نے بہت نام کمایا ہے۔ بچے اپنے والدین کے ساتھ ملے آتے تھے اور مجھے چھو کر دیکھتے تھے۔ انھیں خوشی تھی کہ میں ان کو سکھاؤں گا۔ وہ بہت شوق سے سیکھتے آتے تھے۔

ہاکی میں گلیمبر کی کمی

کھلاڑی کے طور پر میں نے بہت اچھا کھیلا، جب کیپٹن بنا تو ذمہ داری بڑھتی چلی گئی۔ کپتانی کرنا، ایک بہت بڑا فن ہے۔ ہاکی میں ایک مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ اگر جیت گئے تو کوچ کہتا ہے کہ یہ میری محنت ہے اور اگر ہار گئے تو کپتان کا قصور۔ ہاکی میں گلیمبر بہت کم ہے جس کی وجہ سے ہاکی کے کھلاڑیوں کے اتنے اسکینڈل نہیں ہیں۔ جتنے کرکٹ کے کھلاڑیوں کے بنے ہیں۔ ہاکی کے کھلاڑی بھی کم پڑھے لکھے ہوتے ہیں۔

دلچسپ شرارت

۲۰۰۳ء میں ہم ہالینڈ جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک گوجرہ کالز کا بھی تھا۔ ایئر پورٹ پر میں نے اس سے کہا کہ جہاز میں کھانا نہیں کھانا یہ بہت مہنگا ہوتا ہے۔ پیسے بہت لے لیتے ہیں۔ جہاز میں باقی سب کھانا کھا رہے تھے مگر وہ خاموش بیٹھا رہا۔ اس سے ایئر ہوسٹس نے بار بار پوچھا ”آپ کے لیے کھانا لاؤں، اس نے ہار کہا نہیں۔“

جہاز سے اترے تو دوسرے ساتھیوں سے اس نے کہا کہ مجھے بہت بھوک لگی ہوئی ہے۔ انھوں نے کہا کہ جہاز میں کھانا کیوں نہیں کھایا، تو اس نے کہا، وہ مہنگا ہی بہت تھا۔ اس لیے نہیں کھایا۔ انھوں نے کہا کہ بھائی وہ کھانا تو مفت میں ہوتا ہے۔ آپ کو کس نے کہا کہ مہنگا ہوتا ہے؟ وہ چیخ ہو گیا۔ کیا بتاتا کہ کس نے شرارت کی تھی؟ پھر ہول پھینچا تو سب لڑکے اپنے اپنے روم میں چلے گئے۔ میں ۱۵، ۲۰ منٹ بعد اپنے کمرے سے تیار ہو کر نکلا تو دیکھا کہ وہ لڑکا اپنا سامان لے کے کمرے سے باہر بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا کیا بات ہے؟ کمرے کے اندر کیوں نہیں گئے؟ تو کہنے لگا! ریحان بھائی، انھوں نے مجھے یہ کارڈ دے دیا کمرے کی چابی تو دی نہیں۔ کمرے میں کیسے جاتا؟ میں نے کہا پاگل یہ کارڈ ہی اس کی چابی ہے اور پھر میں نے اس سے کارڈ لیا اور سکرینچ کر کے دروازہ کھول دیا۔

ادھار کا کوٹ

جب میں پہلی دفعہ کھیلنے گیا تو سادہ کپڑوں میں گیا تھا۔ میرے پاس ٹیم کا قومی نشان والا بیسٹ کوٹ تھا نہ نکلتا تھا۔ وہاں جب بھارت کے خلاف کھیلنے کے لیے میدان میں اترنا مجھے ایک اور لڑکے کا کوٹ پہنایا گیا۔ جب میں میدان میں اترنا تو ۶ منٹ رہ گئے تھے اور پاکستان ۳، ۲ میں ہار رہا تھا۔ میں ۲۲ گول کیے اور ہم ۳، ۳ سے جیت گئے۔ ہر بندہ مجھے کندھے پر اٹھا رہا تھا اور پاکستان میں شور مچ گیا کہ ریحان بٹ کون ہے؟ طاہر زمان جو اس وقت کوچ تھا اور مجھے کھلانے پر بھی راضی نہ تھا، نے سوچا کہ اگر یہاں سے ایسے ہی کپڑوں کے

ساتھ واپس گیا تو مسئلہ بن جائے گا پھر دوسرے لڑکے کا بیسٹ کوٹ اتروا کے مجھے پہنایا گیا۔ تاکہ ایئر پورٹ پر استقبال میں کوئی سوال نہ کر سکے۔

سب سے پہلا انٹرویو

۲۰۰۳ء میں ہم چیمپئن ٹرافی کھیلنے گئے۔ اُس وقت بھی ہم ہار رہے تھے اور آخر وقت پر میں نے گول کر دیا اور ہم جیت گئے۔ اس وقت نوائے وقت میں سلطان عارف صاحب سپورٹس رپورٹر تھے۔ انھوں نے کہا کہ تم نے بڑا کام کر دکھایا ہے کہ اگر میرے بس میں ہو تو میں چائنا چوک لاہور میں تمہارا مجسمہ لگا دوں۔ انھوں نے سب سے پہلے میرا انٹرویو کیا تھا۔

شاہ رخ سے ملاقات

کامران اکمل سے میری اچھی دوستی ہے۔ مجھے اکثر کہتا ہے کہ میں اگر ہاکی کا میچ دیکھتا ہوں تو صرف تمہاری وجہ سے دیکھتا ہوں۔ ہاکی کی وجہ سے ایک دفعہ دلی میں میری شاہ رخ خان سے ملاقات ہوئی تھی۔ ایک سردار میرا بڑا مین تھا، وہ شاہ رخ خان کے سرکار دوست تھا تو اس کے کہنے پر شاہ رخ خان نے ہماری پوری ٹیم کو کھانے پر بلایا تھا۔ اسے بہت مہمان نواز اور منسلک پایا ہمارے لڑکے سارے بات کرنے سے جھجکتے تھے۔ مشہور لوگوں سے



عمران بٹ

ملنے، بات کرنے کا موقع ہی کم ملتا تھا۔ ان کو کرکٹ ٹیم کی طرح فائیو اسٹار ہوٹل میں تو ٹھہراتے نہیں، نہ ہی آؤ بھگت کرتے ہیں۔ بول چال ادب آداب بھی سکھانے چاہئیں۔

چمکتی، مسکراتی اور شرارتی آنکھوں والا

عمران، بٹ فیملی کی ہاکی کے لیے نئی پیش کش ہے۔ اس نے آتے ہی اپنی مہارت اور بے خوفی کی دھاک بٹھادی ہے۔ اس نے خوب حملہ کیا۔ ہار مان لیتے تو کب کے میدان سے باہر ہوتے۔ ہمارے کوچ ہی ہماری راہ میں آتے رہے، دل دکھاتے رہے۔ بالآخر خدا نے انتھک محنت اور سچی لگن کو قبول کر کے آگے بڑھنے کا راستہ دے دیا۔

عمران بٹ

اس وقت پاکستان کی چیمپئن ٹرافی میں فتح اور ورلڈ بیسٹ ٹیم کو فائنل میں شکست دینا، پاکستان کی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اللہ کی مہربانی اور ماں باپ کی دعاؤں کی وجہ سے یہاں تک پہنچا ہوں ٹیم میں شمولیت کے لیے حلیف خان کے لفظ کام آئے۔ جب بھی میں میدان میں کھیلنے کے لیے جاتا ہوں تو مجھے کسی قسم کا کوئی ڈر یا خوف نہیں ہوتا۔ مجھے میرے سینئرز نے بتایا ہے کہ گول تو ہوتا ہے، کوشش کریں کہ اگر ایک ہوا ہے تو دوسرا نہ ہو۔ جب یہ چیز میرے دماغ میں ہوتی ہے تو مجھے کسی قسم کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔ البتہ ایک خیال ضرور آتا ہے کہ لوگ سوچیں گے کہ ریحان بٹ کا بھائی ہے وہ تو بہت اچھا کھلاڑی تھا یہ کیسا ہے؟ جب ہم آسٹریلیا سے ایک صفر سے ہارے تھے تو ان کا کوچ میرے پاس آیا تھا اور کہا کہ آپ نے پاکستان کو بچا لیا مگر نہ آپ کی ٹیم نے ۴ صفر سے ہارنا تھا۔ جب ایسی باتیں سننے کو ملیں میرا حوصلہ بلند ہوا۔

مجھے تقریباً دو سال تک کھیلنے کا موقع نہیں دیا گیا۔ نہ کوئی وجہ بتائی جاتی۔ میں اچھا کھیلتا مگر میچ میں میری جگہ

☆ ہماری فیملی ہاکی کے حوالے سے مشہور ہو گئی ہے

☆ ہمارے جسم گورے کی نسبت زیادہ لچکدار ہیں

☆ آج کی ہاکی فٹ بال کی طرح بہت تیز ہو چکی ہے

ہاکی میں بیٹ برادران سے پہلے بھائیوں کی ایک اور جوڑی نے بڑی شہرت پائی تھی۔ انھوں نے کئی سال پاکستان کا پرچم بلند رکھا۔ قوم نے ان سے محبت بھی اسی طرح ٹوٹ کر کی۔

سیخ اللہ کی شادی بہاولپور کے مشہور و معروف اسٹیڈیم میں اس عالم میں ہوئی تھی کہ ایک ہزار لوگ ویسے میں مدعو تھے اور پانچ ہزار سے زیادہ ان کے چاہنے والے وہاں اپنے آپ کو خود ہی مدعو کر کے پہنچے ہوئے تھے۔ سیخ اللہ کی بھویوں بھری کا کو لوگوں نے مظفر گڑھ ان کے سسرال جانے والی سڑک پہ چلانے کے بجائے ہاتھوں پر اٹھا کر پہنچایا تھا۔ سیخ اللہ پاکستان ٹیم کے فنانس ہارس کھاتا تھے۔ بعد میں یہ خطاب صلاح الدین نے کئی بار چرانے کی کوشش کی مگر بات نہیں بنی۔ سیخ اللہ اور کلیم اللہ دونوں بھائی مزاج میں ایک دوسرے کے بالکل برعکس تھے۔ ایک نرم مزاج، دھیما تو دوسرا گرم مزاج۔ سیخ اللہ کو ہاکی گراؤنڈ سے گئے ہوئے بھی دو سے زائد دہائیاں ہو چکی ہیں مگر ہاکی سے پیار کرنے والے انھیں نہیں بھولے۔ ایک لیفٹ آؤٹ تھا دوسرا رائٹ ان کھیلتا تھا۔

رضوان ویسے تو بڑا بھائی ہے اور ہاکی میں دونوں بھائیوں سے سینیئر بھی ہے۔ ہاکی نے ہی اسے عمرہ بھی کرایا اور واپڑا ٹیم تک پہنچایا۔ ٹیم ٹیم میں وہ منتخب ہونے کے باوجود اسے صرف اس لیے شامل نہ کیا گیا کہ یوں ایک ٹیم میں تین بھائی ہو جائیں گے۔ رضوان کی گفتگو میں افسردگی غالب نہیں تھی، بلکہ غم و ہمت اس کے لفظوں میں نمایاں تھی۔

حسن سرور کو ٹی ٹیم میں شامل کیا گیا تھا۔ جعفری صاحب کی اور دوسری ہاکی کی۔ آپ نے ایک اچھے ہاکی پلیئر کو ہاکی سے نکال دیا ہے۔

جب میں رو رہا تھا تو شہناز شیخ نے مجھے کہا کہ میں تمہیں جانس ضرور دوں گا۔ پھر بریڈیٹر مسرت اللہ نے بہمنی گولڈ کپ کھیلنے کے لیے پنجاب پاکستان کے نام سے ٹیم بنائی اور مجھے اس کا کپتان بنا کے بیچ دیا۔

بہمنی گولڈ کپ کی وجہ سے میں دوبارہ کیمپ میں آ گیا اور سینیئرز کے ساتھ کھیلا۔ دلچسپ بات یہ ہے اتنی اچھی کارکردگی کے باوجود آصف باجوہ نے میرے والد سے کہا کہ میں آپ کے بڑے بیٹے رضوان کو پلیئر بھی نہیں مانتا۔ اسی سال اسمیل عباس نے ۱۳ سال سے زیادہ تھے۔ ہریج کی تفصیل اخبارات میں آتی تھی۔ انھوں نے آخر ظلم یہ کیا کہ فائل میں میرے گول ہی کم کر دیے کہ اس نے پورے ٹورنامنٹ میں ۴۲ گول کیے ہیں۔ یوں اس جھوٹ کی بنیاد پر مجھے ٹیم سے باہر کر دیا۔ مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ موقع ہی نہیں دیا گیا ورنہ میری کارکردگی سب کے منہ بند کر دیتی۔ اس سب کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اب واپڑا کے لیے کھیلتا ہوں اور زندگی سے اچھی امید رکھتا ہوں۔

رشید صاحب چھوڑ گئے تو شہناز شیخ کے ساتھ کرل شاہد جعفری صاحب ٹیم مینیجر کے طور پر آ گئے۔ وہ بہت اچھے مینیجر تھے۔ ٹیم نے آسٹریلیا جانا تھا پوری ٹیم سلیکٹ ہو گئی تھی۔ تمام ٹیم ممبرز نے مجھے مبارکباد دے دی۔ ٹیم کا کلر بھی مل گیا۔ جزل عزیز نے مجھے مبارکباد دی کہ دونوں بھائی ایک ساتھ کھیلو گے خوشی کی بات ہے۔ ریحان کو موقع مل گیا کھیلنے کا تمہیں موقع نہیں ملا ابھی تک، تم نے کھیلا نہیں تو لوگوں کو پتا نہیں تھا۔ میں ٹیم مینیجر صاحب کے ساتھ ایئر پورٹ جا رہا تھا تو میں نے پوچھا سمریرا جانس ہے ناں۔ انھوں نے کہا کہ اگر میں آسٹریلیا جاؤں گا تو تم بھی آسٹریلیا ضرور جاؤ گے اور کھیلو گے۔ صرف ایک صورت میں تم آسٹریلیا نہیں جا سکتے اگر میں نہ جاؤں تو۔

دوسرے دن شاہد جعفری صاحب کو ہارٹ ایکٹ ہوا اور ان کی وفات ہو گئی اور اسی دن شام کو ٹرائل تھے۔ شہناز شیخ PTCL کا ملازم تھا۔ اس کی کوشش تھی کہ وہ PTCL کے لڑکے زیادہ لے کر آئے۔ اس نے مجھے نکال دیا۔ جب شہناز شیخ نے مجھے نکال دیا تو احمد عالم نے شہناز شیخ سے کہا کہ آج یہاں ۱۲ اموات ہو گئی ہیں ایک

ملاقات ختم ہونے کو تھی جب طیب اعجاز صاحب کو اچانک ایک آئیڈیا سوچھا۔ انھوں نے دوسرے فلور پہ واقع روشنی کے جھونچے پاکستان کی ایک بڑی اور معیاری ٹیچنگ کمپنی ہے کی میز ٹیم کو بلوا لیا۔ عمران نے ہم سب کی توقع کے بالکل برعکس ایسی دانائی اور عمرگی سے بات کا آغاز کیا کہ ہم تو حیران ہی رہ گئے۔ ایک نوجوان لڑکا جو مسلسل نظر انداز ہوتا رہا ہو، اسے کام کرنے اور پرمارٹس دکھانے کا موقع دینے میں تعصب اور نا انصافی کا ارتکاب کیا جاتا رہا ہو، وہ پروفیشنل لوگوں سے یوں ان کی ضرورت اور ان کی پیج پر آکر بات کرے، حیرت تو ہوگی۔

عمران نے کہا کامیابی گراؤنڈ کے اندر ہو یا باہر۔ بروقت اور درست فیصلے سے ہوتی ہے۔ آپ کی کامیابی اور ناکامی کوئی دوسرا ذمہ دار نہیں ہوتا۔ الزام لگانے والے، الزام دے کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ جو کام آپ کے ذمے ہے وہ آپ ہی نے کرنا ہے اور بہترین انداز میں کرنا ہے۔ اسی میں آپ کی عزت ہے، اسی میں پہچان ہے۔ آپ اگر اپنے مخالف ہم عصر، ٹیم یا کمپنی کے طریق کار، پالیسی اور حکمت عملی کو جاننے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں تو یوں سمجھیں آپ کو اپنے شعبے میں آگے بڑھنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔

دوسروں کی کمزوریاں آپ کی قوت بن سکتی ہیں، ہاں اپنی کمزوریوں کو دوسروں کی قوت نہ بننے دیں۔ میرے کوچ نے مجھے بار بار کہا عمران گول تو ہونا ہی ہوتا ہے۔ اصل کام یہ ہے کہ تم ۳۰ کلو وزن کے ساتھ کتنی تیزی اور ذہانت سے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہو اور اپنا ذہن استعمال کرتے ہو کہ یہ کدھر سے بال پھینک سکتا ہے۔

شاہد میری قسمت کا ہی مسئلہ تھا

رضوان بیٹ

ریحان کو موقع مل گیا کھیلنے کا اور مجھے موقع نہیں ملا۔ شاہد میری قسمت کا ہی مسئلہ تھا۔ ۲۰۰۳ء میں چائنا کی ٹیم پاکستان آئی تھی۔ اسمیل مل میں کیمپ لگا۔ میں نے وہ پورا کیمپ کھیلا جو کہ پانچ سیریز پر مشتمل تھا۔ وہاں سے میں ٹیم کے ساتھ لگ گیا۔ وہ کیمپ ۲۰/۲۱ پلیئر کا ہوتا تھا جس میں سے ۱۶ یا ۱۷ کھلاڑی چنے جاتے تھے۔ ۲۲ سال جوینر کے ساتھ کھیلا پھر سینیئرز کے ساتھ کھیلنے کا موقع ملا۔ میں نے اچھے بیچ کھیلے مجھے اصل میں حسن سرور صاحب لے کر آئے۔ ۲۰۰۱ء میں نیشنل کیمپنگ ہوئی تھی کراچی میں وہ واحد کیمپ تھا۔ جس میں ٹرائل نہیں ہوئے تھے۔ اس کیمپ میں سے دو پلیئر نکالے گئے تھے۔ جن کی جگہ پر مجھے اور

عمران شاہ کو ڈال دیا گیا۔ پھر میں نے ہمت چھوڑ دی کہ ایسے ہی وقت ضائع کر رہا ہوں مگر والدین نے ہمت بندھائی کہ صبر کرو، آپ کو بھی جانس ضرور ملے گا۔ پھر مجھے اللہ نے موقع دیا اور میں کھیلا۔ میں نے دل میں یہ طے کیا کہ جب مجھے موقع ملے گا تو میں یہ ثابت کروں گا کہ میں عمران شاہ سے اچھا گول کیپر ہوں۔ جب میں کھیلنے کے لیے گیا تو حنیف خان نے مجھے ایک بات کہی کہ آپ سکون سے اپنی ٹیم کرنا، ۵۵ گول ہوں، ۶۱ ہوں یا ۷۱۔ آپ نے پریشانی نہیں لینی۔ آپ نے اچھا کھیلا ہے۔ اللہ کی مہربانی سے چیپٹین ٹرائی ہم نے جیتی۔

مجھے اس بات کی زیادہ خوشی ہے کہ جب مجھے موقع ملا تو میں نے ثابت کیا کہ میں پہلے بھی ایک اچھا گول کیپر تھا۔ ابھی انڈیا میں ہونے والی ہاکی لیگ میں انھوں نے پوری دنیا سے ۲۰ گول کیپر لیے ہیں۔ ایک ہالینڈ کا اور ایک میں پاکستان سے ہوں۔ اس کے علاوہ کسی اور ملک سے کوئی گول کیپر نہیں لیا گیا۔





میرے صحافتی کیریئر کی خوبصورت یادیں

سات سوالوں پر محیط صحافیانہ سفر کی دلچسپ کہانی،
سات میگزین ایڈیٹرز کی زبانی

غلام سجاد

پریشانی کے باعث صحافت چھوڑنے کا سوچا؟۔ کیا صحافی
واقعی ویسے نہیں ہوتے جیسا لوگ سوچتے ہیں؟

میں نے ایک ٹارچ کی مدد سے
درجن بھرکتوں کا مقابلہ کیا

غلام محی الدین (روزنامہ ایکسپریس)

کینال بینک روڈ پر ہم موٹر سائیکل دوڑائے جا رہے
تھے، کیپس انڈر پاس پر ٹریفک بلاک ہونے کی وجہ سے
مختلف گلیوں کی سیر کرتے ہوئے گلبرگ کی راہ لی، کچھ ہی
دیر میں ہم روزنامہ ایکسپریس کے مین گیٹ پر کھڑے
تھے۔ صدر دروازے پر کاغذی کارروائی کے بعد ہمیں
ویننگ روم میں بھیج دیا گیا اور وہاں سے پھر میگزین سیکشن
میں۔ میگزین ایڈیٹر، غلام محی الدین سے ملاقات ہوئی۔
پہلے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ میگزین ایڈیٹر

اور صحافی ہماری زندگی کا لازم حصہ
بن گئے ہیں۔ اکثر گھروں میں تو دن
بھی شروع نہیں ہوتا جب تک اخبار نہ
آجائے۔ چھٹی والا دن اخبار کے ساتھ ساتھ سنڈے
میگزین دیکھنے، پڑھنے اور تبصرے کرنے میں گزرتا ہے۔
لیکٹر انک میڈیا کی مقبولیت کے باوجود پرنٹ میڈیا
کی ضرورت اور مقبولیت اسی طرح قائم ہے۔

اس ماہ ہم آپ کو ۷ اہم اخبارات کے میگزین ایڈیٹرز
سے ملوا رہے ہیں۔ ان سے ۷ سوال پوچھے گئے تھے۔
۱۔ میگزین ایڈیٹر میں ۳۰ بنیادی اور بہترین خوبیاں کیا
ہونی چاہئیں؟ ۲۔ آپ میں یہ خوبیاں کیسے اور کتنے عرصہ
میں پیدا ہوئیں؟ ۳۔ اگر آپ کو مکمل آزادی ہو تو آپ اپنے
اخبار میں کیا تبدیلی لائیں گے؟ ۴۔ صحافتی کیریئر میں آپ
کی خوبصورت یاد؟ ۵۔ اپنے میگزین کے علاوہ دوسرا کون سا
میگزین شوق سے پڑھتے ہیں؟ ۶۔ کبھی تنگ آکر ذہنی دباؤ یا

کو عصری حالات سے آگاہ ہونا چاہیے۔ فی زمانہ کیا ہو رہا ہے، سیاسی، دینی، دنیاوی، معاشرتی و تہذیبی تبدیلیوں سے آگاہ رہنا میگزین اینڈیر کی بنیادی خوبی ہے۔ ساتھ ہی اس کو تمام علوم سے گہری دلچسپی ہی نہیں بلکہ ان پر قوی گرفت ہونی چاہیے اور زبان و بیان کی خوبیوں کا بھی حامل ہونا چاہیے۔ اور سب سے بڑھ کر میگزین اینڈیر میں زبردست قوت فیصلہ ہونا چاہیے۔ کسی بھی مسئلے کے ساتھ لٹکنے کے بجائے فوری طور پر اسے حل کرنا چاہیے۔ اس کے اندر یہ خوبی بھی ہو کہ وہ دنیا کے تمام موضوعات پر اس انداز میں لکھے کہ ایک عام بندہ باسانی ان کو پڑھ اور سمجھ سکے۔ جب ان سے پوچھا کہ آپ میں مندرجہ بالا خوبیاں کب اور کیسے پیدا ہوئیں تو انھوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا کہ مجھ میں تو ابھی ایسی کوئی خوبی ہے نہیں۔ ہاں پیدا ہو جائیں تو پتا نہیں، کچھ کہہ نہیں سکتا۔

انھوں نے پھر بتایا، میں میگزین کے موجودہ سائز سے متفق نہیں۔ اگر مجھے اختیار ہو تو میں اس کی لمبائی کم کر کے چوڑائی زیادہ کر دوں۔ صحافتی کیریئر کے حوالے سے ان کی ایک بہت ہی دلچسپ اور حیران کن یاد سننے کو ملی۔ کوئٹہ سے انھوں نے اپنے صحافتی کیریئر کا آغاز کیا تھا۔ ”وہاں میں پڑھنے کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ اخبار میں ملازمت مل رہی تھی تو میں نے کر لی۔ ایک دن کام زیادہ ہونے کی وجہ سے مجھے رات کو سٹی ڈیک پر روک لیا گیا اور رات ۲ بجے چھٹی ملی، دفتر سے باہر نکلا تو پولیس کی ایک گشتی گاڑی جا رہی تھی، اس سے لفٹ لی اور اپنے گھر کے سامنے مین روڈ پر اتر گیا سامنے گلی میں میرا گھر تھا۔

ان دنوں وہاں پریسنگ کے کنارے افغان مہاجرین کے کیمپ لگے ہوئے تھے۔ افغان مہاجرین نے کوچی نسل کے کتے پالے ہوئے تھے۔ جونہی میں سڑک سے نیچری طرف اترتا تو ۱۵، ۱۰ اکتوں نے مجھے گھیر لیا۔ میرے پاس ایک تیز روشنی والی ٹارچ تھی۔ جس طرف سے مجھ پر کوئی کتا حملہ آور ہوتا تو میں ٹارچ کا رخ اس طرف کر دیتا اور روشنی کی وجہ سے کتے کو کچھ دکھائی نہ دیتا۔ پھر دوسری طرف سے کتا حملہ کرتا تو ٹارچ کا رخ اوپر کر دیتا۔ اس طرح میں نے ۱۵، ۲۰ منٹ تک درجن بھر کتوں کا ایک ٹارچ کی مدد سے مقابلہ کیا، پھر اچانک میرا پاؤں کسی چیز سے ٹکرا کے پھسلا تو میرے ہاتھ سے ٹارچ گری اور بجھ گئی۔ ساتھ ہی میرے حواس بھی جاتے رہے۔

اللہ تعالیٰ مسبب الاسباب ہے۔ اس سے پہلے کہ کتے میرے ماس کو بڈیوں سے الگ کرتے سامنے سے ایک ٹرک آگیا۔ ٹرک کی روشنی کی وجہ سے کتے ادھر متوجہ ہو گئے۔ ٹرک جب ہمارے پاس سے گزرا تو آدھے کتے سڑک کے ایک طرف اور آدھے دوسری طرف ہو گئے۔ موقع ہاتھ آتے ہی میں سرپٹ دوڑ پڑا۔ کچھ کتے میرے پیچھے بھاگے۔ ابھی میں گھر سے کچھ دور ہی تھا کہ سامنے سے ایک کتا اور کتیا نکلے جنھیں میں کبھی کبھار آتے جاتے روٹی کا ٹکڑا ڈال دیتا تھا۔ وہ مجھے بچانے کے لیے ان خونخوار کتوں سے الھڑ پڑے اور میں بھاگ کے گھر میں گھس گیا۔“ واقعہ ختم ہو گیا تو میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے محی الدین صاحب کو دیکھے جا رہا تھا جسے میرے سامنے کوئی فلم چل رہی تھی اور میرا دل کر رہا تھا کہ ابھی

محی الدین صاحب کو ٹول ٹول کر دیکھوں کہ کہیں یہ کوئی زخم یا کوئی خراش تو نہیں آئی۔ میری کھلی ہوئی آنکھیں اس وقت جھپکیں جب محی الدین صاحب نے اگلے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر مجھے کوئی مسئلہ حل کرنا ہو تو میں نیشنل جیو گرافک (National Geographic) کو سرچ کرتا یا پھر ہر الڈ (Herald) دیکھتا ہوں۔ اُردو ڈائجسٹ کو بھی اکثر اوقات ریفرنس کے طور پر استعمال کرتا ہوں۔

محی الدین صاحب نے کہا کہ میں کبھی صحافت چھوڑنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ اس میں شک نہیں کہ میں صحافت میں اچانک آیا تھا۔ لیکن جب آگیا تو جانے کا کبھی خیال نہیں آیا۔ انھوں نے کہا کہ لوگوں کی صحافیوں سے متعلق سوچ درست ہے۔ میرے خیال میں شاید وہ صحافیوں سے کچھ رعایت کرتے ہیں۔

مذہبی حوالے سے معاشرے میں
بدترین آمریت ہے

نعم بلوچ (روزنامہ نئی بات)

روزنامہ ایکسپریس سے تھوڑا سا آگے جا کر سیدھے ہاتھ مڑے تو روزنامہ نئی بات کے دفتر جا کر دم لیا۔ میگزین نیکشن پیپچے تو نعم احمد بلوچ سے ملاقات ہوئی جو وہاں میگزین اینڈیر ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ایک صحافی کو ملکی و غیر ملکی حالات

سے آگاہ رہنا چاہیے اور خاص طور پر اسے اسلامی معلومات پر گرفت ہونی چاہیے۔ صحافی میں یہ خوبی ہونا ضروری ہے کہ پرانی بات کو کیسے نئے انداز میں پیش کرے جس کی بناء پر لوگ اسے پڑھ سکیں۔ الفاظ کے جوڑ توڑ، جملوں کے وزن اور لفظوں کو بیانیہ انداز میں لکھنے کا ماہر ہی صحافی کہلا سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وقت کے ساتھ ساتھ تمام خوبیاں اور باتیں انسان میں پیدا ہو جاتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ میں میگزین کے موجودہ انداز سے مطمئن ہوں اور وقت کے ساتھ ساتھ مزید تبدیلیاں آتی رہیں گی۔ لیکن اگر مجھے کوئی آزادی چاہیے تو وہ یہ ہے کہ میں مذہبی حوالے سے کوئی بھی بات آسانی سے چھاپ سکوں۔ یہاں ذرا سی مختلف بات شائع ہو جائے تو لوگ آپ کو گولی نہیں بلکہ گولہ ماریں گے۔ اس پر بھی دل راضی نہ ہو تو دفتر کو آگ لگا دیں گے۔ ہمارے معاشرے میں مذہبی حوالے سے بدترین آمریت چھائی ہوئی ہے۔

یادگار واقعہ سے متعلق انھوں نے بتایا کہ ماہنامہ پھول میں، میں سب ایڈیٹر تھا۔ ایک روز انتظامیہ نے مجھے نکال دیا۔ چند دن بعد میری ہی لکھی کہانی کو بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی نے اول قرار دے دیا تو مجھے بے حد خوشی ہوئی تھی۔ انھوں نے کہا کہ لے آؤٹ (Layout) کے حوالے سے مجھے روزنامہ دنیا کا میگزین اچھا لگتا ہے اور متن کے حوالے سے مجھے جنگ پسند ہے۔ انھوں نے کہا کہ صحافت سے میرا رشتہ اتنا کافی ہے کہ میں لکھتا رہوں۔ مزید کہا کہ عام لوگوں کی سوچ



لوگ ذرا سی بات پر گولی نہیں گولا ماریں گے

(نعم بلوچ روزنامہ نئی بات)



(غلام محی الدین روزنامہ ایکسپریس)

مجھے اختیار ہو تو اپنے میگزین کا سائز بدل دوں



(رؤف ظفر روزنامہ جنگ)

صحافت چھوڑنے کا ارادہ باندھتے ۴۰ سال گزر گئے

میکزین، روزنامہ جنگ سے بات ہوئی۔ پہلے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا کہ صحافی کو غیر جانبدار ہونا چاہیے۔ وہ کوئی بھی بات یا خبر اپنی طرف سے نہ لکھے، اس کے پاس قوت مشاہدہ ہونی چاہیے اور صحافت میں پیش آنے والی چھوٹی موٹی مشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ انھوں نے کہا کہ مجھ میں ایک اچھے صحافی والی کوئی خوبی نہیں اور میں اچانک اس شعبے میں آ گیا تھا۔ وہ جیسے کہتے ہیں کہ ”گلے پڑا ڈھول ہے بجانا پڑے گا۔“ آج کل کی ضرورت کے مطابق تصویروں اور ڈیزائن کی طرف توجہ دینا میں اپنا اولین فرض سمجھتا ہوں۔ خاص طور پر ناسٹل پیج کو بنانے میں زیادہ محنت کی ضرورت ہوتی ہے۔ خوب صورت یاد کے حوالے سے انھوں نے کہا میں روزنامہ مشرق میں ریاض بناوالی کے ساتھ کام کرتا تھا۔ وہ مجھے بدل کر یعنی بھی تانگے والا اور بھی قلی بن کر اپنی تصویر کھینچواتے اور اخبار کے فرنٹ صفحے پر لگا دیتے۔ سوال میں پوچھا جاتا کہ تصویر میں کون ہے اور صحیح بتانے والے کو انعام بھی دیا جاتا۔ تصویر کے سہن کا مزہ مجھے آج تک بھی یاد ہے۔ پہلے تو اتنا وقت ہی نہیں ملتا کہ کسی اور میکزین

صحافی کو خبر کی اہمیت کا اندازہ ہونا چاہیے

ذوالفقار چودھری (روزنامہ خبریں)

ان کے بعد ذوالفقار چودھری صاحب سے ملاقات ہوئی، وہ سنڈے میکزین روزنامہ خبریں کے انچارج ہیں۔ پہلے سوال کے جواب میں انھوں نے کہا صحافی کو خبر کی اہمیت کا اندازہ ہونا چاہیے۔ وہ اپنے پیشے سے وفادار ہو اور اس کے پاس تمام شعبہ ہائے زندگی سے متعلق



(ذوالفقار چودھری روزنامہ خبریں)

اگرچہ زرد صحافت کا عنصر موجود ہے
تاہم سارے صحافی بُرے نہیں ہیں

سے محبت اور لگن ہو۔ وہ کام کو کام نہیں بلکہ عبادت سمجھ کر کرے۔ انھوں نے کہا کہ میں نہیں سمجھتی کہ مجھ میں صحافیوں والی خوبیاں ہیں، ابھی میں نے اپنا صحافت کا سفر شروع کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں پابند نہیں اور میکزین نکالنے میں مکمل فری ہینڈ ملا ہوا ہے۔ میں نہیں سمجھتی کہ میرے میکزین میں اس وقت کسی قسم کی کوئی کمی ہے۔

انھوں نے بتایا میرے صحافتی کیریئر میں میرے لیے سب سے زیادہ خوشی کا لمحہ تب تھا جب احسان شاہ صاحب نے میرے لکھے ہوئے ایک مضمون کو سراہا، مجھے اپنے گھر پر کھانے کی دعوت دی تھی اور میری بہت زیادہ تحسین کی۔ اپنے میکزین کے علاوہ انھیں ایکسپریس میکزین پڑھنا زیادہ پسند ہے۔ انھوں نے کہا کہ کبھی صحافت چھوڑنے کا نہیں سوچا البتہ میں شروع میں الیکٹرانک میڈیا میں تھی، اسے چھوڑ کر پرنٹ میڈیا میں آئی ہوں۔ میں سمجھتی ہوں کہ لڑکیاں الیکٹرانک میڈیا کی نسبت پرنٹ میڈیا میں زیادہ کامیاب رہتی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ لوگ تو لوگ ہیں کچھ بھی سوچ سکتے ہیں۔ پانچویں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ اچھے برے لوگ ہر جگہ ہوتے ہیں۔

گلے پڑا ڈھول بجا رہا ہوں

رؤف ظفر (روزنامہ جنگ)

دوسرے دن رؤف ظفر صاحب، انچارج سنڈے



(سونیہ سلیم روزنامہ انصاف)

میں سمجھتی ہوں کہ لڑکیاں الیکٹرانک میڈیا کی نسبت پرنٹ میڈیا میں زیادہ کامیاب ہیں

صحافیوں سے متعلق بالکل درست نہیں۔ وہ لکیر کے فقیر ہیں اور ان کی کوئی بھی بات حقیقت پر مبنی نہیں۔ سوال و جواب کا سلسلہ اختتام کو پہنچا اور میں انتظار ہی کرتا رہا کہ چائے چھوڑ کے پانی کا ہی پوچھ لیا جائے مگر انتظار ختم نہ ہو سکا۔ خیر صحافتی زندگی کی یہی یادیں ہوتی ہیں۔

صحافی کو اپنا کام عبادت سمجھ کر کرنا چاہیے

سونیہ سلیم (روزنامہ انصاف)

ہماری اگلی منزل روزنامہ انصاف تھا۔ استقبالیہ سے ہوتے ہوئے ہمیں فرسٹ فلور پر میکزین سیکشن میں بھیجا گیا۔ لڑکے نے اشارہ کیا کہ وہ سامنے میکزین ایڈیٹر صاحبہ بیٹھی ہیں۔ عام طور پر خیال آتا ہے کہ ایڈیٹر چاہے نیوز کا ہو، میکزین کا یا پھر گروپ ایڈیٹر ہو وہ صاحب ہوں یا صاحبہ، بوڑھا ہو گا، عینک لگی ہو گی اور عینک کو ناک پر رکھتے ہوئے اس کے اوپر سے گول گول آنکھیں کھماتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کرے گا۔ ہم کرسی پر بیٹھ گئے۔ میرے سامنے ایک مونیٹر پڑا تھا جو لگتا تھا کہ کمپیوٹر کے موجود نہ سب سے پہلے بنایا ہو گا۔

مس سونیہ سلیم میکزین ایڈیٹر تھیں۔ میں نے پہلا سوال کیا جس کے جواب میں انھوں نے کہا کہ صحافی کو ہر خبر اور ہر مضمون پر تحقیق کرنی چاہیے، اسے کرنت ایشور پر زیادہ توجہ دینی چاہیے اور اپنے کام

معلومات ہوتی چاہیں۔ میں ابھی ان خوبیوں کے سیکھنے کے مراحل سے گزر رہا ہوں۔ انھوں نے کہا کہ مجھے اگر موقع ملا تو میں میگزین کی بنیادی باتوں اور انداز (Style) کی طرف خصوصی توجہ دوں گا۔ اپنے میگزین کے علاوہ وقت اخبار کا میگزین پڑھنا پسند کرتا ہوں۔ صحافت چھوڑنے کے حوالے سے انھوں نے کہا، صحافی ایسا کرنے کا سوچ ہی نہیں سکتا۔ آخری سوال کے جواب میں بتایا کہ لوگ غلط سوچتے ہیں۔ اگرچہ زرد صحافت کا کچھ عنصر پایا جاتا ہے لیکن سارے صحافیوں کو تو برا نہیں کہا جاسکتا۔

چھوٹے اخبارات نے صحافیوں کو خراب کیا ہے

نصیر الحق ہاشمی (روزنامہ پاکستان)

روزنامہ پاکستان کے میگزین ایڈیٹر نصیر الحق صاحب سے وقت لینے کے لیے رابطہ کیا تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں۔ دو تین دن بعد بات ہوئی۔ نصیر الحق کی نظر میں میگزین ایڈیٹر کو کرٹ افیئر سے باخبر اور اس کے ساتھ اپنی ذمہ داری کا بھی مکمل احساس ہونا چاہیے۔ ذمہ داری کا مطلب یہ نہیں کہ وہ اپنے کام ٹھیک طرح سے کرے بلکہ اپنے تمام ساتھی جو اس کے ساتھ کام کرتے ہیں، ان کو ساتھ لے کر چلے۔ ایک میگزین ایڈیٹر کو مقامی حالات سے لے کر عالمی معاملات سے بھی آگہی ہونی چاہیے۔ ان کے مطابق سیکھنے کا عمل ایک دن، مہینا یا سال کا نہیں بلکہ انسان ساری زندگی سیکھتا ہے۔ سیکھنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اگر کبھی ایک مرتبہ

غلطی کرے تو اسے دوبارہ کبھی نہ دہرائے۔ میگزین کے انداز کے متعلق بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ اس کی لگ (Look) سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا، سائز (Size) یا لے آؤٹ (Layout) جس طرح کا بھی ہو اندر کا مواد جاندار ہونا چاہیے۔

یادگار واقعہ کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ ایک مرتبہ کئی ایڈیشن میں خمیر جعفری کے حوالے سے ایک فقرہ شائع ہو گیا۔ فقرہ ماضی کا تھا اور حال میں بیان ہو گیا یعنی فقرے کے آخر میں ”تھا“ آنا چاہیے تھا اور وہاں ”ہے“ آ گیا۔ اس بات پر مجھے شامی صاحب نے بلایا اور کہا کہ یہ کیا ہے؟ میں نے جب فقرہ دیکھا تو شرمندہ ہوا۔ میرے چہرے کے تاثرات دیکھ کر شامی صاحب نے کہا، ٹھیک ہے جائیں آپ۔ میں نے بعد میں سوچا کہ یہ غلطی ہونی نہیں چاہیے تھی، اس میں میرا قصور ہے۔ میں شامی صاحب کے پاس واپس گیا اور کہا کہ غلطی میری ہے، اگر آپ مجھے کوئی سزا دینا چاہتے ہیں تو آپ کا حق ہے۔

شامی صاحب نے مجھ سے کہا کہ میرا مطلب آپ کو احساس دلانا تھا۔ آپ کو احساس ہو گیا، یہی کافی ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ واقعہ مجھے جب بھی یاد آتا ہے تو میں حیران ہو جاتا ہوں کہ وہ غلطی ہوئی کیسے تھی؟ دوسرے میگزین کے حوالے سے بات کرتے ہوئے انھوں نے کہا جو سامنے آئے، وہی اٹھا کے پڑھنا شروع کر دیتا ہوں۔ صحافت چھوڑنے کے کئی مواقع آئے جب دل برداشتہ ہو کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا مگر پھر

سوچا کہ میدان سے بھاگنا نہیں چاہیے۔ آخری سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہر شعبے میں کچھ ایسے لوگ ہوتے ہیں جو بلیک میل کرتے ہیں۔ جب سے چھوٹے چھوٹے اخبار آئے ہیں، انھوں نے لوگوں کو رکھا ہی اسی کام کے لیے ہے جس سے بڑے صحافیوں کا تاثر (Image) بھی خراب ہو رہا ہے۔ خبروں میں مک مکا نہیں ہونا چاہیے۔ اس سے خبر کی اصلیت اور اخبار کی مقصدیت ختم ہو جاتی ہے۔

ایک حقیقی صحافی، صحافی پیدا ہوتا، صحافی رہتا اور صحافی ہی مرتا ہے

عامر خا کوانی (روزنامہ دنیا)

آخر میں عامر خا کوانی روزنامہ دنیا کے میگزین ایڈیٹر سے بات چیت ہوئی۔ ان کے مطابق میگزین ایڈیٹر کا ویژن وسیع ہونا چاہیے۔ ایک ویژنری (Visionary) میگزین ایڈیٹر عصری تقاضوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اس بات کا خیال کرتا ہے کہ آج سے دس پندرہ سال بعد میگزین یا جرنلزم میں کیا رجحان (Trend) ہوں گے۔ میگزین ایڈیٹر کو بہت اچھا قاری ہونا چاہیے، جب تک وہ اچھا قاری نہیں ہوگا تب تک وہ اچھا ایڈیٹر ثابت نہیں ہو سکتا۔ میری نظر میں قاری وہ ہے جو میگزین، رسائل، اخبار اور کتابیں خرید کے پڑھتا

ہے۔ میگزین ایڈیٹر میں ایڈیٹنگ کی مضبوط حس ہونی چاہیے۔ کسی قسم کے مضمون کو کیسے انداز میں پیش کرنا ہے اور الفاظ کی کانٹ چھانٹ کے بعد جملوں کی تزئین و آرائش ہی میگزین ایڈیٹر کی محنت کی جھلک دیتی ہیں۔ ان کے مطابق وہ ایک بہت اچھے قاری ہیں۔ اپنے بہترین قاری ہونے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہی میگزین کی نوک پلک سنوار رہے ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ میگزین نکالنے میں مجھے مکمل آزادی ہے لیکن مارکیٹ اور کارپوریٹ کی وجہ سے آزادی کا زیادہ استعمال نہیں ہو پاتا۔ میری نظر میں میگزین میں پڑھا جانے والا مواد زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ پہلے سپاٹ انٹرویو (Spot interview) کا رواج زیادہ تھا۔ میں نے اپنے انداز میں اس کا رخ بدلا، انٹرویو میں باکس بنایا، تصاویر دیں اور سائز مد نظر رکھتے ہوئے قاری کے لیے اسے دلچسپ بنایا۔ میگزین کے سائز کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ میں موجودہ سائز سے مطمئن ہوں۔

خوب صورت یاد کے حوالے سے انھوں نے کہا کہ میں اردو ڈائجسٹ میں تھا تو میں نے سیاحت نمبر نکالا جسے مارکیٹ میں بہت پذیرائی ملی۔ جب اس سیاحت نمبر کی پذیرائی تقریب منعقد ہوئی تو اس وقت میں روزنامہ جنگ میں آچکا تھا۔ چنانچہ مجھے تقریب میں نہ تو بلایا گیا اور نہ ہی میرا نام لیا گیا اور مرے کی بات یہ کہ



عامر خا کوانی (روزنامہ دنیا)

میگزین ایڈیٹر کو بہت اچھا قاری ہونا چاہیے
اسے پیسے خرچ کر کے رسالے اور کتابیں خریدنی چاہئیں



نصیر الحق (روزنامہ پاکستان)

ہر بار حیران رہ جاتا ہوں کہ مجھ سے وہ غلطی کیسے ہوئی؟



فیلڈ مارشل سلام مانک شا

۱۹۴۷ء کی جنگ شروع کرنے سے قبل وزیراعظم اندرا گاندھی، بھارتی دوزا اور جنرل مانک شا کے درمیان سخت مکالموں کی نوبت کیوں آئی؟

ایک لیڈر کی خوبیاں

سیاست دانوں سے لے کر فوجی افسروں تک تمام لیڈروں میں کیسی خصوصیات ہونی لازم ہیں؟

بھارتی فوج کے انوکھے رسم و رواج عیان کرنے والی ایک دلچسپ کتھا
زندگی کے انمول سبق یاد دلانے والی اس تحریر کو بھارت
کے پہلے فیلڈ مارشل مانک شا کے ایک لیکچر سے اخذ کیا گیا

ترجمہ: سید عامر محمود

گیا کہ ہماری نئی نسل ذمے دار اور محنتی نہیں اور اس کی کارکردگی بہت ناقص ہے۔ میری باری آئی تو میں نے حاضرین کو بتایا کہ ہمارے نوجوان پریشان، مایوس اور انتشار کا شکار ہیں۔ انھیں سمجھ نہیں آئی کہ ان کا ملک

کمانڈوز، خواتین و حضرات! مجھے اس اعزاز کا بخوبی احساس ہے جو کالج میں خطاب کرنے سے حاصل ہوا۔ چند دن قبل بھی میں ایک کیمپار میں مدعو تھا۔ اس کا موضوع نئی نسل تھا۔ وہاں کہا

تین رُخے خواب

انسانی دماغ اس قابلیت کے علاوہ کہ وہ اصل جگہیں تخلیق کر لیتا ہے، جدید ٹیکنالوجی ہمیں ایسے ہتھیار مہیا کرتی ہے جس سے تین رُخی اصلی دنیا بنائی جاسکے۔ فوٹو گرافی کی تین رُخی تکنیک جس کا ماحصل ہولوگرام کہلاتا ہے، یہ لیزر شعاعوں کے ذریعے پیدا کیا جاتا ہے۔ ہولوگرام کے ذریعے بنائے ہوئے عکس خلا میں نکلے ہوتے ہیں اور اس عکس کو تمام زاویوں سے دیکھنا ممکن ہوتا ہے۔ آج کل ہولوگرام روزمرہ زندگی کی سرگرمیوں میں عموماً استعمال ہوتے ہیں جیسے قیمتی زیور کی نمائش یا تھیش کی آرائش کی نمائش وغیرہ کے لیے۔ جب تک اسے چھونا یا سوکھنا یہ مطلب نہیں رکھتا کہ یہ واقعی وجود رکھتا ہے۔ خواب میں، مصنوعی فیند کے زیر اثر یہ حقیقت کہ کسی مادے کو دیکھنا، چھونا یا سوکھنا یہ مطلب نہیں رکھتا کہ یہ واقعی وجود رکھتا ہے۔ خواب میں، مصنوعی فیند کے زیر اثر یا جب ہمارے اعصاب مصنوعی طور پر متحرک کیے جاتے ہیں، ہمیں اس صورت حال کی اصلیت کے بارے میں کوئی شبہ نہیں ہوتا۔ مختصر ہمارا دماغ یا زیادہ صحیح لفظوں میں ہمارا ذہن ہمیں ایک دنیا پیش کرتا ہے۔ پھر ہم اس دنیا کے وجود کے بارے میں جس میں ہم رہتے ہیں اور اسے اصل تصور کرتے ہیں پر کیسے یقین کر سکتے ہیں؟ اگرچہ اصل دنیا کے وجود کے بارے میں کوئی سائنسی اور معقول تائید نہیں ہے۔ ہم اس میں کیوں یقین رکھتے ہیں، اس کا انحصار ہمارے روایتی سوچ کے انداز اور پیدائش سے لے کر ہمارا علم حاصل کرنے اور دنیا کے بارے میں ادراک پر ہے۔ ہم اس حقیقت کو تب ہی صاف دیکھ سکتے ہیں جب ہم اپنا ذہن صاف کریں اور تعصب سے پیدا کردہ بندشوں کے بغیر سوچنے کے قابل ہو سکیں۔

(بارون بیکلی)

میں نے بھی کسی سے کچھ نہ کہا۔

پوری ٹیم بھی تھمیں کی حقدار ہے۔ ان ہی کی محنت کی وجہ سے اردو ڈائجسٹ کو مارکیٹ میں اتنی پذیرائی ملی۔

انھوں نے کہا کہ ہفت روزہ میگزین میں سے روزنامہ نئی بات کا میگزین پڑھتا ہوں جب کہ ماہانہ میگزین میں سے اردو ڈائجسٹ کو ترجیح دیتا ہوں۔ انھوں نے کہا اردو ڈائجسٹ سے میرا تعلق ایک تو بہت پرانا ہے دوسرا گزشتہ ایک سال سے اختر عباس کے آنے اور طیب اعجاز قریشی کے ذاتی دلچسپی لینے کی وجہ سے ڈائجسٹ کا رنگ و روپ مزید کھڑ گیا ہے۔ اردو ڈائجسٹ میں ہر ایک ڈیزائن، مضامین کا چناؤ، موضوعات، سائل، لگ ہر چیز میں سلیقہ مندی کا پہلو نظر آتا ہے۔ طیب اعجاز علی وادبی ذہن (Literary mind) کے مالک ہیں۔ جب انھیں موقع ملا تو انھوں نے اردو ڈائجسٹ میں ذاتی دلچسپی لیتے ہوئے اس بلند مرتبہ و مقام پر لا کھڑا کیا۔ جہاں یہ کریڈٹ طیب اعجاز اور اختر عباس کو جاتا ہے، وہاں اردو ڈائجسٹ کی

یہ اس لکچر کا ترجمہ ہے جو فیلڈ مارشل سام مایک شانے ۱۱ نومبر ۱۹۹۸ء کو ڈیفنس سروسز سٹاف کالج، ویلنگٹن میں زیر تربیت فوجی افسروں کو دیا۔ یہ بھارتی فوجی کالج ریاست تامل ناڈو کے قصبہ ویلنگٹن کنڈونمنٹ میں واقع ہے۔ لکچر کا موضوع ”قیادت اور نظم و ضبط“ تھا۔ لیڈروں کی خصوصیات عیاں کرنے والا دلچسپ لکچر اردو میں پہلی بار ترجمہ ہو کر نذر قارئین ہے۔ امرتسر میں ۱۹۱۳ء میں پیدا ہوئے، مایک شاپاری تھے اور ۲۰۰۸ء میں چل بسے۔ ۱۹۶۹ء میں بھارتی بری فوج کے سربراہ بنائے گئے۔ گزشتہ ۱۵ برس میں گو بھارت میں کئی تبدیلیاں آئیں اور وہ ایک ایسی طاقت بھی بن گیا لیکن آج بھی بھارتی عوام اپنے لیڈروں سے خوش نہیں۔ اسی تناظر میں خصوصاً پاکستانی سیاست دان بھی مایک شا کے اس سدا بہار لکچر سے کئی ٹھوس سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ ایسی بنیادی خوبیاں بیان کرتا ہے جو واقعی کم از کم حکمرانوں میں ضرور ہونی چاہئیں۔

سیکورں آفتوں کا نشانہ کیوں بنا ہوا ہے؟
یہ نوجوان جاننا چاہتے ہیں کہ قصور وار کون ہے؟ وہ تو نہیں! جب وہ رات کو پڑھنے لگیں تو بجلی چلی جاتی ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ مجرم کون ہے؟ وہ تو نہیں! وہ غسل کرنے جائیں تو پانی عتقا ہوتا ہے۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کوتاہی کا ذمہ دار کون ہے؟ وہ تو نہیں! وہ تعلیم پانے کے لیے کالج و یونیورسٹیوں میں پہنچیں تو داخلہ نہیں ملتا۔ وہ جاننا چاہتے ہیں کہ مجرم کون ہے؟ وہ تو نہیں! ان کا کہنا ہے کہ بھارت برطانوی تاج کا سب سے چمک دار ہیرا کہلاتا تھا۔ لیکن یہ چمک دار ہیرا کونسل کیسے بن گیا؟
نئی سلسل سیاست دانوں کا یہ روایتی جواب نہیں مانتی کہ یہ خرابیاں ۲۳۰۰ سالہ نوآبادیاتی دور کی پیداوار ہیں۔ وہ ارد گرد دیکھتے اور بتاتے ہیں کہ انگریزوں کو گئے ۱۵۰ برس بیت چکے..... ہمارے رہنماؤں نے کیا کارنامے انجام دیے؟ وہ پھر سنگاپور، ملائیشیا، تانگ کاگ اور انڈونیشیا کی سمت اشارہ کرتے اور کہتے ہیں کہ دیکھو، یہ بھی نوآبادیاں رہے گی بارتی ترقی کی معراج پر جا پہنچی ہیں۔
وہ کئی سے کہتے ہیں کہ جرمنی اور جاپان نے ساڑھے چار سال خونخوار جنگ لڑی۔ وہاں ہزار ہا نوجوان مارے گئے اور صنعتیں تباہ ہو گئیں۔ پھر دشمنوں نے ان ممالک پر قبضہ کر لیا۔ اس کے باوجود دونوں ملکوں کا شمار انتہائی ترقی یافتہ ممالک میں ہوتا ہے۔ چنانچہ بھارتی نئی نسل جاننا

چاہتی ہے کہ ہم ترقی کیوں نہیں کر سکتے؟
اس سوال کا ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اہل رہنما نہیں مل سکے۔
کمانڈر، خواتین و حضرات! مجھے غلط نہ سمجھیے۔ میں صرف سیاسی قیادت کی بات نہیں کر رہا بلکہ ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں چاہے وہ سیاسی ہو یا انتظامی تعلیم ہو یا کھیل، اہل و باصلاحیت رہنما پیدا نہیں ہوئے۔ آپ جہاں بھی دیکھیے، رہنماؤں کا قحط دکھائی دے گا۔
کہا جاتا ہے کہ رہنما پیدا ہوتے یا بنائے جاتے ہیں۔ خواتین و حضرات! ہمارے دیش میں ایک ارب انسان بستے ہیں۔ ہر سال ان میں تقریباً پونے دو کروڑ افراد کا اضافہ ہوتا ہے۔ گویا ہمارے ہاں سالانہ ایک ہاں آسٹریلیا وجود پاتا ہے..... پھر بھی یہاں اہل رہنماؤں کا فقدان ہے۔ چنانچہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ رہنما جنم لیتے ہیں وہ یہی مشورہ دیں گے کہ خاندانی منصوبہ بھاڑ میں جائے سب کو مرضی سے بچے پیدا کرنے دو یوں شاید کبھی نہ گئی اہل رہنما پیدا ہو جائیں۔

اگر اہل رہنما جنم نہیں لیتے تو کیا انھیں بنانا ممکن ہے؟ یہ ا جواب اثبات میں ہے۔ مجھے کوئی بھی ذہین اور ہوش مند مرد یا عورت دیکھیے، میں اسے رہنما بنا دوں گا۔ آج آپ سے اسی موضوع پر باتیں ہوں گی۔
سوال یہ ہے کہ ایک قابل رہنما کی خصوصیات ک

ہیں؟ اس کی پہلی اور بنیادی خوبی یہ ہے کہ اسے پیشہ ورانہ معلومات (علم) اور مہارت میں طاق ہونا چاہیے۔ آپ اتفاق کریں گے کہ کوئی وزیراعظم، صنعت کار یا فیلڈ مارشل کا بچہ بھی ہو تو وہ پیشہ ورانہ معلومات اور مہارت لیے جنم نہیں لیتا۔ یہ خوبیاں سخت محنت اور متواتر مطالعے سے پیدا ہوتی ہیں اور آج جدید و ترقی یافتہ تکنیکی دور میں کوئی بھی سو فیصد پیشہ ورانہ معلومات پانے کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔

ضروری ہے کہ انسان اسے حاصل کرنے میں لگا رہے، لگا رہے، لگا رہے۔ اب ذرا تو قی دفاع اور سیکورٹی کے ذمے دار سیاسی حکمرانوں کی حالت دیکھیے۔ وہ سچ سچ بتائیں، کیا انھوں نے کبھی عسکری تاریخ، حکمت عملی یا تیاری اسلحہ پر کتاب پڑھی؟ کیا وہ بتا سکتے ہیں کہ ایک توپ دوسری سے اور ایک ٹینک دوسرے سے کیونکر مختلف ہے؟ انھیں تو ہر تھیار ایک جیسا بنی نظر آئے گا۔

خواتین و حضرات! پیشہ ورانہ معلومات و مہارت ایک قابل رہنما کا وصف خاص ہے۔ ایک انسان اسی وقت قابل رہنما بن سکتا ہے جب اسے موضوع گفتگو کا بخوبی علم ہو، وہ اپنے پیشے کو پوری طرح سمجھتا ہو اور اس قسم کے رہنما ہمارے ہاں پارس پتھر کی طرح نایاب ہیں۔
گو بھارت میں لیڈروں کی کمی نہیں۔ آپ کہیں بھی نکل جائیے، کسی نہ کسی وی آئی پی کی آمد پر سر مرک بند پائیں گے۔ مگر خواتین و حضرات! یہ رہنما نہیں، یہ رہنماؤں کے گھیس میں چلتے پھرتے عام مرد و خواتین ہیں۔ اور انھیں خود پر شرمندگی ہونی چاہیے۔

اہل قیادت کی دوسری خوبی کیا ہے؟ یہ کہ وہ فیصلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے اور پھر فیصلے کی کلی ذمہ داری قبول کرے۔ آپ نے بھی سوچا کہ رہنما فیصلہ کیوں نہیں

کر پاتے؟ بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ پیشہ ورانہ معلومات و مہارت نہیں رکھتے۔ انھیں ڈر ہوتا ہے کہ فیصلہ غلط ہوا تو نتائج انہی کو بھگتنے پڑیں گے۔

خواتین و حضرات! قانون اوسط (Averages) کی رو سے اگر عام آدمی دس فیصلے کرے تو ۵ درست نکلتے ہیں۔ اگر پیشہ ورانہ معلومات و مہارت رکھنے والا انجام دے تو ۱۰ میں سے ۹ درست ہوتے ہیں اور دسواں فیصلہ بھی عموماً اس کا دست راست یا ماتحت ٹھیک کر لیتا ہے۔

لیکن رہنما اگر فیصلہ ہی نہ کرے تو یہ فاش غلطی ہوگی۔ کام نہ کرنے کا عمل کرنے سے بدرجہا بدتر ہے۔ ایک غلط کام کو درست کرنا تو ممکن ہے لیکن جب عمل ہی نہ ہوا ہو تو اسے کیونکر ٹھیک کیا جائے؟ میں یہ بات ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔

۱۹۹۲ء میں باری مسجد ڈھا دی گئی۔ تب میں وزیراعظم ہوتا تو فیصلہ کر لیتا کہ اس کا انہدام ہر حال میں روکنا ہے۔ یوں ۱۸ کروڑ افراد کی پوری قوم کو نقصان نہ پہنچتا۔ لیکن وزیراعظم نے یہ فیصلہ نہیں کیا چنانچہ اپنے ملک کے ۱۸ کروڑ لوگوں کی نظر میں معتبوب بن گیا۔

جب میں سربراہ فوج تھا تو اکثر اپنے جوانوں سے ملنے جاتا۔ دوران گفتگو عموماً یہ ہوتا کہ وہ کسی فہمائش پر کہنے لگتے ”سر!“ میں سوچ رہا ہوں..... میں نے ابھی ذہن نہیں بنایا، وغیرہ وغیرہ۔ اس روش کے باعث میں نے ”مانک شازم“ (Manekshawism) کی اصلاح ایجاد کر ڈالی۔ خواتین سے یہ الفاظ معذرت، اس کا مطلب یہ ہے: اگر تم انتہائی بے وقوف (Bloody fool) ہو..... تو جلدی سے ہو جاؤ۔“

اس مختل میں بیٹھے سبھی فوجی مستقبل میں اعلیٰ افسر اور

بھارتی وزیر دفاع، کرشنا مینن نے اپنے ایک مشہور ترین جرنیل پر کس قسم کے الزامات لگائے؟

کمانڈر رہیں گے۔ لہذا یاد رکھیے، فیصلہ کیجیے اور جب کر لیں تو پھر اس کی پوری ذمہ داری لیجیے۔ غلطی یا کوتاہی ہونے پر الزام اپنے ماتحت یا ساتھیوں پر نہ دھریں۔

سوال رہنما کی اگلی خوبیاں کیا ہیں؟ وہ ہیں سچائی، قانون پسندی اور انصاف۔ شبہ کوئی بھی ہو، اس کا رہنما سیکڑوں لوگوں سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک آدمی غلطی کر ڈالے تو قدرت تا وہ یہی سوچتا ہے کہ اسے سزا نہیں ملے گی۔ لیکن اس کے سامنے یہ مثال موجود ہو کہ ایسے میں سرکاراں کو بھی سزا ملی جو کسی طاقتور شخصیت کا بیٹا یا پوتا تھا تو وہ خاموشی سے سزا قبول کر لے گا۔ چنانچہ قانون اور انصاف پر عمل کرنا بہت ضروری ہے۔

اسی طرح کوئی جنرل نہیں چاہتا کہ جونیئر اسے پھلانگتا سربراہ فوج بن جائے۔ لیکن پہلے ایسی مثالیں موجود ہوں کہ ایک قابل جنرل نااہل جرنیلوں کو پھلانگتا سربراہ فوج بن گیا اور اس کے وزیر یا بااثر ماسے، چاہے کچھ نہ کر پائے تو وہ جو خوشی حالات کو تسلیم کر لے گا۔

بھارت میں خصوصاً فوجی افسروں پر شدید دباؤ ہوتے ہیں..... حکومت، سپریم افسروں، خاندان، بیوی، بچہ، ماموں، خالہ، چھوٹی اور دوستوں وغیرہ کے دباؤ اور کئی افسرانہیں سہار نہیں پاتے۔ یہی وجہ اہل رہنما کی اگلی خوبیاں..... اخلاقی اور جسمانی جرأت واضح کرتی ہے۔

خواتین و حضرات! میں نہیں جانتا کہ دونوں میں سے کون زیادہ اہم ہے۔ جب میں جوانوں سے گفتگو کروں تو جسمانی دلیری کا ہی ذکر کرتا ہوں۔ لیکن اس محفل میں شہری بھی شریک ہیں لہذا میں اخلاقی جرأت پر زور دوں گا۔ سوال یہ ہے کہ اخلاقی جرأت کسے کہتے ہیں؟

یہ ہے کہ انسان صحیح اور غلط میں تمیز کرنے کی صلاحیت پیدا کر لے۔ چنانچہ وہ ہر موقع پر سچ بولے چاہے ماتحت یا باس کچھ بھی سننا چاہتے ہوں۔ میرے نزدیک ہر بات میں ”جی ہاں“ کہنے والا خطرناک ہوتا ہے۔ ایسا شخص ترقی کر سکتا ہے، شاید اعلیٰ افسر بن جائے۔ وہ جتنی مرضی کامیابیاں پالے لیکن کبھی اہل رہنما نہیں بن سکتا۔ وجہ یہ

ہے کہ سپریم اسے استعمال کریں گے، وہ ساتھیوں کی ہمارے کا نشانہ بنے گا، جب کہ ماتحت اس کو نگاہ نفرت دیکھیں گے۔ غرض ”لیس مین“ بڑا اٹھلا ہوتا ہے۔

میں اپنی زندگی سے اخلاقی جرأت کی ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ ۱۹۶۱ء میں پاک فوج نے مشرقی پاکستان میں فوجی آپریشن شروع کیا تو ہزاروں متاثرہ بنگالی بھتیجے مہاجر بھارت آنے لگے۔ انہی دنوں وزیر خارجہ اندرا گاندھی نے صبح دس بجے ایک میٹنگ بلائی۔ اس میں وزیر خارجہ سردار سورن سنگھ، وزیر دفاع جگ جیون رام وزیر زراعت فخر الدین علی احمد اور وزیر خزانہ ییشنوت شریک ہوئے۔ مجھے بھی حاضر ہونے کا حکم ملا۔

خواتین و حضرات! فیڈ مارشل بننے اور نکالے جانے کے درمیان بال سے بھی زیادہ باریک فرق ہے۔ اندرا گاندھی بہت غصے میں تھیں۔ انھوں نے ہر مغربی بنگال، آسام اور تری پورہ کے وزرائے اعلیٰ کی جانب سے آنے والے پیغام پڑھ کر سنائے۔ سب کا یہ رونا تھا کہ ہزار ہا مہاجرین آچکے، بتاؤ اب ہم کیا کریں؟ وزیر اعظم سب سے پہلے میری طرف مڑیں اور بولیں ”میری خواہش ہے کہ آپ کچھ کریں؟“

میں نے کہا ”آپ مجھ سے کیا کرنا چاہتی ہیں؟“ ”یہ کہ ہماری فوج مشرقی پاکستان میں داخل ہو جائے“ میں نے کہا ”آپ کو کلم ہے کہ اس کا مطلب جنگ ہے وہ بولیں“ اگر جنگ ہوئی ہے تو یہی کہی۔

تب میں نے اپنے روایتی منہ پھٹ انداز میں بول دیا ”وزیر اعظم صاحب! آپ نے بائبل پڑھی ہے؟“ ”یہ سن کر وزیر خارجہ سورن سنگھ پنجابی میں بولے ”اے بابا کتھوں آگئی؟“ (یہ بائبل سچ میں کہاں سے ٹپک پڑی؟) میں نے کہا ”اس پہلی کتاب کے پہلے باب

پہلے پیرا گراف کا پہلا جملہ یہ ہے: خدا نے کہا، روشنی جائے اور روشنی ہو گئی۔ لیکن آپ نے اسے الٹا کر دیا اور کہا کہ جنگ ہو جائے اور جنگ چھڑ گئی۔ آپ لوگ کیا سمجھتے ہیں؟ کیا ہم جنگ کے لیے تیار ہیں؟ ذرا فک

پر تو نظر ڈالیے..... آج ۲۸ اپریل ہے۔ غمگین ہمالیہ کے درے کھل جائیں گے۔ اگر چینیوں نے بھی حملہ کر دیا تو ہمیں دو محاذوں پر لڑنا پڑے گا۔ سردار سورن سنگھ پھر پنجابی میں گویا ہوئے ”کیا چین حملہ کر دے گا؟“

میں نے کہا ”آپ وزیر خارجہ ہیں، آپ بتائیے؟“ میں پھر وزیر اعظم کی طرف مڑتے ہوئے بولا ”وزیر اعظم صاحب! گزشتہ سال آپ کی خواہش تھی کہ مغربی بنگال کے انتخابات میں کیونٹ جیتنے نہ پائیں۔ چنانچہ آپ نے فرمائش کی کہ میں ریاست کے ہر گاؤں اور قصبے میں فوجی کھڑا کر دوں۔ میرے پاس وہاں ۲۵۰۰ فوج ہیں۔ لہذا بھاری ہتھیاروں کے بغیر تمام فوجی پوری ریاست میں پھیلادے۔“

”فوجیوں کی اکثریت اب بھی مغربی بنگال میں پھیلی ہوئی ہے۔ انھیں سکنا کرنے اور فارشین بنانے میں کم از کم ایک ماہ لگے گا۔ مزید برآں ہمارا ایک ڈویژن آسام، دوسرا آندھرا پردیش اور تیسرا بکتر بند ڈویژن راجھستان میں ڈیرا ڈالے بیٹھا ہے۔ انھیں بھی واپس لانے میں ایک ماہ لگے گا۔ جب ضروری ہوگا کہ میں ہر سڑک، ہر ریل، ہر ٹرک اور ہر وگین استعمال کروں۔ لیکن ابھی پنجاب، ہریانہ اور اتر پردیش میں فصلوں کی کٹائی جاری ہے۔ ایسے حالات میں آپ کی فصل کاٹی نہیں جاسکتی۔“

میں پھر وزیر زراعت، فخر الدین علی احمد کی سمت مڑا اور کہا ”اگر بعد میں ملک قحط کا نشانہ بنا، تو مجھے الزام نہ دینیے گا۔“ پھر میں نے ایک انکشاف کیا ”ہمارے بکتر بند ڈویژن میں صرف ۱۳۰۰۰ ٹنک قابل استعمال ہیں۔“

میرے دوست وزیر خزانہ ییشنوت راؤ نے ترنت پوچھا ”سام! صرف ۱۳۰۰۰ ٹنک کیوں؟“

”کیونکہ تم وزیر خزانہ بنے بیٹھے ہو۔ میں گزشتہ ڈیڑھ سال سے ٹنک مرمت کرانے کے لیے پیسے مانگ رہا ہوں اور تم مسلسل کہتے رہے کہ جب خالی ہے۔ یہ وجہ ہے۔“

میں پھر وزیر اعظم کی طرف مڑا اور بولا ”محترم! ماہ اپریل اختتام پہ ہے۔ جب تک ہماری تیاریاں مکمل ہوں، مشرقی پاکستان میں مون سون کی بارشیں شروع ہو جائیں گی اور جب وہاں بارشیں ہوں تو محض بارش نہیں ہوتی بلکہ وہ برقی ہیں۔ دریا، سمندر بن جاتے ہیں۔ اگر آپ ایک کنارے پر کھڑے ہوں تو دوسرا کنارہ نہیں دیکھ سکتے۔ پورا ملک زیر آب آجاتا ہے۔ چنانچہ ہماری نقل و حرکت صرف سڑکوں تک محدود ہو گئی۔ فضا بھی ہماری مدد نہیں کر سکتی۔ لہذا اگر آپ کی خواہش ہے کہ میں مشرقی پاکستان میں داخل ہو جاؤں تو مجھ سے اپنی شکست کی ۵۰۰ فیصد ضمانت لے لیجیے۔“

خواتین و حضرات! میں نے کسی عورت کو کم ہی اتنی طیش زدہ دیکھا ہے اور اس میں میری بیوی بھی شامل ہے۔ وزیر اعظم صاحب کا چہرہ لال چقدر ہو گیا۔ میں نے دل میں کہا ”اب جو ہوا، دیکھا جائے گا۔“ وہ کچھ لمحے خاموش رہیں پھر گویا ہوئیں: آج شام ۴ بجے کا بینہ کا اجلاس دوبارہ ہوگا۔“

کبھی باہر جانے لگے۔ چونکہ میں جونیئر تھا لہذا آخر میں نکلا۔ جیسے ہی قدم بڑھا، وہ بول اٹھیں ”چیف، آپ ذرا رکھیے۔“

میں نے انھیں بغور دیکھا اور کہا ”وزیر اعظم! اس سے قبل کہ آپ کچھ کہیں، بتائیے میں استعفیٰ دینی صحت کے حوالے سے دوں یا جسمانی؟“

وہ بولیں ”ارے نہیں سام، بیٹھ جاؤ۔ یہ بتاؤ، کیا تم نے سب کچھ سچ بتایا؟“

۱۹۶۲ء کی بھارت۔ چین جنگ میں بھارتی فوج کیونکر شکست کھا گئی؟

”جی ہاں، سچ بولنا میری ذمہ داری ہے۔ یہ میری ڈیوٹی ہے کہ لڑو، ہارنے نہیں جیتنے کے لیے۔“

وہ مسکرائیں اور کہنے لگیں ”ٹھیک ہے سام! تم جان چکے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ تم کب تک تیار ہو گے۔“

میں بولا ”وزیر اعظم صاحب! ابھی میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ لیکن اگر آپ مجھے آزادی سے منصوبہ بنانے دیں، تیاری کی خاطر وقت دیں اور ایک وقت معین کریں تو میں آپ کو فتح کی سو فیصد ضمانت دے سکتا ہوں۔“

سو خواتین و حضرات! فیلڈ مارشل بننے اور نکالے جانے کے درمیان بال سے بھی زیادہ باریک فرق ہے۔ اب اخلاقی جرأت کی کمی عیاں کرنے والی مثال دیکھیے۔

۱۹۶۲ء میں جب چین سے ماہ دبسمبر میں جنگ چھڑی تو وزیر اعظم پنڈت نہرو نے آری چیف کو بلایا اور کہا ”میں چاہتا ہوں کہ چینیوں کو نکال باہر کرو۔“

آری چیف میں اتنی اخلاقی جرأت نہیں تھی کہ سچ بولتا اور بتاتا ”میں ابھی تیار نہیں، ہماری فوج بکھری پڑی ہے، اس کے پاس اسلحہ نہیں۔“ چنانچہ اس نے وزیر اعظم کا حکم تسلیم کر لیا۔ نتیجہ ہماری فوج کو شکست ہوئی اور ملک کو ذلیل ہونا پڑا۔

لہذا اخلاقی جرأت کو ہمیشہ یاد رکھیے۔ بحیثیت فوجی افسر مستقبل میں آپ کو کئی مشکلات اور رکاوٹوں سے پالا پڑے گا۔ لوگ آپ سے ہر قسم کی فرمائش کریں گے۔ تب آپ میں اتنی اخلاقی جرأت ہونی چاہیے کہ کھڑے ہوں اور حقائق سامنے لائیں۔ میں پھر بتاتا چلوں، ”لیس مین“ خطرناک انسان ہوتا ہے۔

اب دوسری خوبی، جسمانی جرأت کی طرف آئیے۔ بھوک اور جھن کے مانند خوف بھی قدرتی جذبہ ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ وہ کبھی خوفزدہ نہیں ہوا، جھوٹا ہے یا گورکھا! تاہم خوفزدہ ہونا ایک بات ہے، خوف دکھانا مختلف امر..... اگر کبھی افسر جوانوں کے سامنے خوفزدہ ہوا تو وہ کبھی کمائڈ نہیں کر سکتا۔ جب جسم لرزے، دل دھڑکے اور بدن کانپے بھی انکشاف ہوتا ہے کہ حقیقی رہنما کون ہے

اور ڈھکوسلا کون!

معذرت چاہتا ہوں لیکن اپنی زندگی سے ایک مثال پیش ہے۔ یاد رہے، میں بہادر آدمی نہیں بلکہ خوفزدہ رہتا ہوں۔ مجھے جنگی جانوروں اور بھوت سے خوف آتا ہے۔ اگر رات کو نیم مجھے ڈراؤنی کہانی دے تو تادیر سو نہیں پاتا۔

دوسری جنگ عظیم کی بات ہے، میں اس فرنٹ پر رجنٹ میں تعینات تھا جو اب پاکستان کا چل چلا جاپانیوں سے نبرد آزما تھا۔ انھوں نے ہمارے کئی جوان مار ڈالے۔ میں ایک سکھ کمپنی، چارلی کمپنی کا کمانڈر تھا۔ تیپ فرنٹ پر فورس رجنٹ پھان اور سکھ کمپنیوں پر تھی۔ چنانچہ میں، نوجوان مجر مانک شا، ایک سکھ کمپنی کمان کر رہا تھا۔ ایک دن جنگ ٹھنڈی پڑی تو فیصلہ ہوا کمپنیوں کی تنظیم نو ہونی چاہیے۔ بعض جوانوں کو ترقی دے گا بھی پروگرام بنا۔

پروٹون کانسٹنٹس میں کمانڈنگ افسر نے مجھے کہا ”تمہاری کمپنی میں خاصے جوان ہلاک ہو چکے۔ لہذا ضر ہے کہ بچے کچھ جوانوں کو اگلے عہدے پر تعینات کیا جائے۔ صورت سکھ سینیئر فوجی ہے۔ اسے ناک بنا دیا جائے؟“

اب یہ صورت سکھ کمپنی کا سب سے بڑا مدعا تھا یہ دو تین بار پہلے بھی ناک بنا تھا۔ لیکن پھر پٹیاں اتر کر کے لیے اسے کرل کے سامنے مارچ پاسٹ کرنا چنانچہ میں نے کہا ”سر! کوئی فائدہ نہیں۔ اسے ناک تو جلد یا بدیر مجھے آپ کے سامنے کھڑا کرنا پڑے گا۔“

اس کو ایک طرف کر دیا گیا۔

کانفرنس ختم ہوئی تو میں نے کھانا کھایا اور اپنی میں چلا آیا۔ سکھوں کو جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کرنے والی قوم ہے۔ ہر وقت باتیں کرتے، لطیفے اور ہنستے رہتے ہیں لیکن جب میں کمپنی پہنچا تو خلاف وہاں خاموشی طاری تھی۔ میں نے اپنے نائب، صوبہ بلونت سنگھ سے مازا پوچھا۔ وہ بولا ”سر! حالات خراب ہیں۔ صورت سکھ بہت غمے میں ہے۔ اس-

کو بتایا ہے کہ آج وہ آپ کو گولی مار دے گا۔“

صورت سکھ مٹھن کن چلاتا اور ہر وقت اپنے پاس بھری پستول رکھتا تھا۔ پتا چلا کہ صوبے دار نے اس سے پستول لی اور اسے قید کر دیا ہے۔ میں نے کہا ”اسے میرے سامنے پیش کرو۔“ چنانچہ میرے سامنے مقدمہ چلا۔ الزام بڑھ کر سنا گیا..... اس نے دوران جنگ اپنے کمانڈر کو قتل کرنے کی دھمکی دی۔ اس جرم کی سزا موت تھی۔

جب گواہ اپنے بیان دے چکے، تو میں نے صورت سکھ کا پستول مانگا جو مل گیا۔ میں نے پستول لوڈ کی، صورت سکھ کے پاس پہنچا، اسے ہتھیار تھمایا اور پوچھا ”میں کہا ”تم مجھے گولی مارنا چاہتے ہو۔ کیا تم میں اتنی ہمت ہے؟ آؤ مارو مجھے!“

اس نے ہتھوں کی طرح مجھے دیکھا اور پھر گولہ گزرا ”گاہ“ (نہیں صاحب، غلطی ہو گئی، معاف کر دو۔“

میں نے اسے زوردار طمانچہ رسید کیا اور دھاڑا ”دفع ہو جاؤ، کس ڈمس۔“

تھوڑی دیر بعد میں حسب معمول کمپنی کا جائزہ لینے نکل گیا۔ اس وقت کی خبریں آن واحد میں سب جوانوں تک پہنچ چکی تھیں۔ میں گھوما پھرا، جوانوں سے باتیں کیں اور پھر شام کو میں چلا گیا۔ واپس آیا تو صوبے دار بلونت سنگھ مجھے دیکھتے ہی بھاگا آیا اور بولا ”صاحب! آپ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی۔ صورت سکھ آج رات آپ کو مار ڈالے گا۔“

میں نے کہا ”اچھا! صورت سکھ کو مار ڈالو۔“

وہ آیا، تو میں نے اسے حکم دیا ”صورت سکھ! آج رات تو میرے تہو پر پہرا دے۔ کل صبح ۶ بجے میرے لیے ایک مگ چائے اور شیبو کے لیے ایک مگ پانی لے آنا۔“ یہ کہہ کر میں اپنے چھوٹے سے خیمے میں چلا گیا۔

خواتین و حضرات! میں ساری رات نہیں سو سکا اور جاکر صبح ۶ بجے صورت سکھ میرے لیے چائے اور شیبو کا پانی لے آیا۔ پھر جب تک جنگ جاری رہی وہ پلے کے مانند میرے آگے بیٹھ پھر تا رہا۔ لہذا میں اپنے جوانوں کے سامنے خوفزدہ ہوتا تو انھیں بھی صحیح طرح کمان نہیں کر پاتا۔

میں صورت سکھ سے خوفزدہ تھا، بہت زیادہ خوفزدہ! لیکن جوانوں کے سامنے اپنا خوف عیاں نہیں کیا۔ آپ لوگ، جنھیں مستقبل میں کمانڈر بننا ہے، یہ بات یاد رکھیں کہ کبھی اپنا خوف ظاہر نہ کریں۔ یہ تھا جسمانی جرأت کا ذکر! لیکن پلیر، میرا یقین کریں، میں بہادر نہیں ایک خوفزدہ انسان ہوں۔

اب قیادت کی اگلی خوبی، وفاداری پر بات ہو جائے۔ خواتین و حضرات! ہم سب دوسروں سے وفاداری کی توقع کرتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آپ بھی وفاداری دیتے ہیں؟ دراصل وفاداری سہہ جتنی پہلو رکھتی ہے..... آپ وفاداری کی توقع رکھتے ہیں تو لازماً اپنے ساتھیوں اور ماتحتوں کو بھی وفاداری دیتے ہیں۔

مرد اور عورتیں زیادہ تعداد میں ہوں تو ان سے معاملات طے کرنے میں کئی مشکلات پیش آتی ہیں۔ لیڈر کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہر مشکل اور رکاوٹ کا فوری سامنا کرے۔ کوئی اتھقانہ عذر قبول نہ کیجئے، مگر یاد رکھیے کہ مرد و عورتیں کئی مسائل رکھتے ہیں۔ مثلاً کوئی بیمار ہوتا تو کسی کا قریبی عزیز چل بستا ہے۔ کوئی مقروض تو دوسرا گھریلو جھگڑوں میں گرفتار رہتا ہے۔ کسی کی بیوی بھاگ جاتی ہے تو کسی کا شوہر دوسری شادی کر لیتا ہے۔ چنانچہ عام لوگ مسائل کے باعث جلد پشمرہ ہو کر حوصلہ ہار بیٹھتے ہیں۔

ایک حقیقی رہنما وہی ہے جس مزاج بھی رکھے۔ وہ ماتحتوں سے گپ شپ لگائے اور ان کی ہمت بندھائے تاکہ وہ عالم مایوسی سے نکل سکیں۔ بد قسمتی سے قدرت نے ہمارے لیڈروں کو یادہ گونی کا تھوہ تو عطا کیا مگر وہ جس مزاج نہیں رکھتے۔ لہذا یہ بات بھی یاد رکھیے۔

خواتین و حضرات! لیڈر شپ یا قیادت کی بنیادی خوبیاں آپ کے سامنے آچکی۔ لیکن حقیقت ہے کہ اہل ترین قیادت بھی آجائے تو وہ ہمیں مسائل کی اس دلدل سے نہیں نکال سکتی، جس میں ہم پھنس چکے۔ دلدل سے نکلنے کے لیے دراصل ہمیں ڈسپلن یا نظم و ضبط کی ضرورت ہے۔ ہم بھارتی دنیا کی سب سے غیر منظم قوم ہیں۔ چنانچہ

آپ کو معاشرے میں بدظنی کے جا بجا مظاہرے ملیں گے۔ سڑکوں پر نکل جائیے، لوگ سر راہ فارغ ہونے میں محو ہوں گے۔ ون وے کی خلاف ورزی عام ہے۔ ہر دوسری گاڑی زہریلا دھواں نکالتی ہے۔ اخبار اٹھائیے، وہ ٹکس و غارت و لوٹ مار کی خبروں سے بھرا ہوگا۔ چونکہ ہم دنیا کی سب سے بے ضبط قوم ہیں لہذا ہمیں نظم و ضبط کی اشد ضرورت ہے۔ یہ نظم و ضبط کیا شے ہے؟ براہ مہربانی جب میں ڈپلن کی بات کروں تو اسے ملٹری ڈپلن نہ سمجھیے، یہ ایک مختلف چیز ہے۔ نظم و ضبط کی آسان تشریح یہ ہے کہ معاشرے میں کبھی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ مہذب اور شائستہ انداز میں پیش آئیں۔

سوال یہ ہے کہ یہ انداز کون متعین کرتا ہے؟ وزیراعظم نہیں، نہ کابینہ اور نہ ہی افسران بالا!..... نظم و ضبط کے بہترین اصول ہماری آسمانی کتب میں درج ہیں..... یہ تو ریت، انجیل، وید اور محمد (ﷺ) اور ان تک کی تعلیمات میں ملیں گے۔ یہ باپ سے بیٹے اور ماں سے بچے کو منتقل ہوتے ہوئے ہزاروں سال میں ہم تک پہنچے۔ مسلخ افواج کے سوا کہیں بھی انہیں لاگو نہیں کیا جاتا۔ مسلخ افواج میں پابندی وقت کی عدم موجودگی ڈپلن اور شائستہ زندگی کے لیے نہایت نقصان دہ بھی جاتی ہے۔

ڈپلن کی اہمیت اجاگر کرنے والا ایک اور واقعہ پیش ہے۔ چند برس قبل مجھے مع بیگم کے ایک یونیورسٹی کنونشن میں بلایا گیا۔ مجھے ۴ بجے یونیورسٹی پہنچنا تھا۔ میں بیگم کو شاف کار میں بروقت بٹھانے میں کامیاب رہا، آخر صبح گیارہ بجے سے ان کے پیچھے تھا، ڈارلنگ! بھولنا نہیں، ہمیں وقت پر پہنچنا ہے، لباس عمدہ پہننا، ہمیں فلاں وقت روانہ ہونا ہے۔“ غرض میں نے انہیں کار میں بٹھا لیا۔

ڈرائیور سے کہا ”تھوڑا آہستہ، تھوڑا جلدی“، یوں ہم ۴ بجے یونیورسٹی پہنچ گئے۔ وائس چانسلر نے اپنی بیگم کے ساتھ ہمارا استقبال کیا۔ کنونشن ہال پہنچے تو چوتھے پر تشریف فرما ہوئے۔ وائس چانسلر نے پہلے تقریر کی اور میری خوبوں کے گائے۔ کنونشن میں تقریباً ۲۰ ہزار لڑکے، لڑکیاں شریک تھے۔ ایک طرف ڈین، پروفیسر اور پیکچرار صفوں براجمان دکھائی دیے۔

آخر مجھے خطاب کرنے کی دعوت ملی۔ میں جس مائیک کی طرف بڑھا، تو وائس چانسلر نے راہ میں رکھا، میرے کان میں سرگوشی کی ”فیلڈ مارشل صاحب! گزرتے ہفتے ہمارے فنکشن میں فی دہلی سے ایک وزیر آئے تھے۔ طلبہ و طالبات کے سامنے صرف ۲۰ سیکنڈ ہی لک سکے مجھے امید ہے کہ آپ کا تمنا نہیں لگے گا۔“ مائیک کی سر بڑھتے ہوئے میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا، وائس چانسلر خط میں یہ بات بھی لکھ دیتے، تو شاید میں یہاں نہ آتا۔ بہر حال میں ڈاکس پہ پہنچا اور مقررہ وقت ۴ بجے تک بولتا رہا۔ اس دوران ہال میں اتنی خاموشی چھائی کہ سوئی بھی گرتی تو آواز آتی۔ میرا لیکچر ختم ہوا تو ڈاکس شاندار داد ملی۔ وائس چانسلر، ڈین، پروفیسر، پیکچرار، لڑکیاں حتیٰ کہ میری بیگم استادہ ہوئی اور میری تعریف تالیاں بجا لیں۔

تقریب اختتام کو پہنچی تو ہم چائے پینے باغ میں آئے۔ وہاں رنگ و نور کا سیلاب آیا ہوا تھا۔ چار طرف خوبصورت و پرکشش لڑکے، لڑکیاں محو گفتگو میں بھی ایک حسینہ سے باتیں کرنے لگا اور اس سے پوچھا ”مائی ڈیئر، آپ طلبہ مجھ پر اتنے مہربان کیوں رہے

میں کوئی عظیم مقرر نہیں اور نہ ہی ایسا بھجپن جیسا حسن رکھتا ہوں۔ جب کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ گزشتہ دنوں آپ نے نئی دہلی سے آنے والے ایک وزیر کی بہت بھداڑائی۔“ حسینہ گلی لپٹی رکھے بغیر بولی ”اوہ، وہ فضول آدمی! ہم نے اسے بتایا تھا کہ ۴ بجے پہنچ جانا۔ وہ آدھ گھنٹہ دیر سے پہنچا اور اپنے ساتھ پوتا پوتی بھی لے آیا۔ وائس چانسلر نے مع بیگم کے اس کا استقبال کیا۔ جب ہماری اسٹوڈنٹ یونین کے صدر نے اسے ہار پہنایا تو ضد کرنے لگا کہ اس کے پوتے پوتی کی بھی ہار پوٹی ہوئی چاہیے۔ آخر جو بار دیگر مہمانوں کے لیے تھے۔“ وہ بچوں کے گلے میں ڈالنے پڑے۔

”وائس چانسلر پھر وزیر موصوف کے قصیدے پڑھنے لگے۔ بتایا کہ اس نے ملک کی خاطر یہ قربانیاں دیں اور جیل بھی گیا۔ میرا دل چاہا کہ چیخ کر کہوں، اسے اب بھی وہیں رہنا چاہیے۔ دوران تقریر وزیر دھوتی اٹھا کر اپنی کمریہ تان لیں کھجاتا رہا۔“ بہر حال وائس چانسلر نے اسے خطاب کی دعوت دی۔ وہ اٹھا، مانگ تک پہنچا اور ہم سے کچھ یوں خطاب ہوا: ”لڑکے لڑکیو! میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ اسی لیے تقریر نہیں لکھ سکا۔ پھر بھی اپنے سیکرٹری سے لکھوا لی تھی۔ اب وہی پڑھوں گا۔“ یہ سننا تھا کہ ہم سب اس پر آواز سے کہنے لگے اور اس کو بھگا کر دم لیا۔“

خواتین و حضرات! آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ڈپلن سے میری کیا مراد ہے؟ وزیر موصوف پابندی وقت کرتا اور پوری تیاری سے آتا تو یقیناً ۲ ہزار طلبہ و طالبات اسے داد و تحسین سے نوازتے۔ لیکن اس نے بدظنی کا مظاہرہ پیش کیا تو مزید بے عظمتی نے جنم لیا۔

یہ میری خوش قسمتی ہے کہ میں نے زندگی کا طویل عرصہ فوج میں گزارا، وقت پر یونیورسٹی پہنچنا، موزوں لباس زیب تن کیا، ایسی دھوتی نہ پہنی جو میری کمریہ تان لیں رہنے کرتی اور یوں حاضرین کی نازک طبیعت پر گراں گزرتی۔

تو خواتین و حضرات! امید ہے آپ نظم و ضبط کو خوب سمجھ چکے۔ ہم دنیا کی سب سے غیر منظم قوم ہیں۔ گو آپ سب نے اب تک زبردست ڈپلن دکھایا۔ کیا آپ مزید دو منٹ کے لیے مجھے برداشت کر لیں گے؟

لیڈر شپ اور ڈپلن کے بعد اب میں کردار (کرکٹر) پر بولنا چاہوں گا۔ ہم بھارتیوں میں یہ بھی عنقا ہے۔ یہ واضح رہے کہ دیانت دار، شریف اور راست باز ہونا ہی کردار نہیں، بلکہ اس کے یہ بھی معنی ہیں کہ آپ خود سے خوب واقف ہوں..... اپنی خامیاں جانے، کوتاہیاں پہچانے اور سمجھے کہ ہمارے دوست، پرستار ”لیس مین“ اور خوشامدی، بھی سچی کرتے ہیں کہ اس کردار کو کمزور و ناکارہ بنا سکیں۔ میں ایک مثال سے یہ بات سمجھاتا ہوں۔

چند سال قبل ایک ہالی وڈ ڈائریکٹر نے فیصلہ کیا کہ مشہور اطالوی وائلن نواز اور موسیقار، پاگانینی کی زندگی پہ فلم بنائی جائے۔ پاگانینی کا کردار ایسے اداکار کو ملا جو وائلن بجا لیتا تھا۔ پھر بھی وائلن نوازوں نے اسے تربیت دی اور اس پہ وقت لگایا۔ چنانچہ فلم ”کاڈیزہ“ (Cadenza) ریلیز ہوئی تو اس نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے اور اسے ہر لحاظ سے شاہکار سمجھا گیا۔

بعد ازاں اخبارات میں فلم پر تبصرے ہوئے تو اداکار کی اداکاری کو خوب سراہا گیا۔ اس کی تعریفوں کے پل باندھے گئے۔ اب اداکار کے پرستار، ”جی حضور“ اور خوشامدی اسے یہی بتانے لگے کہ وہ دور جدید کا پاگانینی بلکہ موزارٹ ہے۔ نتیجتاً اس کا دماغ خراب ہو گیا۔ اسے پھر اپنے فوری ذہنی سے چھٹکارا پانے کی خاطر ۸ ماہ علاج کرانا پڑا اور کمانڈرز، آپ کو علم ہے کہ میں بھی اس خطبہ میں مبتلا رہا؟

۱۹۷۱ء میں پاکستان سے جنگ ۱۳ دن میں ختم ہوئی اور ۹۳ ہزار پاکستانی قیدی بنا لیے گئے۔ تب میرے پرستار، ”لیس مین“ اور خوشامدی میرا موازنہ رومیل و فیلڈ مارشل الیگزینڈر سے لے کر جنرل ایچن لک تک سے کرنے لگے۔ جب میں واقعی خود کو ”مہمان“ سمجھنے لگا تو

یونیورسٹی کے کنونشن میں طلبہ و طالبات نے ایک بھارتی وزیر کی کیسی گت بنائی؟

وزیر اعظم نے مجھے فیملڈ مارشل بنایا اور سامان بندھوا کر یہاں (پلنگٹن، ڈینٹس کالج) بھجوا دیا۔ یوں ایک نفسیاتی کلینک اپنے مہمان سے محروم ہو گیا جسے بھارت میں ہم پاگل خانہ بھی کہتے ہیں۔
آپ سب کا بہت بہت شکریہ۔

سوال و جواب کا مرحلہ

(جنرل مانک شا کی تقریر ختم ہوئی تو حاضرین نے ان سے مختلف سوال پوچھے۔ ان میں سے چیدہ چیدہ نذر قارئین ہیں۔)

س: ۱۹۶۲ء کی چین، بھارت جنگ میں آپ کہاں تھے؟ کیا اس پوزیشن میں تھے کہ کچھ کر پاتے؟
ج: میں ۱۹۶۲ء میں بے تو قیری کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ میں اس کالج کا سربراہ تھا۔

دراصل وزیر دفاع کرشنا مینن مجھے سخت ناپسند کرتے تھے۔ تب کے چیف آف جنرل سٹاف، جنرل کول کی نگاہوں میں بھی میں ٹھٹکتا تھا۔ چنانچہ کالج بھجوا کر یوں میری بے عزتی کی گئی۔ کرشنا مینن نے میرے خلاف کئی الزامات تخلیق کیے تھے، میں چند ہی کا ذکر کروں گا۔

شاید آپ کو یاد ہو، ۱۹۶۰ء میں جنرل تھیمیا بری فوج کے سربراہ تھے۔ ان کا کسی بات پر کرشنا مینن سے اختلاف ہوا تو انھوں نے اپنا استعفیٰ بھجوا دیا۔ وزیر اعظم چنڈ نہرو کے اصرار پر جنرل نے استعفیٰ واپس لے لیا۔ ارکان پارلیمنٹ بھی کرشنا مینن کے خلاف تھے لہذا اس معاملے میں انھیں اور وزیر اعظم کو خاصی تنقید برداشت کرنی پڑی۔ وزیر اعظم نے پارلیمنٹ میں بیان دیا ”مجھے سمجھ نہیں آتی، جنرل تھیمیا یہ کیوں کہتے ہیں کہ وزارت دفاع فوج کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے۔ اب جنرل مانک شا کا معاملہ ہی لیجیے۔ سلیکشن بورڈ نے ۲۳ افسروں کو نظر انداز کرتے ہوئے انھیں لیفٹیننٹ جنرل بنا دیا۔ حکومت نے یہ فیصلہ قبول کر لیا۔“

اس وقت میں کالج کا کمانڈر بن چکا تھا۔ وزیر اعظم کو

علم نہ تھا کہ مجھے لیفٹیننٹ جنرل بنانے کے بجائے کرشنا مینن نے مجھ پہ ۱۰ الزامات توپ دیے تھے۔ مثلاً یہ کہ میں صدر بھارت سے زیادہ ملکہ برطانیہ کا وفادار ہوں، بھارتی سے زیادہ برطانوی ہوں۔ ایک الزام یہ لگا کہ میں کالج میں ایسا کوئی استاد نہیں چاہتا جس کی بیوی ”آیا“ نظر آئے۔ غرض مجھ پر بڑے بڑے الزامات لگائے گئے۔

۱۸ ماہ تک میری ترقی رکی رہی۔ تب الزامات کی چھان بین کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنی۔ ۳ لیفٹیننٹ جنرل کمیٹی کے رکن تھے۔ انھوں نے مجھے ہر الزام سے بری کر دیا۔ فائل پھر وزیر اعظم کے پاس گئی۔ انھوں نے کیبنٹ سیکرٹری کو بھجوائی۔ کیبنٹ سیکرٹری نے اس پر لکھا ”اگر جنرل مانک شا کو کچھ ہوا تو نیا ڈرملش (فرانس) کیس جنم لے سکتا ہے۔“ چنانچہ فائل پھر وزیر اعظم کے پاس پہنچی۔ انھوں نے اس پر لکھا ”اب علم جاری کر دیا جائے۔“

گویا اب میں لیفٹیننٹ جنرل بن سکتا تھا۔ خواتین و حضرات! پروانہ ترقی کے بجائے مجھے ایڈجوئنٹ جنرل کا یہ خط موصول ہوا کہ وزیر دفاع کرشنا مینن نے ریکارڈ کرنے کی خاطر جنرل مانک شا کے خلاف سخت کلمات بھجوائے ہیں۔ میں نے ایڈجوئنٹ جنرل کو جواب بھجوا دیا کہ اگر وہ فحش کلمات بھی ہیں تو ریکارڈ کیے جائیں۔ چنانچہ وہ آج بھی میری مسل کارکردگی (Dossier) میں درج ہیں۔

اور پھر چینی میری مدد کو آپہنچے۔ چینیوں سے مار پڑی تو کرشنا مینن رخصت ہوئے۔ جنرل کول بھی نکالے گئے اور چنڈ نہرو نے مجھے بلوایا۔ انھوں نے کہا ”جنرل! ہمارا مقابلہ ایک جوشیے دشمن سے ہے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ ایک جوشیے جرنیل ہیں۔ کیا آپ میدان جنگ پہنچ کر کمان اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں؟“

میں نے دل میں کہا ”اپن تو ۱۸ ماہ سے اس خوش خبری کا منتظر ہوں۔“ چنانچہ میں نے چینی حاذ پر اپنے جواؤں کی کمان سنبھال لی۔ لہذا ۱۹۶۲ء میں کسی شمار قطار میں نہ تھا۔ بلکہ ۱۸ ماہ تک ملزم رہا اور مجھ پہ مقدمہ

چلا۔ مگر میں بچ گیا۔ لہذا مجھے تو چینی بہت پسند ہیں۔ سن: گزشتہ ۵۰ برسوں کے دوران فوج میں کئی تبدیلیاں آچکی۔ کیا آپ نے ماضی اور دور حاضر کے ان جوان افسروں کی ذہنی و جسمانی کیفیت میں کوئی فرق پایا؟
ج: پیارے، ان برسوں میں کئی تبدیلیاں آئی ہیں۔ مثلاً میرے زمانے میں جب تک میں لیفٹیننٹ کرنل نہ بن گیا، والد مجھے جیب خرچ دیتے رہے۔ آج نوجوان افسر نہ صرف اپنا پیٹا بھرتا ہے بلکہ تنخواہ کا بیشتر حصہ اسے گھر بھی بھجوانا پڑتا ہے۔

اس وقت کورسوں کی اتنی بھرمار بھی نہ تھی۔ آج نوجوان افسر ایک جگہ شاید ہی سکتے ہیں، یہ کورس، فلاں کورس کرنے کی خاطر وہ مختلف ہٹالینوں اور رہمنوں میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ انھیں یہ موقع ہی نہیں ملتا کہ وہ اپنے جواؤں سے جان پہچان پیدا کر سکیں۔ مگر ہم اپنے ہر جوان کو سرتاپا جانتے تھے۔

مزید برآں اس زمانے میں کام بھی زیادہ نہ تھا۔ ہم صبح سویرے اٹھتے اور آدھ ایک گھنٹہ ورزش کرتے۔ واپس آکر وردی پہنچتے، ناشتہ اڑاتے اور پھر ادھر ادھر ٹامک ٹوئیاں مارتے ہوئے کمانڈنگ افسر کی نظروں سے بچنے کی سعی فرماتے۔

تب کے کمانڈنگ افسر بڑی توپ چیز تھے۔ ان کی اتنی آن بان تھی کہ کسی تیس مارخان کو خاطر میں نہ لاتے۔ میں ایک مثال سے یہ نکتہ واضح کرتا ہوں۔

میں اپنی ہٹالین کا کوارٹر ماسٹر تھا۔ ایک شام ہمارے کمانڈنگ افسر کرنل نے ایڈجوئنٹ اور مجھے بلایا اور کہا ”میں چاہتا ہوں کہ کل صبح ہٹالین سے خصوصی ورژشیں کراؤں۔ چنانچہ تیار رہنا۔“

تب موٹر کاریں علقا تھیں لہذا مال برداری کے لیے ٹچر کام میں آتے۔ بحیثیت کوارٹر ماسٹر چڑھوں کا میں انچارج تھا۔ ہٹالین نے صبح ساڑھے ۶ بجے روانہ ہونا تھا۔ لہذا میں نے حکم دیا کہ صبح ۶ بجے ٹچر پہنچ جائیں۔

اس رات ساڑھے گیارہ بجے اچانک صاحب کا

ذہن بدل گیا۔ انھوں نے پھر ہمیں بلایا اور کہا ”صبح ہم ساڑھے ۶ کے بجائے ۹ بجے روانہ ہوں گے۔“ یہ سن کر میں بغلیں بجانے لگا۔ کیونکہ ٹچروں نے اپنے وقت پر پہنچ جانا تھا۔

صبح میں اٹھا، سائیکل پکڑی اور وہاں پہنچا جہاں ٹچروں نے پہنچنا تھا۔ کبھی خرچ قلی پہنچ چکے تھے۔ میں نے قلیوں سے کہا کہ ٹچروں کو سائے میں لے جاؤ، ہم ۹ بجے جا سکیں گے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ کنٹونمنٹ کا کمانڈر، میجر جنرل اپنی بیٹی کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر حسب معمول میں نے ٹوٹی چوٹی۔ جنرل نے دریافت کیا ”نوجوان! یہ جانور یہاں کیا کر رہے ہیں؟“

میں نے بتایا کہ ہم ورزش کرنے باہر جا رہے ہیں۔
”تم لوگوں نے کب جانا ہے؟“
”۹ بجے!“

اس نے اگلا سوال کر کے میرے پیروں تلے سے زمین نکال دی ”کیا کہا، ۹ بجے؟ اور تم نے ۶ بجے خچر منگوا لیے، کیوں؟“

مجھے لگا کہ میری سڑپس ابھی اتر جائیں گی۔ جنرل اپنی بیٹی کے ساتھ صبح کی سیر کرنے نکلا تھا۔ اب میں..... ایک معمولی افسر اسے کیا جواب دیتا؟ میں بدحواسی سے کوئی وجہ ڈھونڈ رہا تھا کہ اچانک میرے کمانڈنگ افسر سائیکل چلاتے وہاں آنکھ۔ انھوں نے ٹوٹی پر ہاتھ رکھا اور بولے ”صبح ٹچر جنرل!“

پھر میری طرف مڑے اور پوچھا ”سام! کیا ہوا؟“
جھجکتے ہوئے بتایا ”جنرل اس بات پر مجھ سے ناراض ہیں کہ ۹ بجے جانا ہے تو ۶ بجے ہی خچر کیوں منگوا لیے؟“
یہ سن کر وہ جنرل کی طرف مڑے اور بولے ”جنرل! آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ یہ نوجوان نہیں میں اس رجمنٹ کا کمانڈر ہوں۔“ انھوں نے پھر مجھے دیکھا اور دریافت کیا ”سام! تم نے ناشتہ کر لیا؟“
”جی نہیں۔“
جاؤ، پھر ناشتہ کرو۔“

سلیوٹ دے مارا۔ اس نے پھر سرتا پامیر جائزہ لیا اور کہا
 ”ہاں، اب بندے کے پتر لگتے ہو۔“ پھر اس نے پوچھا
 ”تمہارے پاس فاؤنٹین پن ہے نا؟“
 میں نے جواب دیا ”جی ہاں۔“
 ”سی او (کمانڈنگ افسر) تمہاری رپورٹ پر دھس
 گے۔ تم نے اس کے دائیں کونے پر دستخط کرنے میں
 سمجھ گئے؟“
 ”جی سر۔“

میں پھر سی او کے خیمے میں داخل ہوا اور کرنل کو سلیوٹ
 مارتے ہوئے بولا ”سر! تاک شارپورنگ! انھوں نے مجھے اوپر
 سے نیچے تک دیکھا، رپورٹ مجھے تھمائی اور گویا ہوئے ”یہ افسر
 اومعافی چاہتا ہوں، یہ جوان ایک دن افسر بن کر رہے گا۔“
 میں نے رپورٹ پر دستخط کیے، انھیں تھمائی اور
 پلٹ آیا۔

رجنٹ میں خالد شیخ میرے ساتھی تھے۔ وہ
 بعد ازاں پاکستان چلے گئے اور وہاں اعلیٰ سرکاری عہدوں
 پر فائز رہے۔ میرے بعد ان کا نمبر تھا۔ وہ باہر آئے تو میں
 نے دریافت کیا ”خالد! تمہاری رپورٹ کیسی رہی؟“
 وہ بولے ”یہ افسر غیر ذمے دار لگتا ہے۔“
 میں نے کہا ”یار، یہ تو خراب رپورٹ ہے۔“
 ہنستے ہوئے کہنے لگے ”بھی گزشتہ سال بھی شیطان
 نے یہی کہا تھا کہ میں غیر ذمے دار ہوں۔“

فرق یہ ہے کہ ہمارے سی او تلخ باتیں بھی سناتے تو
 ہم برا نہیں مناتے تھے۔ آج کوئی سی او کسی افسر کو غیر ذمے
 دار قرار دے تو وہ صدر بھارت تک کو یہ بتانے پہنچ جاتا
 ہے کہ وہ کمانڈنگ افسر سے زیادہ ذمے دار ہے۔
 میرے پیارے، یہ فرق ہے، کچھ بھی ہو جاتا، ہم
 کو سنے نہیں دیتے تھے۔

خواتین و حضرات! بہت شکریہ کہ آپ نے کرم، صبر
 اور ڈسپلن کا مظاہرہ پیش کیا۔ آپ سب کو یہاں دیکھ کر میں
 بہت خوش ہوا۔

یوں میری جان چھوٹی اور میں خوشی خوشی اپنے خیمے
 میں چلا آیا۔ یہ کمانڈنگ افسر کی بہادری تھی کہ انھوں نے
 جنرل کو موقع نہ دیا کہ وہ بیٹی کے سامنے مجھے سخت ست
 کہتے۔ جب ورزش کر کے میں شام کو پہنچا تو مجھے ایک خط
 دیا گیا۔ پتا چلا کہ جنرل صاحب کی بیگم نے اگلے دن مجھے
 چائے کی دعوت پر بلایا ہے۔ حالانکہ میں بیگم نہیں بیٹی.....
 خیر یہ معاملہ جانے دیں۔

جب میں فیلڈ مارشل بن چکا تو ایک بار ملکہ برطانیہ کا
 مہمان بنا۔ انڈیا ہاؤس (لندن) میں میرے اعزاز میں
 ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اس میں میرے ایک سابق
 کمانڈنگ افسر بھی شریک تھے۔ وہ مع بیگم آئے، مجھ سے
 اور میری بیوی سے ہاتھ ملایا اور پھر ایک طرف ہو گئے۔
 آدھ گھنٹے بعد جب بھی مہمان آچکے تو میں مشروب کا
 گلاس تھامے ان کے پاس پہنچا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی گویا
 ہوئے: ”کیا میں تمہیں سام کہہ سکتا ہوں؟“

”پلیز سر، کہیے۔ پہلے تو آپ مجھے عموماً ”بلڈی فول“
 (Bloody fool) کہتے تھے۔ حتیٰ کہ اسی کو اپنا پیدائشی نام
 سمجھنے لگا۔“ میں نے کہا

اب آئیے اس طرف کہ تب اور اب کے افسروں
 میں کیا فرق ہے۔ میری پہلی خفیہ (Confidential)
 رپورٹ انہی کمانڈنگ افسر نے لکھی تھی۔ روایت تھی کہ
 جب جونیئر اپنی رپورٹ پر دستخط کرنے جاتا تو پہلے
 ایڈجونٹ کے سامنے حاضر ہوتا۔ وہ اس کے لباس اور
 انداز و اطوار کا جائزہ لیتا۔

اس زمانے میں کمانڈنگ افسروں کا بڑا رعب و ہدبہ
 تھا۔ چنانچہ جی کڑا کر ان کے دفتر جانا ہوتا۔ حسب روایت
 پہلے ایڈجونٹ کے سامنے حاضری دی۔ اس نے مجھے اوپر
 سے نیچے تک دیکھا اور ناگواری سے بولا ”تم کرنل کے
 پاس جا رہے ہو اور ذرا اپنی حالت تو دیکھو۔ سٹریپ گندی
 ہو چکی اور بیٹی پر چکنائی کے داغ ہیں۔ کچھ تو ہوش کرو۔
 جاؤ اپنا حلیہ درست کر کے آؤ۔“

میں ۵ منٹ ادھر ادھر گھوما اور پھر ایڈجونٹ کو



دنیا کے سب سے بڑے اور مشہور
کالم نگار آرٹ بک والٹ کی

انوکھی حیات کا احوال

600 اخبارات میں لکھنے والا کالم نگار اس قدر صحت مند

مسرور اور مطمئن زندگی کیونکر بسر کرتا رہا؟

جاوید چودھری

میں داخلہ لیا لیکن ناکام طالب علم ثابت ہوا۔ نیوی میں بھرتی ہو گیا، ۳ سال نوکری کی، سارجنٹ بنا اور استعفا دے کر واپس آ گیا۔ یونیورسٹی آف ساؤتھ کینٹ کی فورس میں داخلہ لیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۳۸ء تک یونیورسٹی میں پڑھتا رہا لیکن ناکام ہو گیا۔ ۲۵۰ ڈالر کا بندوبست کیا اور دن

بک والٹ اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار ہے۔ اس کا کالم دنیا کے ۶۰۰ بڑے اخبارات میں بیک وقت شائع ہوتا ہے۔ وہ ۱۹۲۵ء میں نیویارک میں پیدا ہوا۔ ۲۰ مرتبہ ہائی سکول

وے ٹکٹ لے کر پیرس آ گیا۔ پیرس میں ورائٹی میگزین سے وابستہ ہو گیا۔ ایک روز اس نے پیرس کی شبانہ زندگی پر ایک ہلکا سا کالم لکھا، کالم پسند کیا گیا۔ یوں آرٹ بک والٹ کالم نگار بن گیا۔ ۱۹۵۲ء میں نیویارک ہیرلڈ ٹریبون نے اس کے کالم کو ”سینڈ کیٹ“ کر دیا جس کے بعد آرٹ بک والٹ کا کالم امریکا کے ۳۰ اخبارات میں شائع ہونے لگا۔ ۱۹۶۲ء میں وہ واپس امریکا چلا گیا۔ اس کا کالم اس وقت دنیا کے ۶۰۰ اخبارات میں شائع ہوتا ہے۔ پاکستان میں ڈیلی نیوز میں اس کا کالم شائع ہوتا ہے۔ وہ اس وقت بلاشبہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھا جانے والا کالم نگار ہے۔ اس نے ۳۶ لوگ ملازم رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ۳۶ لوگ مل کر یہ کالم بیان کرتے ہیں، زبان کے ماہرین زبان کی باریکیاں ٹھیک کرتے ہیں، قانونی ماہرین کالم کی قانونی پیچیدگیوں کا جائزہ لیتے ہیں اور انسانی نفسیات کے ماہر اس کالم کی نفسیاتی جہتوں کا تجزیہ کرتے ہیں جس کے بعد یہ کالم چھپنے کے قابل بنتا ہے۔ یہ کالم ایک مختصر سی مزاحیہ تحریر ہوتی ہے لیکن اس کے اثرات کئی مہینوں تک جاری رہتے ہیں۔ اس کے فقرے اور خیالات بہت زود اثر اور دیر پا ہوتے ہیں۔ مثلاً اس نے ایک کالم لکھا تھا ”ہم عجیب ہیں، ہمیں محسوس ہوتا ہے ہمارا گزرا ہوا کل ہمارے آج سے بہتر ہے، میں ان تمام لوگوں سے مختلف ہوں۔ میں آج کی خوبیاں جاننے کے لیے ۱۰ ارسال انتظار نہیں کر سکتا لہذا میں آج کو گزرا ہوا کل سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں۔ میری آپ سے بھی یہی درخواست ہے آپ ۲۰۰۳ء کو ۱۹۹۳ء چھپیں اور خوب انجوائے کریں۔ اس نے کسی جگہ ڈاکٹروں کا ذکر کیا، اس نے لکھا ”میری بیوی ایک بار

شوکر گلنے کے باعث گر گئی۔ اس کی کلائی کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ ڈاکٹر نے کہا یہ ۹۰ کے زاویے پر گری ہے۔ اگر یہ ۲۵ کے زاویے پر گرتی تو اس کی کلائی بچ سکتی تھی۔ اس دن سے میں نے گرنے کا یہ نسخہ پلے باندھ لیا لہذا میں ہمیشہ اپنے دوستوں کو مشورہ دیتا ہوں اگر تم گرنے کا منصوبہ بناؤ تو مہربانی فرما ۲۵ کے زاویے پر گرنا تاکہ تمھاری کلائی بچ جائے۔“

میں آرٹ بک والٹ سے بہت متاثر ہوں۔ میں نے اس کے بے شمار کالم پڑھے۔ اس کی چند کتابوں کا مطالعہ بھی کیا۔ ۲۰۰۲ء میں امریکا گیا تو میں نے اس سے ملاقات کی کوشش کی۔ میرے دوست نے ڈائریکٹری سے آرٹ بک والٹ کا نمبر تلاش کیا۔ میں نے اسے فون کیا۔ اس کی سیکرٹری سے بات ہوئی۔ اس نے میرا سارا تعارف کمپیوٹر میں ٹائپ کیا۔ میرا ٹیلی فون نمبر لیا اور ہمیں شام ۵ بجے کا وقت دے دیا۔ آرٹ بک والٹ ایک خوبصورت گھر میں شاہانہ زندگی گزار رہا تھا۔ اس کی سیکرٹری ہمیں اس کی اسٹڈی میں لے گئی۔ بک والٹ کتابوں کے بے شمار ریکس کے درمیان بیٹھا تھا۔ اس کے پیچھے شیشے کی دیوار تھی۔ دیوار کی دوسری طرف نصف درجن لوگ کمپیوٹر پر کام کر رہے تھے۔ ہم نے شیشے سے جھانکا تو بک والٹ نے قہقہہ لگا کر کہا ”مائی اساف“ میں شرمندہ ہو گیا، اس نے ہاتھ رگڑے اور شرارتی لہجہ میں بولا ”سو مشرودری تم ڈیلی جنگ میں زیرو پوائنٹ کے ٹائٹل سے کالم لکھتے ہو، ہفتے میں ۳ دن تمھارے کالم آتے ہیں، کالموں میں مایوسی اور حقیقت ہوتی ہے لیکن لوگ تمھیں پسند کرتے ہیں۔“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا، اس نے میز پر پڑی

میں آج کو گزرا ہوا کل سمجھتا ہوں

اور ہمیشہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہوں



(آرٹ بک والٹ، تاریخ وقایع، ۱۷ جنوری ۲۰۰۰ء)



اپنے بچوں اور خواتین پر سرمایہ کاری کرنے والے قوموں کو زوال نہیں آتا

فکیل احمد

امریکا میں اس وقت ۲۱۲ ملین وی پی پی اے ہیں جن سے صرف خواتین کے لیے پروگرام شریکے جاتے ہیں اور ان نثریات کا زیادہ تر حصہ بچوں کی پرورش اور نگہداشت پر مشتمل ہوتا ہے

کے لیے ان کے ہاں آئندہ ۵ سال، ۱۰ سال بلکہ اگلے ۵۰ برسوں کے پلان بنائے جاتے ہیں اور پھر ان پر پوری عرق ریزی سے محنت کی جاتی ہے۔ اپنے وطن اور شہریت پر فخر و ناز کا فلسفہ سب سے پہلے ایک ایرانی فلسفی مزدک نے پیش کیا تھا۔ اس کا یہ بھی کہنا تھا کہ ملک عورتیں اور بچے بنایا کرتے ہیں۔ یعنی کل

قویں اپنے ملک پر ناز کرتی ہیں۔ اپنی شہرت پر فخر محسوس کرتی ہیں۔ بلکہ اگر کہا جائے کہ وہ اپنے ملک سے ”تعصب“ کی حد تک محبت کرتی ہیں تو یہ غلط نہ ہوگا۔ قومی عصیت رکھنے والی قومیں ہی ملک کو ترقی و خوشحالی کی بلند منزلوں پر لے جاتی ہیں۔ ملکی ترقی و استحکام

زندہ

تیار ہیں۔“ اس نے اس پر بھی اثبات میں گردن ہلا دی، سیکرٹری نے دونوں کاغذ اٹھائے اور باہر چلی گئی۔ بک والٹ نے قہقہہ لگایا اور ہاتھ رگڑ کر بولا ”پرئیر ٹائم فنڈ“ تم لوگ اب باتیں کر سکتے ہو۔ ہم نے اس عجیب و غریب عبادت کے بارے میں پوچھا تو وہ ہنس کر بولا ”انسان ۳ چیزوں کا مجموعہ ہوتا ہے، جسم، ذہن اور روح۔ ہم جسم کو تندرست رکھنے کے لیے ورزش کرتے ہیں، ذہن کو چست و چالاک رکھنے کے لیے مطالعہ کرتے ہیں لیکن اپنی روح کو ہمیشہ بھلا دیتے ہیں۔ ہماری غفلت کا یہ نتیجہ نکلتا ہے، ہماری روح مرنا شروع ہو جاتی ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے ہمارے جسم اور ہمارے ذہن کی تمام بیماریوں کی جڑیں ہماری روح میں پیوست ہیں۔ اگر ہماری روح صحت مند ہے تو ہمارا ذہن اور جسم بھی تندرست ہوگا۔ میں ایک غیر مذہبی انسان ہوں لیکن اس کے باوجود میں ورزش کو جسمانی عبادت، مطالعے کو ذہنی عبادت اور فلاح عامہ کے کاموں کو روحانی عبادت سمجھتا ہوں۔ میں ساڑھے چار سو اخبارات سے حاصل ہونے والی آمدنی ذاتی زندگی پر خرچ کرتا ہوں جبکہ ڈیڑھ سو اخبارات سے آنے والے چیک اپنے چیریٹی اکاؤنٹ میں ڈال دیتا ہوں۔ میں روز شام ۶ بجے سے ساڑھے ۶ بجے تک چیریٹی کا کام کرتا ہوں، طالب علموں کو وظیفے دیتا ہوں، مرلیضوں کے علاج کا بندوبست کرتا ہوں۔ ہوم لیس لوگوں کی مدد کرتا ہوں، سیلاب اور زلزلوں کے شکار لوگوں کو امداد دیتا ہوں اور کتابیں اور کپڑے تقسیم کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ میری عبادت، میری پرئیر ہے۔ میری یہ پرئیر، میری یہ عبادت میرے دماغ، میرے جسم کو صحت مند رکھتی ہے۔ لہذا میں ایک صحت مند اور مسرور زندگی گزار رہا ہوں۔“ میں اپنی نشست سے اٹھا، میں نے آٹ بک والٹ کو سیلوٹ کیا اور باہر آگیا۔ میرے دل میں اس کی قدر بڑھ گئی، مجھے محسوس ہوا وہ ایک فنکار، ایک کالم نگار سے کہیں بڑا انسان ہے۔

فائل کھولی، اس میں سے میرے چند کالم نکالے اور میرے سامنے رکھ دیے۔ ایک کاغذ خود اٹھایا اور میرا پروفائل پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ پڑھتا رہا، پڑھتا رہا۔ جب کاغذ ختم ہو گیا تو مزاحیہ انداز میں بولا ”یہ ساری چیزیں میں نے انٹرنیٹ سے نکالی ہیں۔ جب مجھے پتا چلا میرا ایک پاکستانی ہم پیشہ دوست مجھ سے ملنے آ رہا ہے تو میں نے فوراً پاکستان اور تمہارے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔ میں نے یہ ساری چیزیں پڑھیں تاکہ میں تم سے پاکستان اور تمہارے بارے میں پوچھ کر وقت ضائع نہ کروں اور ہم اس ملاقات میں زیادہ بہتر گفتگو کر سکیں۔ لہذا ”ٹیل میں سم تھنک ایڈٹ مشرف“ مجھے اس کا اسٹائل بڑا اچھا لگا۔ اس سے گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا وہ حقیقتاً ایک دلچسپ انسان ہے، وہ روزانہ ۵۰ گھنٹے مطالعہ کرتا ہے، کالم لکھتا ہے، شام کو کالف اور ٹینس کھیلتا ہے، اسے شطرنج جمع کرنے اور کھیلنے کا شوق ہے، اس کے پاس سیکڑوں قسم کی شطرنجیں ہیں، وہ ریس ٹریکس پر جا لگ کر رہا ہے اور مزاحیہ فلمیں دیکھتا ہے۔ ۶ بجے ہمارا وقت ختم ہو گیا، اس کی سیکرٹری اندر آئی۔ ہم نے جانے کے لیے اجازت چاہی، وہ اٹھا لیکن کچھ سوچ کر بولا ”اٹ از مانی پرئیر ٹائم لیکن میں اپنی عبادت آپ لوگوں کے سامنے بھی کر سکتا ہوں، اگر آپ لوگوں کو جلدی نہیں تو آپ میرے پاس مزید آدھا گھنٹہ بیٹھ سکتے ہیں۔“ ہم بیٹھ گئے، اس نے سیکرٹری کو اشارہ کیا، وہ باہر گئی اور چند منٹ بعد ایک فائل لے کر اندر آگئی ”مشربک والٹ! یہ یتیم کا ایک طالب علم ہے، اس نے نیو یورک میں پہلی پوزیشن حاصل کی، یہ جینیوینا لوبی میں پی ایچ ڈی کرنا چاہتا ہے، اسے اسکالرشپ چاہیے۔“ بک والٹ نے پیچھے اٹھا کر پڑھا، واپس میز پر رکھا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔ سیکرٹری نے دوسرا پیچہ پڑھنا شروع کر دیا ”یہ ساؤتھ افریقہ کی بچی ہے، کینسر کی مرلیضہ ہے، ۲۵ ہزار ڈالر میں اس کا علاج ہو سکتا ہے، ڈاکٹر آپ کی وجہ سے ۵۰ فیصد رعایت دینے کے لیے

پہلے مرحلے میں امریکی عورتوں کی فکری پرورش ہے
امریکا نے اپنے ملک کی عورتوں کو سمجھایا کہ تم نے

بچے کو مفید اور بااعتماد کیسے بنایا جائے
 دوسرے مرحلے کا تعلق براہ راست بچے سے ہے۔ امریکی حکومت نے والدین کی رہنمائی اور تربیت
 کہ وہ کسی طرح بچے کو شروع سے ہی ایک مفید اور بااعتماد
 شہری بنا سکتے ہیں۔ والدین اپنے بچے کے سرہانے امر
 جھنڈا رکھتے ہیں۔ ان کے کان میں روزانہ یہ کہتے ہیں
 "You are an American Child, and America
 is the Super power of the World."

66

چوتھے درجے کو ابلدائی درجہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا پر مشتمل ہے اس میں کتابیں، اخبارات، رسالے، ریڈیو اور ٹیلی ویژن چینل سبھی شامل ہیں۔ اسکول اور استاد بچوں کو مطالعے پر ابھارتے ہیں۔

امریکی بچوں کو دوسرے ممالک کی سیاحت
آخر میں بچوں کی تربیت کا آخری اور پانچواں مرحلہ
آتا ہے۔ اس میں امریکا اپنے منتخب بچوں کو بیرونی دنیا کی
سیر کراتا ہے۔ ان بچوں کو افریقہ لے جایا جاتا ہے۔ ایشیا
کے پس ماندہ ممالک اور معاشروں کی سیر کرانی جاتی ہے۔
اس کے ساتھ ساتھ انھیں یورپ اور مشرق بعید کے ترقی
یافتہ ممالک میں بھی لے جایا جاتا ہے۔ اس سیر کا مقصد یہ
ہوتا ہے کہ امریکی بچے خود اپنی آنکھوں سے امریکا کا بانی
دنیا سے موازنہ کر سکیں اور خود مشاہدہ کر سکیں کہ امریکا باقی
دنیا سے کس قدر آگے ہے۔ دنیا کے سب جدید اور ترقی
یافتہ ممالک سے بھی امریکا کہیں آگے ہے۔

یوں عملی زندگی میں قدم رکھنے سے پہلے امریکی بچوں کے دماغوں میں Feed یہود جاتا ہے کہ تم ایک سہرہ قوم ہو۔ تمہارا ملک سہرہ پاور ہے اور تم نے کبھی آئندہ پوری دنیا پر کنٹرول حاصل کرنا ہے۔ ساری دنیا پر حکمرانی کرنی ہے۔ آج یہاں اپنے ملک میں بیٹھ کر بہت لوگ امریکا کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔ یقیناً امریکا کی کئی پالیسیاں مسلمانوں کے خلاف ہیں۔ مگر گھر بیٹھ کر گالیاں دینا تو بہت آسان کام ہے کیا ہم اتنی ترقی کرنے کا سوچ بھی سکتے ہیں؟

امریکا تو بہت دور کی بات ہے۔ یورپ میں انڈرگراؤنڈ ریلوے کا نظام ۱۸۶۳ء میں شروع ہوا تھا۔ کیا اس کے ۱۵۰ سال بعد ۲۰۱۳ء تک بھی کہیں امید کی کرن نظر آتی ہے کہ لاہور یا کراچی میں انڈرگراؤنڈ ریلوے کا نظام شروع ہو سکے گا؟

پاکستان سے باہر عالم اسلام پر فطرہ ڈالیں تو حالات حوصلہ افزا قطعاً نہیں ہیں۔ آج دنیا میں ۵۰ سے زیادہ اسلامی ممالک ہیں جن کی آبادی ۱۳۰ کروڑ سے زیادہ ہے۔ مگر محض ۲۰ کروڑ آبادی (تقریباً) رکھنے والے جاپان کی سارے اسلامی ممالک سے GDP زیادہ ہے۔ چھوٹے سے جاپان میں تمام ممالک سے زیادہ تعلیمی ادارے اور یونیورسٹیاں ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عالمی میڈیا نے زیادہ تر یہودیوں کے زیر اثر ہے۔ ہٹلر، نازی پارٹی، جرمنوں کا ”دشمن“ بن گیا تھا۔ ان کو اتنا بدنام کیا گیا کہ ہٹلر اور اس کی نازی پارٹی کا حلیہ (Image) براہِ روکر کے رکھا گیا۔ پھر یہ میڈیا دوسری ورلڈ وار پاور روس کے پیچھے بڑا گیا۔ اور اس سے بھی بالآخر سارے حربے استعمال کر کے ”سپر پاور“ کا ٹائٹل چھین لیا۔

اب یہ عالمی میڈیا اور اس کے پیچھے اسلام دشمن ذہنیت مسلمانوں کے پیچھے پڑ گئی ہے۔ اسلام کو اتنا بدنام

۵۵) میں یقیناً غلط بیانی کر کے آج ووٹوں کے ۵۰ ڈالر بچا سکتا تھا مگر میرا بچہ یہ ساری زندگی نہ بھلا سکتا کہ میرے باپ نے ۵۰ ڈالر بچانے کی خاطر جھوٹ بولا ہے ۵۵

مولی

(ابن قاور)

اور آخری بات۔ قرآن پاک جب نازل ہوا تو اس کی سب سے پہلی وحی کا سب سے پہلا لفظ ”قرا“ تھا۔ گویا ”پڑھو، علم حاصل کرو.....“ قرآن پاک کا سب سے پہلا آرڈر تھا۔ کیا ہم نے تعلیم کو اس اسلامی آرڈر کے مطابق مقام دے رکھا ہے؟

کیا مسلمان دنیا میں سپر پاور بن سکتے ہیں؟ کیا آج کے دور میں مجھے اس کا جواب ہاں میں مل سکتا ہے؟ بظاہر بڑا مشکل بلکہ Next to Impossible نظر آتا ہے۔ مگر سوچیں اس کا جواب ہاں میں دیتی ہے۔ ہاں مسلمان دنیا میں سپر پاور تھے اور وہ پچاس یا سو برسوں کے لیے نہیں بلکہ پورے پانچ سو برس تک دنیا میں سپر پاور رہے۔

ہم بڑے ہوتے ہیں تو ڈر اور خوف بھی جوان ہو جاتے ہیں

زندگی نام ہے ڈر ڈر کے جئے جانے کا

ڈاکٹر منصور احمد باجوہ

ڈرنے والے کم ہیں نہ ڈرنے والے، دونوں نے زندگیوں کو ڈر سے بھر دیا ہے

ڈر کی سونتا بچپن سے بڑھاپے تک اور سیاست سے مذہب تک ہر جگہ بے دریغ باغی جاری ہے۔ یہ اس کا ہلکا پھلکا تذکرہ

کسی

کا قول ہے We have
nothing to fear but fear
itself (اگر ہمیں خوف کا خوف نہ

ہو تو پھر کوئی خوف نہیں)۔ یہ بات کہنا جتنا آسان ہے کرنا اتنا ہی مشکل۔ جب ڈر ہی ڈرائے اور ڈراتا ہی جائے تو پھر ہم کیسے نہ ڈریں۔ خیر ڈر کا تو کام ہی ڈرانا ہے وہ تو ڈرائے گا ہی ہمیں تو ساری عمر اپنے اور پرانے دوست اور دشمن حاکم اور محکوم افسر اور ماتحت کسی نے کہیں جبین نہیں لینے دیا۔ ابھی پتھوروے میں ہوتے ہیں کہ ماں چپ ہو جاؤ 'بھائو' کھا جائے گا کہہ کر ہمیں بھائو نامی کسی چیز سے ڈرانا شروع کرتی ہے اور تمام عمر اس 'بھائو' کے بارے میں ہمیں سوائے اس کے کچھ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کوئی ایسی چیز ہے جس سے بڑے ڈریں یا نہ ڈریں بچوں کو بغیر دیکھ ماں کی بات کا اعتبار کر کے ضرور ڈرنا چاہئے۔ ذرا

بڑا ہونے پر دوسرا ڈر باپ کی شکل میں سامنے آتا ہے جو خود کبھی اپنے قول و فعل سے ڈرنے والی چیز ثابت ہو نہ ہو بہر حال ماں اس سے ڈرنے اور ساری عمر ڈر رکھنے کی کوشش ضرور کرتی ہے۔ "ابھی تمہارا ابا آکے تھیک ٹھیک کرتا ہے"، "اپنے نے دیکھ لیا تو تھکسا ہی چڑی اوبھ دے گا"، "آنے دو تھکسارے ابا کو بتاتی ہوں تھکسا کر تو ت"، ابا بیچارہ تھکا ماندہ گھر آتا ہے تو بچے ہم کوٹوں کھدروں میں چھپ جاتے ہیں کہ ہماری شامت آئی کہ آئی۔ اوجھی آواز سے بولنا تو کیا جب تک ابا جان گھر میں رہیں زور سے سانس لینا بھی خطرے سے خالی نہیں سمجھتے۔ یوں ابا جان اس منفی پرائیگنڈ کے ذریعہ تمام عمر گھر میں نہ جانتے اور نہ چاہتے ہوئے ایک لای کر دار ادا کرتا رہتا ہے۔

سکول تو نام ہی ڈر اور خوف کا ہے۔ ہمارے زمانہ

میں کتابوں اور پڑھائی سے زیادہ مولا بخش کا خوف ہوا کرتا تھا۔ اور بچے بستہ سنبھالتے، ہچکیاں لیتے، دامن سے ہار بار ناک پونچھتے گھر سے یوں رخصت ہوا کرتے تھے جیسے چند گھنٹوں کے لیے نہیں ہمیشہ کے لیے وداع ہو رہے ہوں۔ استاد کہ جنہیں اس زمانے میں 'سر' نہیں، ماسٹر جی کہا جاتا تھا، بچوں کی طرف نگاہ شفقت آمیز ڈالنا کفر نہیں تو گناہ کبیرہ ضرور سمجھتے تھے۔ گھر جا کر ماسٹر جی کے مولا بخش کے کرتوتوں اور مرغمانے جیسی ورزشوں کے بارے میں کچھ کہنا آداب طالب علمی کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ ویسے بھی ماں باپ کو پختہ یقین ہوا کرتا تھا کہ جو تاشیر ماسٹر صاحب کے مولا بخش میں ہے وہ ان کی زبان میں نہیں ہے۔ اس لئے زنگ چہالت اتارنے کے لیے وقتاً فوقتاً بچوں کی دھنائی کو بڑی تحسین کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مولا بخش کتابوں اور کاپیوں کے بھاری بھر کم بستے نے اس کی جگہ لی۔ ہر ماں اور باپ کی خواہش یہ ہے کہ بچہ پچھوے سے ہی انگریزی بولنی اور Two plus two four کہنا شروع کر دے۔ ماما اور پاپا کو خوف لگا رہتا ہے کہ انگریزی کی اس دوڑ میں ان کا بچہ دوسرے بچوں سے پیچھے رہ گیا تو ان کے بچے کا کیا بنے گا! اور بچے کا تو کچھ بنے گا یا نہیں بنے گا، وہ کس کو منہ دکھانے کے قابل رہیں گے؟ اپنے اس خوف کو وہ مسلسل بچے کے ذہن میں ٹھونسنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ اور یوں بچہ ایک انجانے خوف سے ڈرا، کتابوں سے الجھتا، ٹیوشنوں کے پیکر میں چکراتا اور اساتذہ کی دنیا بناتا، کامیابی کے اس سرب کے پیچھے بھاگتا ہی چلا جاتا ہے، جسے حقیقت کے روپ میں دیکھنا کم ہی نو جوانوں کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ بہت سے والدین اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ بھاگتے ہیں۔ اور آخر کار جب دونوں "ہف" کر گر پڑتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہی خوف جس سے بچ نکلنے کی کوشش میں سر پٹ بھاگتے رہے تھے اب بھی ویسے کا ویسا تندرست و توانا چٹا کٹا سامنے کھڑا ہے۔

جوں جوں ہم بڑے ہوتے ہیں، ہمارے ساتھ ہمارے ڈر اور خوف بھی جوان ہوتے جاتے ہیں۔ انسان جوانی کے بعد بوڑھا اور کمزور ہوتا جاتا ہے مگر سائے کی طرح ہمارے ساتھ لگے ہمارے خوف کمزور اور بوڑھے ہونے کے بجائے ہماری کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مزید زور آور ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نو جوانی میں ہم بے روز گاری سے ڈرتے ہیں، روزگار مل جائے تو کم آمدنی سے ڈرتے ہیں۔ شادی نہ کریں تو جوانی چین نہیں لینے دیتی، کر لیں تو بیوی سکون سے نہیں بیٹھنے دیتی۔ اولاد نہ ہو تو جڑ کٹ جانے سے ڈرتے ہیں، اولاد ہو تو اس کی الٹی سیدھی حرکتوں سے ڈرتے ہیں۔ رشوت لیں تو پکڑے جانے سے ڈرتے ہیں، نہ لیں تو برادری میں ناک کٹ جانے سے ڈرتے ہیں۔ بیماری سے ڈریں تو ڈاکٹر کی طرف بھاگتے ہیں اس کی فیس ڈرائے تو بیماری کم تر برائی نظر آنے لگتی ہے۔ شریف لوگ پولیس سے ڈرتے ہیں پولیس ڈاکوؤں سے ڈرتی ہے۔ نج ویکلوں سے ڈرتے ہیں، وکیل ججوں سے غم کھاتے ہیں۔ ماتحت افسر سے ڈرتے ہیں، افسر موٹی فائلوں سے۔ سڑک پر بسوں اور ویکلوں سے ڈرتے ہیں اور گھر میں بیوی کے طعنوں سے یوں یہ ڈر اور خوف ہمارے اتحاد اور یگانگی کی علامت بن چکے ہیں کہ ملک کے اندر ہم سب ایک دوسرے سے ڈرتے ہیں اور بیرون ملک سب مل کر امریکہ سے ڈرتے ہیں۔۔۔ امریکہ تیرا شکر یہ!

جس طرح معاشرے کے مختلف طبقات کی خوشیاں اور غم مختلف ہوتے ہیں اسی طرح ان کے ڈر اور خوف بھی بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جس خوف سے نچلے طبقات کا نپتے رہتے ہیں وہ خوف کبھی طبقہ، اعلیٰ کی بستیاں میں بھاگنے کی جرات بھی نہیں کر سکتے۔ تاہم بعض خوف ایسے بھی ہیں جن سے چھوٹا اور بڑا ہر ایک یکساں خوف کھاتا ہے۔ بحث کا خوف ایک ایسا ہی خوف ہے۔

ہر لمحہ یہی خوف نیا نکلیں ہے آیا

ایک ہزار ڈالر سے آغاز
کرنے والے نے دنیا کے
کمپیوٹر کی بنیادیں ہلا دیں

۳۳ سالہ نوجوان جو کمپیوٹر کی تعلیم بھی پوری نہ کر سکا، مالی معیار کا ادارہ بنانے،
اپنے ہزاروں ملازمین اور حصہ داروں کو دولت مند بنانے میں کیسے کامیاب ہوا؟

18 بلین ڈالر (تقریباً 1800 ارب روپے) مالیتی کمپنی کا مالک

مائیکل ڈیل

دفتروں میں اس کے بیٹھنے کیلئے کوئی کرسی نہیں

ڈیل (Dell)، اپنے ادارے کے سربراہ اعلیٰ کے عہدے
سے دستبردار ہو گیا تو ادارے کی مالی ترقی اور فروخت میں
بھی متزلزل واقع ہو گیا اور ۲۰۰۶ء میں اس کا حریف ادارہ
”ہیولٹ پیکارڈ“ (Hewlett Packard) اسے مات دیتے
ہوئے عالمی طور پر کمپیوٹر فروخت کرنے والا سب سے بڑا
ادارہ بن گیا۔ اگلے سال ہی مائیکل ڈیل نے پھر اپنے
ادارے کی زمام اقتدار دوبارہ سنبھال لی اور پھر اس کے

میں مائیکل ڈیل (Michael Dell) ۱۹۹۲ء
کمپیوٹر تیار کرنے والے ایک ایسے
ادارے کا نوجوان ترین سربراہ اعلیٰ
تھا جو ”فارچون ۵۰۰“ کی فہرست میں شامل تھا۔ اُس نے
اپنی بیوی سوسان کے ساتھ ۱۹۹۹ء میں ”مائیکل اینڈ
سوسان ڈیل فاؤنڈیشن“ قائم کی جس کے اثاثے ایک
بلین ڈالر سے بھی زیادہ ہیں۔ جب ۲۰۰۳ء میں

گیا تو یہ اپنے ساتھ ملک کو بھی لے ڈوئیں گے۔
تو معلوم یہ ہوتا ہے کہ دونوں بچ کبہ رہے ہیں اور دونوں
نے ملک کو تباہ و برباد کرنے کی باریاں باندھ رکھی ہیں
اور ہم درمیان میں بیوقوف بنے، ہونفوں کی طرح
کھانے کے لیے کبھی گال ایک کے سامنے کر دیتے ہیں اور
اور کبھی دوسرے کی طرف، سمجھ کر کھاتے جاتے ہیں اور
سہلاتے جاتے ہیں۔ سیاستدانوں کا یہ ٹھیل گذشتہ
سال سے جاری ہے۔ ایک دوسرے سے ڈرا ڈرا
ہمیں الو بنایا ہوا ہے اور اپنا الو سیدھا کر رہے ہیں۔
ڈرا اور خوف کے اس ماحول میں ایک ہستی ایسا
ہے جس سے ہمیں سب سے زیادہ پیار کرنا چاہیے
مولوی صاحبان نے کوشش بھر پوری ہے کہ اس کا خوف
کسی طرح ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے یہ کوشش
اس انداز سے کی ہے کہ اللہ کا خوف تو پیدا نہیں ہوا
اللہ سے ڈرانے والے مولوی صاحب سے سب ڈر
لگے ہیں۔ ہم نے خود ہی تکفیر کی مہر اپنے قبضے میں
ہے اور اس سے لوگوں کو الگ سے ڈراتے رہتے ہیں
باقی مذاہب والے لوگوں کو کھینچ کھینچ کر اپنے مذہب
لاتے ہیں، یہ پہلے سے موجود کوکیوں بہانوں سے
نکلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اگر ایمان کسی نہ کسی
مولوی صاحب کی دستبرد سے بچ نکلے تو پھر نکاح
شامت آ جاتی ہے جسے توڑنا اور پھر جوڑنا مولوی
صاحبان کا محبوب مشغلہ بنتا جا رہا ہے۔ بعض حضرات
مخالف فرقے کی مسجد میں داخلے پر بھی نکاح کر
جانے کی نوید سن دیتے ہیں۔ ہم نے ایک مولوی صاحب
کی توجہ اس طرف دلائی تو فرمانے لگے..... ”جس
نکاح عزیز ہو ایسی مسجد میں جائے کیوں۔“ شاید
لئے بہت سے لوگ مسجدوں میں قدم کانی غور و خوض
بعد ہی رکھتے ہیں کہ نکاح بچ بھی گیا تو کسی خوش
ہاتھوں زندگی کی ڈور بھی نہ ٹوٹ جائے۔ باقی سب
اس ڈر کے آگے پانی بھرتے نظر آتے ہیں۔

زندگی نام ہے ڈر ڈر کے جئے جانے کا
اچھے بھلے سوئے ہیں، صبح اٹھتے ہیں تو بجلی، گیس یا
پٹرول میں سے کسی نہ کسی کو اوپر والی منزل پر پہنچنے سے
باہر بیٹھے منہ چڑاتے ہوئے پاتے ہیں کہ آؤ پکڑ سکتے ہو
تو پکڑ لو۔ بچا کھچا پورا زور لگا کر کسی نہ کسی طرح اوپر
والی منزل پر پہنچتے ہیں تو یہ ظالم چھلا لگا کر ایک منزل
اور اوپر چلے جاتے ہیں۔ یتیمیت تو آسمان سے باتیں
کرنے لگی ہیں، کوئی ہمیں بھی بتائے کہ ہم دل بہلانے
کے لیے کس سے باتیں کریں۔
دنیا میں کامیابی کا راز دوسروں کو کامیابی کے ساتھ
ڈرانا ہے۔ ہر خوف اور ڈر اس وقت تک زیادہ وحشت
ناک نظر آتا ہے جب تک مجسم حقیقت بن کر سامنے نہیں
آ جاتا۔ خوف حقیقت کا روپ دھار لے تو پھر وہ خوف
نہیں رہتا اور اس سے دودھ ہاتھ کرنے آسان ہو جاتے
ہیں۔ جب تک توپ کا پہلا گولہ نہیں چلتا، جنگ کی
صورت میں موت کا خوف گہرے تاریک بادلوں کی
طرح ہر طرف چھایا رہتا ہے۔ مگر جب جنگ کا طبل بج
اٹھتا ہے اور موت اور زندگی کا حقیقی ٹھیل شروع ہو جاتا
ہے اس کے ساتھ ہی موت کا خوف بھی ہوا ہو جاتا
ہے۔ اسی لئے عقل مند کہتے ہیں کہ مارے سے ڈرایا
بہتر ہے۔ قانون کی کتابیں، پولیس، وکلاء، عدالتیں اور
جیلیں تمام ڈر اور خوف کی مختلف علامتیں ہیں جن کی مدد
سے ایک دنیا کو قانون ہاتھ میں لینے کے نتائج سے ڈرا
دھمکا کر لا قانونیت سے روکا جاتا ہے۔ ڈر اور خوف سے
فائدہ اٹھانے والوں میں سب سے اونچا مقام
سیاستدانوں کا ہے جو ووٹروں کو اس وقت تک اپنے
مخالفین سے ڈراتے رہتے ہیں جب تک وہ ان کے حق
میں ووٹ دینے کے لیے تیار نہیں ہو جاتے۔ اقتدار میں
آ جائیں تو عوام کو یہ ڈراوے دینے شروع کر دیتے ہیں
کہ ہم نہ رہے تو ملک بھی نہیں رہے گا۔ دوسری طرف
حزب اختلاف شور مچاتی ہے کہ انھیں جلد رخصت نہ کیا

بعد سے اس ادارے کی پیداواری صلاحیت میں شاندار اور قابل قدر اضافہ ہو چکا ہے اور اس کے منافع میں بھی بترتیب بہتری آتی جا رہی ہے۔

”Success“ نامی جریدے کے ۱۹۹۹ء کے شمارے میں سرورق کی کہانی میں ڈیل نے وہ راز بتا دیے جن کے ذریعے اس نے بلین ڈالر مالیت کا ادارہ تشکیل دیا تھا۔

ایک بار مائیکل ڈیل یونیورسٹی آف ٹیکساس برنس سکول میں ”آج کی اہمیت، حیثیت اور کردار“ کے موضوع پر طالب علموں سے خطاب کر رہا تھا تو ایک منہ پھٹ طالب علم اٹھ کھڑا ہوا اور اس نوجوان دولت مند شخص سے پوچھنے لگا کہ وہ ابھی تک کیوں کام کیے جا رہا ہے۔ اس نے منہ پھاڑ کر پوچھا ”آپ کے پاس اس قدر کثیر دولت ہے، آپ اپنا یہ ادارہ فروخت کیوں نہیں کر دیتے اور سیرویاحت کے لیے کشتی کے ذریعے جزائرِ غرب الہند کیوں روانہ نہیں ہو جاتے؟“ ڈیل نے اس نوجوان طالب علم کو گھوڑا اور کہنے لگا ”کشتی کی سیر نہایت بیزارگن ہے۔“ ڈیل نے برنس سکول کے طالب علموں سے کہا: ”کیا تمہیں معلوم ہے کہ بلین ڈالر مالیت کے ایک ادارے کا انتظام و انصرام کس قدر دلچسپ اور لطیف آمیز کام ہے؟“

دراصل چند لوگ ہی اس کے سوال کا جواب دے سکتے تھے۔ لیکن جواب سے کہیں اہم ڈیل کا وہ سوال ہے جو ڈیل کمپیوٹر کارپوریشن کے بانی کے متعلق ہے اور یہ بھی کہ کس طرح یہ دولت مند آجر، اس قدر تیزی کے ساتھ کامیابی حاصل کرنے میں کامیاب ہوا؟

۱۹۸۳ء میں اس نے ایک ہزار ڈالر اور اس عزم کے ساتھ اپنے ادارے کا آغاز کیا کہ وہ اپنے گاہکوں کو کمپیوٹروں کی براہ راست فروخت کے ذریعے اپنے حریفوں کو مات دے سکتا ہے۔ یہ ایک نہایت ہی سادہ اور انقلابی خیال تھا جس نے کمپیوٹر کی دنیا کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا۔ ۱۳ سال بعد، گاہکوں کو کمپیوٹر کی براہ راست فروخت کے ذریعے اس ادارے نے تقریباً

۱۸ بلین ڈالر کی آمدن حاصل کی۔ اس نے یہ کارنامہ کیسے انجام دیا؟ وہ یہ معرکہ اس لیے انجام دینے میں کامیاب ہوا کہ اس نے دولت اکٹھی کرنے کے بجائے نہایت ثابت قدمی سے اپنے کاروباری امور پر اپنی توجہ مرکوز کی۔ جب آپ ٹیکساس کے راؤنڈراک میں ڈیل کمپیوٹر کارپوریشن کے صدر دفتر میں ایک سادہ سے دفتر میں داخل ہوتے ہیں تو آپ کو ایک شخص اپنی میز پر چپچہ چپوترے پر کھڑا نظر آئے گا جو اپنی سوچوں میں گم اور اپنے کام میں مستغرق ہے۔ مائیکل ڈیل کے دفتر میں صرف ملاقاتیوں کے لیے گریسٹ دھری ہیں۔ ڈیل کھڑا ہو کر کام کرتا ہے اور اس کا یہ انداز کار ایک ایسے صنعتی ادارے کے لیے بہت ہی مناسب ہے جس کے اثاثے ۱۷ دن کے اندر حیران کن حد تک کم ہو سکتے ہیں۔ جن کا تقابل مخالفین کے انہی یا زیادہ دنوں کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ (کمپیوٹر کی صنعت میں ہر منٹ اثاثوں کی مالیت میں ایک فیصد کی واقع ہو جاتی ہے، لہذا ڈیل کے ادارے کی کامیابی کے لیے اثاثوں کی ناقابل تخفیف حیثیت بہت ہی اہم ہے)۔

ایک معاشرہ اعلیٰ اور بلند مقاصد کے حامل افراد اور نئی اختراعات کے حامل کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک دیکھنا چاہتا ہے، لہذا ڈیل کی انتہائی سادگی کچھ حد تک ناقابل یقین ہے۔ اگر اس کی شخصیت کا نرم الفاظ میں جائزہ لیا جائے تو ڈیل وحشی یا پاگل نہیں ہے۔ اس کی رنگت سیاسی مائل، اس کا لہجہ نرم اور معقول حد تک ہنر ہے اور اس کی غلافی آنکھیں اس کثیر المالیت ادارے کے انتظام و انصرام میں طویل اوقات تک بیدار رہتی ہیں۔ وہ آئسن ہل کاؤنٹی کے ایک شاندار گھر میں اپنی بیوی سوسان اور اپنے ۴ کم سن بچوں کے ساتھ رہتا ہے اور مختلف خیراتی اداروں کو نہایت فیاضی کے ساتھ امداد دیتا ہے۔ وہ فضول قسم کی گفتگو کا شائق نہیں، اس کے نزدیک سب سے قابل فہم اور اہم کام یہ ہے کہ وہ اپنے گاہکوں کے متعلق فکرمند رہتا ہے کہ انہیں اپنی طرف

راغب کیسے کیا جائے۔

ڈیل کی کامیابی کو ایک تجارتی معجزہ قرار دیا جاسکتا ہے لیکن اس سے بھی زیادہ اہم امر یہ ہے کہ اس کی اس حکمت عملی کے متعلق فہم حاصل کیا جائے جس کے ذریعے وہ ایک ادنیٰ رہائشی کمرے سے اٹھ کر اعلیٰ درجے کے افسرانہ اور شاہانہ دفتر میں پہنچ گیا۔ جب وہ ٹیکساس یونیورسٹی کے کمپیوٹر کے طالب علم کی حیثیت سے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کے آغاز کے بارے بات کرتا ہے تو آپ کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس نے اپنے کاروبار کا آغاز ”گاہکوں کی تلاش“ پر مبنی بنیادی آجڑانہ حکمت عملی کے ذریعے کیا۔ ڈیل کا کہنا ہے ”میں ہر ممکنہ موقع کی تلاش میں رہتا تھا۔ کمپیوٹر میں مجھے ابھی بھی بہت دلچسپی ہے۔ اس کاروبار میں موجود امکانات اور مواقع مجھے واقعی بہت پسند ہیں۔“

میں نے دیکھا کہ آپ ایک کمپیوٹر تقریباً ۳ ہزار ڈالر ادا کر کے خریدتے اور اس کے اندر ۶ سو ڈالر کی مالیت کے پڑے ہوتے۔ آئی بی ایم ان میں سے زیادہ تر پڑے دوسرے اداروں سے خرید لیتا، انہیں باہم جوڑ لیتا اور مکمل کمپیوٹر دکان دار کو ۲ ہزار ڈالر کے عوض فروخت کر دیتا۔ پھر کمپیوٹر کی فروخت سے نابلد دکان دار اسے ۳ ہزار ڈالر کے عوض فروخت کر دیتا جو پہلے سے کہیں زیادہ تکلیف دہ امر ہوتا۔“

جب اس سے یہ پوچھا گیا کہ کیا ۱۹ سال کی عمر میں اسے یہ فہم تھا کہ وہ کمپیوٹر کی منڈی میں کس طرح انقلاب برپا کر رہا ہے تو اس کا جواب یہ تھا ”ہم نے گاہکوں کی تعداد میں اضافے کے ذریعے اپنے ادارے کا آغاز کیا اور معقول حد تک دلچسپ امر تو یہ ہے کہ ہم نے یہ اس لیے نہیں کیا کہ ہم نے مستقبل کی شاندار جھلک دیکھ لی تھی۔ درحقیقت ہمارے پاس وسیع پیمانے پر مصنوعات تیار کرنے کے لیے سرمایہ نہیں تھا۔“

اس طرح ابتدا ہی میں ڈیل کو شاندار کامیابی نصیب ہوئی اور وہ آغاز ہی سے خوش قسمت ثابت ہوا۔ جب اس

نے نکل کے چند جوڑ لگا کر پہلا نمونے کا کمپیوٹر تیار کیا تو پھر اس نے بمشکل ہی اپنا یہ کاروبار ترک کیا۔ اس کے بجائے اس نے معلومات اور فنی مہارت کے استعمال کے ذریعے لاکھوں انفرادی گاہکوں کو اپنی مصنوعات فروخت کرتے ہوئے اپنے کاروبار کو مزید وسیع کیا اور آج کاروباری ماہرین نے ”وسیع گاہکی“ کو مستقبل کا صنعتی استعارہ قرار دیا ہے جس طرح زیادہ سے زیادہ پیداوار بیسویں صدی کی صنعتی ترقی کا استعارہ ہے اور جب کہ اکثر ادارے ”وسیع گاہکی“ کی طرف مائلت ہو رہے ہیں (اب کوئی بھی شخص انفرادی طور پر ”لیوی سٹراس“ سے جینز یا ”بی ایف ڈبلیو“ سے کار خرید سکتا ہے)۔ ڈیل کی طرف سے اس حکمت عملی کا بھرپور ذہانت اور مستقل مزاجی پر مبنی استعمال زیادہ سے زیادہ فروخت کا باعث ثابت ہوا۔

ایک سو سال پہلے، تھامس ایڈیسن نے ”Success“ نامی جریدے کو بتایا تھا کہ کامیابی کے لیے پہلی شرط ایک واحد مسئلے پر توجہ مرکوز کرنے کی صلاحیت ہے۔ ”اگر آپ صبح اربے بجے اٹھتے ہیں اور رات ۱۱ بجے سوتے ہیں تو آپ کے پاس ۱۶ کارآمد اور مفید گھنٹے موجود ہوتے ہیں اور یہ امر یقینی ہے کہ اکثر افراد اس تمام وقت میں کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ مسئلہ صرف یہ ہے کہ وہ اس دوران کئی ایک کام کرتے ہیں لیکن میں صرف ایک ہی کام کرتا ہوں۔“

اس ضمن میں ڈیل (Del) اور ایڈیسن (Edison) روشن مثالیں ہیں۔ گزشتہ ۱۲ برس سے مائیکل ڈیل نے کم از کم قیمت پر کمپیوٹر فروخت کرنے والی ٹیم تیار کرنے پر مبنی واحد نکتے پر اپنی توجہ مرکوز رکھی ہے۔ اگرچہ ایڈیسن کی مانند وہ دنیا میں انقلاب آفریں موجد نہیں ہے، ڈیل اپنی اس صنعت کو نئی زندگی بخشنے، ایک عالمی معیار کا کاروباری ادارہ تشکیل دینے اور اپنے ساتھ ہزاروں ملازمین اور حصہ داروں کو دولت مند بنانے میں کامیاب رہا ہے۔ ایک کالج سے ادھوری تعلیم حاصل کرنے والے ۳۳ سالہ نوجوان کے لیے یہ سب کچھ اس قدر بڑا نہیں ہے۔

اچانک روشنی چمکنے سے فریاد و اچھا لڑا آنکھوں میں حیرت لیے نہیں دیکھ رہا تھا

تنزانیہ کے جنگلوں میں 5 دن

”میرا دل کبھی ہاتھی کے شکار کو مچلتا تو کبھی دھاری دار زبروں کو دیکھ کر ادھر لپکتا مگر میں پہلا نشانہ ۲۵ رائج چوڑے خطرناک سینگوں والے ایک بھینسے کا لے بیٹھی“

شکار کے ساتھ تصویریں بنوانے کی شوقین ایک شکارن کی دلچسپ روداد وہ جانتی تھی کہ نشانہ خطا ہونے کی قیمت بھی ادا کرنا پڑتی ہے

ڈیانا

کیا تم اس جنگلی بھینسے کو دیکھ رہی ہو.....؟ پیٹر نے آنکھوں سے دور بین ہٹائے بغیر مجھ سے پوچھا: ”بالکل..... وہ سب سے منفرد بڑا نظر آتا ہے۔“

میں گھاس کے آخری سرے پر کھڑے اس بھینسے کو دیکھتے ہوئے بولی: ”میں نے اتنا شاندار جنگلی بھینسا آج تک نہیں دیکھا تھا۔“

اس کے تیز، نوکیلے غم دار سینگ دھوپ میں چمک رہے تھے۔ سینہ چوڑا اور جسم خوب بھرا ہوا تھا۔ میدان میں کھڑے باقی بھینسوں سے بلاشبہ وہ منفرد تھا۔ ہم اپنی شکاری جیب میں ان سے کوئی ۵۰ گز دور کھڑے تھے۔ بھینسوں نے ہمیں دیکھ لیا تھا مگر وہ خوفزدہ ہو کر بھاگے نہیں اور آرام سے گھاس چرنے میں مگن تھے۔ شاید وہ تھک گئے تھے کیونکہ گزشتہ ایک گھنٹے سے ہم مامبو کے جنگلوں سے ان کا پیچھا کرتے ہوئے گھاس کے اس میدان تک آئے تھے۔ ہم بھی اب مزید قریب جا کر انہیں ہراساں کر کے بھگانا نہیں چاہتے تھے۔ سو وہیں سے نشانہ باندھنے لگے۔ میں نے بھی اپنی ۳۷۵ پوری رائفل سیدھی کی اور اس شاندار بھینسے کے سینے کا نشانہ باندھ لیا۔ جیب میں سب دم سادھے بیٹھے اپنی اپنی دور بینوں سے دیکھ رہے تھے۔ ”میرا خیال ہے کہ سینے کے بجائے تم پہلو کا نشانہ لو“۔ پیٹر نے مجھ سے کہا۔

پیٹر ایک ماہر شکاری تھا۔ جانتا تھا کہ سینے کا نشانہ خطا ہونے کے امکانات زیادہ ہیں۔ میں نے سر ہلا دیا۔ میں اچھی طرح جانتی تھی کہ ریوڑ کسی بھی وقت دوبارہ بھاگ سکتا ہے مگر مجھے یہ بھی علم تھا کہ ۳۵ رائج چوڑے سینگوں والا بھینسا نشانہ خطا ہونے پر ہمارے اوپر پڑھ سکتا ہے۔ ویسے اس بات کا قوی امکان تھا کہ ایک طرف کی گھاس کھانے کے بعد بھینسا رخ بدلے گا۔ تب مجھے پہلو کا نشانہ لینے کا موقع مل جاتا۔ سو ہم انتظار کرنے لگے۔ میں گہرے سانس لے کر خود کو پُرسکون کرنے لگی۔ میں نے بھینسوں کے شکار کے متعلق کافی پڑھا تھا۔ پیٹر نے بھی میری معلومات میں

گراں قدر اضافہ کیا تھا مگر عملی طور پر بھینسے کا یہ میرا پہلا شکار تھا۔ پیٹر نے مجھے بتایا تھا کہ جنگلی بھینسا اگر نشانہ خطا ہونے پر ڈھی ہو جائے تو وہ افریقہ کے خطرناک ترین جانوروں میں سے ایک ہوتا ہے۔ اس لیے کسی قسم کی غلطی مجھ سمیت میری پوری ٹیم کی جان کو خطرے میں ڈال سکتی تھی۔ اچانک بھینسا مڑا اور میں نے اس کے پہلو کا نشانہ باندھ لیا۔ جیب میں باقی ۷ لوگ دم سادھے بیٹھے تھے۔ میں نے ایک گہرا سانس لیا اور آنکھیں بھینسے پر جماتے ہوئے لمبی دبا دی۔ رائفل نے شعلہ اگلا اور بھینسا چند قدم بھاگ کر ڈھیر ہو گیا۔ باقی ریوڑ بھاگ اٹھا۔ ہم بھینسے کے پاس پہنچے۔ پیٹر نے بھینسے کے ساتھ میری ڈھیر ساری تصویریں بنائیں۔

اس صبح ہم نے ناشتے اور کافی کے بعد ساڑھے ۶ بجے اپنی مہم کا آغاز کیا تھا۔ ہماری ٹیم میں میرا شوہر سکاٹ، رینجر سام، گائیڈ مارٹن اور فلکر، مقامی کومبو اور زمبابوے سے آئے ہوئے ۲ ماہر شکاری پیٹر اور مشاک شامل تھے۔ میں بہت خوش تھی۔ آج ہماری سفاری کا پہلا دن تھا اور میں نے شاندار بھینسا شکار کر لیا۔ اس رات ہم نے آگ کے گرد بیٹھ کر بھینسے کے لذیذ تنکے کھائے اور ارادہ کیا کہ اپنی مہم کے دوران ہر روز ایک بھینسا شکار کریں گے۔

سفاری کے دوسرے روز ہم نے بھینسوں کے کھروں کے نشانات کا پیچھا کیا اور ایک بڑے ریوڑ کے قریب پہنچ گئے۔ سکاٹ نے ۳۷۵ گز کے فاصلے سے ایک بھینسے کا نشانہ لیا مگر اس کا کندھا مل گیا اور بھینسا ڈھی ہو کر بھاگ اٹھا۔ ہم نے اس کا پیچھا کیا۔ سکاٹ کی مزید تین گولیوں سے وہ ڈھیر ہو گیا۔ یہ ہماری مہم کا تیسرا دن تھا۔ اب ہم مقامی زبان کے لفظوں سے بھی کچھ مانوس ہو گئے۔ خصوصاً بھینسے کا نام مجھے بہت دلچسپ لگا۔ وہ اسے ”نیاتی“ اور ”مبوگو“ کہتے تھے۔ تیسرے دن کی صبح بہت خوبصورت تھی۔ سورج نکل رہا تھا اور شفق کی لالی پھیل رہی تھی۔ آسمان پر رنگ برنگ پرندے اڑ رہے تھے۔ ان کی چہچہاہٹ اور سریلی گیتوں نے فضا کو معطر کر دیا۔ ہم نے جس جگہ خیمے لگائے، وہ ۱۵ ہزار

اس میں کھانا پکانے، لینے اور بہت سا سامان رکھنے کی سہولت موجود تھی۔ چھت ضرورت کے مطابق کھولی اور بند کی جاسکتی تھی۔ فوجی بکروں کی طرح اس پہ دو مقامات پر رائفلیں نصب کر کے نشانہ باندھنے کی سہولت بھی موجود تھی۔ آج رات ہمیں اسی سہولت سے فائدہ اٹھانا تھا۔ ہم ان مقامات کی سمت بڑھے جہاں تیندوے ملنے کے قوی امکانات تھے۔ ہمارے گائیڈ مارٹن اور فلکر علاقے سے پوری طرح آگاہ تھے۔ پیٹر بھی پہلے کئی شکاری سفاریوں کے ساتھ یہاں آچکا تھا۔ میں اور سکاٹ پہلی بار شکار کے لیے تزانیا آئے تھے۔ سکاٹ اس سے پہلے کئی ملکوں میں شکاری مہموں پر جا چکا تھا جب کہ میری یہ دوسری شکاری مہم تھی۔

خیر ہم مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے بڑھے۔ راستے میں ہاتھیوں کا ایک ریوڑ دیکھا۔ ان میں سے دو ہاتھیوں کے بلے بلے ہاتھی دانت دیکھ کر میرے اور سکاٹ کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پیٹر ہمیں دیکھ کر مسکرایا اور کہنے لگا: ”دوستو! پہلے تیندو تو شکار کر لو۔ پھر دوسرے جانوروں کو بھی نشانہ بنالینا۔“ ہم نے راستے میں زبرا اور زرافے بھی دیکھے، یہ افریقہ تھا، جہاں کے جنگل اور میدان شکاریوں کے لیے بہترین تھے ہیں۔ یہاں آنے والا شکاری اگر ایک جانور کے شکار کی نیت سے آیا ہو تو باقی جانور دیکھ کر خود بخود اس کا دل لچانے لگتا ہے۔ ایسی ہی حالت اس وقت میری ہو رہی تھی۔ شکار کا لطف گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ میرا دل کبھی ہاتھی کے شکار کو چلتا تو کبھی دھاری دار

”اُسے لگا تیندو ابھا گئے کو ہے،
سواس نے گولی چلا دی“

زبروں کو دیکھ کر۔ میں نے پیٹر سے کہا: ”کیوں نہ پوچھوں میں ایک زبرا شکار کر لیا جائے آج.....؟“
پیٹر نے مسکراتے ہوئے کہا ”پہلے ہم تیندوے کے لیے چارہ ڈال آئیں پھر وقت بچا تو زبرے پر قسمت آزمائی کر لیتا۔“

کچھ دور جانے کے بعد پیٹر نے جیب رکاو دی۔ وہاں درختوں کے چھوٹے چھوٹے جھنڈ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر تھے۔ جھاڑیاں بھی خاصی تعداد میں تھیں۔ ارد گرد کا جائزہ لینے کے بعد پیٹر نے ہمیں کی ران ایک درخت پر بندھوائی اور دوسری پچاس گز دور ایک دوسرے درخت پر..... جیب کھڑی کرنے کے لیے اس نے جھاڑیوں کے ایک جھنڈ کا انتخاب کیا جو دونوں درختوں کے درمیان تھا۔ تاکہ جیب چھپی رہے اور ہمیں جیب سے دونوں درخت باسانی نظر آئیں اور ہم نشانہ باندھ سکیں۔ پھر پیٹر نے مجھے اور سکاٹ سے کہا کہ ہم دور بین سے دیکھیں ہمیں دونوں چارے ٹھیک سے نظر آ رہے ہیں؟ پھر پیٹر نے ہمیں جیب میں کھڑے ہو کر نشانہ باندھنے اور لگانے کی مشق کرائی۔ وہ ایک بہت اچھا استاد ثابت ہو رہا تھا۔ ایسا استاد جو اپنے شاگردوں کو ہر کوشش میں کامیاب دیکھنا چاہتا ہے۔

شام ہو چکی تھی اس لیے واپس جا کر زبرے کا شکار کرنا ناممکن نہیں تھا سو ہم جیب میں ہی کھانا کھا کر رات ہونے اور تیندوے کا انتظار کرنے لگے۔ چاند نکل آیا، رات گہری ہو رہی تھی۔ ہم سب وقتاً فوقتاً دور بین سے دونوں

درختوں پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ یہ تقریباً رات ایک بجے کا وقت تھا جب پیٹر کو درخت میں پانچل محسوس ہوئی۔ ہم نے ساتھ لائی ہوئی سپاٹ لائٹ کو بھی درخت پر فوکس کر رکھا تھا۔ پیٹر دور بین سے دیکھنے لگا اور پھر اس نے سکاٹ کو اشارہ کیا کہ اس کے نشانہ باندھنے کا وقت آچکا ہے۔ اس نے سکاٹ کے کان میں مزید سرگوشی کی ”تم خوش قسمت ہو کہ ہمیں پہلی بار چارہ ڈالنے پر ہی تیندوے کو شکار کرنے کا موقع مل گیا ہے۔ اب یہ تم پر ہے کہ تم کتنی مہارت اور بھرتی سے نشانہ لگاتے ہو۔ میں سپاٹ لائٹ چلاؤں گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس کی روشنی پڑتے ہی تیندو ابھاگ جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ گوشت کی دعوت اڑاتا رہے۔ سو تم نشانہ باندھ کر لمبی دھانے میں بھرتی دکھانا۔“

پیٹر نے سکاٹ کو تیار رہنے کا اشارہ کیا اور سپاٹ لائٹ چلا دی۔ اب ہم تیندوے کو واضح طور پر دیکھ سکتے تھے۔ یہ ایک نوجوان نر تیندو تھا۔ وہ ایک دم روشنی چلنے پر کچھ حیران پریشان سا ہو گیا اور اپنی چمکدار آنکھوں سے جیب کی طرف دیکھنے لگا۔ سکاٹ نشانہ باندھ چکا تھا۔ اسے لگا کہ تیندو اہل بھانگے کو بے سواس نے گولی چلا دی۔ گولی تیندوے کے پیٹ پر لگی۔ وہ دھڑام سے درخت سے نیچے گرا۔ اس نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر چند قدم دور جا کر گر گیا۔ ہم نے جیب شارٹ کی اور تیندوے کے قریب لے آئے۔ سکاٹ کی گولی بالکل نشانے پر لگی تھی۔ ہمارے وہاں پہنچنے تک تیندو اٹھنڈا ہو چکا تھا۔ سکاٹ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ یہ اس کا دوسرا تیندو تھا۔ پہلا تیندو اس نے دو سال قبل زمبابوے میں شکار کیا تھا۔

میں نے سکاٹ کے نشانے کی داو دی۔ پیٹر اسے سکاٹ کی خوش قسمتی قرار دے رہا تھا کہ اس نے پہلی ہی رات میں شکار مار لیا۔ ہم نے تیندوے کے ساتھ جی بھر کر تصویروں بنائیں اور پھر اسے جیب میں ڈال کر اپنے خیمے کی طرف لوٹ آئے۔ کیونکہ رات جنگل میں اس جگہ گزارنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ ہمیں لکڑیوں کی آوازیں آرہی تھیں۔ اس سے لگتا تھا کہ

شیر بھی کہیں قریب ہی ہے۔ ہم نے آہستہ سے جیب چلاتے ہوئے اپنے خیموں میں جا کر ہی رات گزارنے میں عافیت جانی کیونکہ وہ ایک محفوظ جگہ پر تھا۔ اس کے ارد گرد خار دار تاروں کی باڑ بھی بنی ہوئی تھی۔ ہم حکومت کی طرف سے شکار کا باقاعدہ پرمٹ لے کر آئے تھے۔ یہ حفاظتی انتظامات بھی حکومت کی طرف سے کیے گئے تھے کیونکہ اکثر سفاری اور شکاری ٹیمیں اسی جگہ پر خیمے لگاتی تھیں۔ رات کے ۳:۳۰ بج رہے تھے جب ہم خیمے میں پہنچے۔ سکاٹ کو تو خوشی کے مارے نیند نہیں آرہی تھی مگر بانی سب تھکے ہوئے تھے سو اپنے اپنے خیموں میں جا کر سو گئے۔

اگلے دن صبح میرا اٹھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا مگر سکاٹ نے مجھے زبردستی اٹھا دیا کیونکہ آج ہماری سفاری کا آخری دن تھا۔ وہ مجھے چھیڑتا ”ٹھیک ہے ٹھیک ہے، تم سوئی رہو..... میں تو آج وہ خوبصورت زبرا شکار کروں گا جسے دیکھ کر کل تمھارا جی لچلتا تھا..... میری مہم کا آج آخری دن ہے، تم اسے سو کر ضائع کر لو، میں نہیں کروں گا۔“ باہر سے آنے والی آوازیں بتاتی تھیں کہ سب اٹھ گئے ہیں اور ناشتہ بھی تیار ہے۔ ”باقی کی نیند گھر جا کر پوری کر لینا۔“ سکاٹ نے جب مصنوعی ناراضگی سے کہا تو ناچار مجھے اٹھتے ہی بنی۔ میں نے سکاٹ سے کہا کہ وہ جا کر ناشتہ کرے، میں ۲۰ منٹ میں تیار ہو کر پہنچتی ہوں۔ جب میں تیار ہو کر پہنچی تو واقعی سب تیار اور ناشتہ کر رہے تھے۔ میں بھی منہ ہاتھ دھو کر جلدی سے ناشتہ کرنے بیٹھ گئی۔ پیٹر کہنے لگا: ”آج آپ کی مہم کا آخری دن ہے۔ میں پوری کوشش کروں گا کہ اسے آپ کے لیے گزشتہ دنوں سے زیادہ بھرپور اور یادگار بنا دوں۔“ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور سکاٹ سے پوچھا کہ کیا واقعی وہ آج زبرے کے شکار کا ارادہ رکھتا ہے؟ سکاٹ نے اثبات میں گردن ہلا دی۔ ہمارا قلعی اور باورچی کو مہو کھال اتارنے سے لے کر شکاری گوشت کو لذیذ اور مزیدار بنانے میں بے حد ماہر ہونے کے ساتھ ساتھ کافی بھی بہترین بناتا تھا۔

ایک عبرت اثر عہد کی کہانی، بادشاہت کے درخت کو دیمک لگی تھی
تھے پر کلہاڑیاں چل رہی تھیں مگر شاخوں پر شعروں کے پرندے چہچہاتے تھے
آخری نعل تاجدار نے اپنے لیے تخلص بھی بادشاہوں جیسے منتخب کیے تھے
ایک بادشاہ کا ماجرا

ظفر، شوق رنگ

اس پرانی ہی بادشاہی کے خلاف
سازش اور بغاوت کرنے کا الزام تھا

مختار زمن



۱۲ برس کے ظفر کے سامنے دادا شاہ عالم کی آنکھیں غلام قادر روہیلہ نے
خنجر سے نکال کر یوں پھینک دی تھیں جیسے پھل سے بیج پھینکا جاتا ہے

اس پر بیٹھ بولا: ”سکات! میں کوشش کروں گا کہ
آپ بھی زیرے کی خوبصورت کھال اپنے ساتھ لے
سکیں..... ہم ان کا پیچھا کریں گے۔ کچھ دور جا کر آپ بھی
ایک زیرہ شکار کر سکتے ہیں۔“

سکات مسکرانے لگا۔ اس دوران میں نشانہ بانڈھ
چکی تھی۔ میں نے لمبی دبا دی۔ گولی سیدھی زیرے کی
گردن میں لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ باقی ریوڑ بھاگ
اٹھا۔ ہم نے شکار شدہ زیرہ اچپ میں ڈالا اور ریوڑ کا
پیچھا کرنے لگے۔ ہم نے درمیان میں خاصا فاصلہ رکھا
تاکہ ہم پہلے کی طرح بے خبری میں انھیں جا لیں۔ غور
بھر بھاگنے کے بعد ریوڑ ایک جگہ رک گیا، ہم نے بھی
جب روک دی اور زمین پر رینگتے ہوئے ریوڑ کی طرف
بڑھنے لگے۔ قریب پہنچ کر ایک بھاڑی کے پیچھے چھپ
کر سکات نشانہ باندھنے لگا۔ پیٹر اس کی ہمت بڑھا رہا
تھا۔ سکات نے نشانہ باندھ کر لمبی دبا دی۔ گولی زیرے
کی آنتوں کو چیرتی ہوئی اسے وہیں ڈھیر کر گئی۔ باقی
ریوڑ ایک بار پھر خوفزدہ ہو کر بھاگ اٹھا۔

ہم نے دونوں زیروں کے ساتھ جی بھر کر تصویروں
بنائیں۔ ۶ بج رہے تھے، شام ہو رہی تھی۔ ہم نے
دونوں زیروں کو چپ میں ڈالا اور واپس شہر کی طرف
روانہ ہو گئے۔ تفرانیہ میں ہماری شکاری سفاری تو
سے زیادہ کامیاب، دلچسپ اور تفریح سے بھرپور رہی۔ ہم
نے ہر دن ایک شاندار شکار کیا اور آخری دن تو دو شاندار
شکار کر ڈالے۔ پیٹر نے ٹھیک کہا تھا، اس نے آخری دن
ہمارے لیے دگنا یادگار بنایا۔ ہم نے پیٹر، مشاک، کوہو،
فلکر اور مارٹن کا شکریہ ادا کیا۔ وہ لوگ اگر اس قدر خلوص
اور محنت سے ہمارا قدم قدم پر ساتھ نہ دیتے تو شاید ہم
۵۰ دنوں میں ایک بھی شکار نہیں کر پاتے۔ ۵۰ دنوں میں
۶۰ شکار مجھے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ سکات تو اس قدر
خوش اور پُر جوش ہے کہ ابھی سے اگلے سال اسی ٹیم کے
ساتھ تفرانیہ کے جنگلوں میں ۵۰ نہیں بلکہ ۱۵۰ دن
گزارنے کا پروگرام بنا رہا ہے۔

ناشتے کے بعد اس کی بنائی لذیذ کافی پیتے ہوئے میں
نے اس سے کہا ”کوہو! میں تمھاری کافی کا ذائقہ گھر جا
کر بھی نہیں بھلا پاؤں گی۔“ وہ تو جیسے بے انتہا خوش ہو
گیا اور بولا: ”مادام میں بھی آپ لوگوں کا ساتھ کبھی
نہیں بھولوں گا۔“

ناشتے کے بعد ہم اپنا سامان سمیٹ کر جیب میں
بیٹھے اور اس جگہ روانہ ہوئے جہاں گزشتہ روز زیرے
دیکھے تھے۔ وہاں سے کچھ دور ایک ندی تھی۔ پیٹر جانتا تھا
کہ زیرے روزانہ اس جگہ سے مختلف اوقات میں گزرتے
ہیں۔ سو ہم نے ندی کے قریب بھاڑیوں میں بیٹھ کر
زیرے کے انتظار کا فیصلہ کیا۔ صبح سے دوپہر ہو گئی مگر کوئی
زیرہ نہیں آیا تو پیٹر خود ہی کہنے لگا ”اس طرح تو آپ کا
دن ضائع ہو جائے گا۔ ایسا کرتے ہیں جیب میں گھومتے
ہیں۔ مجھے امید ہے ہمیں جلد ہی زیرے مل جائیں گے۔“

سب نے اس بات سے اتفاق کیا۔ ہمارے گائیڈ
مارٹن اور فلکر ہمیں ان میدانوں کی طرف رہنمائی کرنے لگے
جہاں زیرہ ملنے کے قوی امکانات تھے۔ دوپہر کے ۳ بج
رہے تھے جب ہمیں زیروں کا ایک ریوڑ نظر آیا۔ ہم ان
سے تقریباً سو گز دور تھے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ جیب کا شور
انھیں ہراساں کر دے۔ سوا تر آئے اور پیدل چلتے ہوئے
ان کے قریب ہونے لگے۔ گروہ میں نر، مادہ اور چھوٹے
زیرے بھی موجود تھے۔ اب ہم زیروں سے تقریباً ۳۵ گز
دور تھے۔ وہ مگن چہ رہے تھے۔ انھوں نے شاید ہماری
موجودگی کو ابھی تک محسوس نہیں کیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ ہم دبے
پاؤں بھاڑیوں میں چھپتے چھپاتے آگے بڑھ رہے تھے اور
ہوا کا رخ ان کی جانب سے ہماری طرف تھا۔

میں اور سکات دونوں نشانہ باندھنے لگے تو پیٹر ہنسنے
لگا اور بولا: ”مسٹر سکات کیا خیال ہے، پہلے موقع مادام کو
نہ دیا جائے؟ کیونکہ اگر آپ دونوں نے ایک ساتھ گولی نہ
چلائی تو یا تو مادام شکار سے محروم رہیں گی یا پھر آپ.....“
سکات نے مسکراتے ہوئے کہا ”ٹھیک ہے ڈیانا، ہم
کا آخری دن تمھارے نام کرتے ہیں۔“

عجیب

نظارہ ہے! عجیب بھی اور دلچسپ بھی،
۳۳- سمرن چنوں کی بوری لگی ہوئی ہے۔
برٹشل کے ذریعے اسے بار بار چنگی
دیتے ہیں۔ ۳۴- سمرن پختہ کی بوری، جو
نئے نہ اٹھے، اسے گویا چنگی
دے، دلی کالال قلعہ گواہ ہے کہ آج سے
واقعہ تقریباً یاروز ہوتا تھا کہ بوری دیوان
سے ہے، سلطنت مغلیہ کے ولی عہد ابو
مرزا ابراہن المخلص بن ظفر و شوق رنگ
نہن کے استاد ہیں۔ ۳۵- سمرن بو جھ چنگی
بھاری سے بھاری اور سخت سے سخت
پیر چلانانا کے بائیں ہاتھ کاکیل ہو
نماز آپا سنگھ کو اپنے شاگرد پر فخر ہے۔
ان سے تیر چلاتے ہیں، نشاندہ اڑاتے
میں میں چوتھے ہے، پیرا کی میں لا جواب
چلیاں تڑپتی ہیں اور جمنہ کی مچھلیاں
نہ والوں نے یہ بھی دیکھا کہ سر پر سے
اڑا، ہندوق چھتیاں نے کامیاب کہاں،
دوٹک دی۔ بال باندھا نشانہ، چڑیا کوٹ
میں آگری۔ دریا میں مگر چھ نے
پیڑی نہیں۔ سواری جاری ہے۔ ابو
کی پیڑہ پر یوں بیٹھے ہیں گویا ستون

قارئین کی سہولت کے لیے عہدِ رفتہ کی اس خوبصورت تحریر کے مشکل الفاظ اور معنی

۳۔ من پختہ کی بوری (پورے تین من کی بوری)۔ جرققل (بھاری بوجھ اٹھانے کا آلہ)۔ رعنا (انماز سے چلنے والا، سیر، چالاک، طرار)۔ بھد (بے ہوشی)۔ ہودے (ہاتھی پر بیٹھے کی عمارت)۔ روزینہ (روزانہ تخواہ، خوراک جو روزانہ ملے)۔ نقش پائیاں (پاؤں کی جوتی)۔ اُلش (بچا ہوا کھانا)۔ مرحمت (عنایت، مہربانی)۔ قاب (بڑی رکابی، قندیل)۔ ل (موروں کے پروں کا چنور)۔ کش بردار (ادنی ترین، غلام)۔ دسہرہ (ہندوؤں کا تہوار)۔ نیل کٹھ (لکڑی کا ہندو)۔ ان (چاندی یا سونے کے تاروں کی ڈور)۔ زرققت (کم خواب، سونے اور ریشم کے تاروں سے بنا کپڑا)۔ من (ضرورت کی چھوٹی موٹی چیزیں بیچنے والا)۔ قنقن (توڑے دار ہندوق، لمبی نالی جس میں سے بھوک کے ذریعے جھینگے ہیں)۔ اقمیر (ملک)۔ تلمذ (شاگرد ہونا)۔ سرخان رن (مرد شخص جس سے کسی کو رنج نہ پہنچے)۔ بچ (بچہ)۔ رنگا رنگ کالا

کہ تو پل چلی، ادھر بادشاہ بیدار ہوئے، غسل خانے
جہاں جو نیوڑی کھلی، خوشبو دار مین، چنبیل، شہو، بیڑا،
تو اٹھ اب کے تیل سے بھری بوتلیں، چاندی، سونے کے
جنگ کرتے لوٹے لٹائیں رکھی ہیں۔ غسل کیا، لباسی
کئے، رت بیک سردار، نے لکھنؤی چکن کا کرتہ، لٹھے کا
برک پائے جامہ، دلی کا کر بند پیش کیا، مچلی کش پائیاں
غیم خانے کے داروغہ نے سر میں تیل ڈالا، کھنکھی
چرخہ دھڑکاتے گھٹاتے کیا تیج خانے میں تشریف لائے
رخت نقل پر ہے۔ ایوان خلعت میں مہتمم ادویات نے
حسن الذکی و خطی سر پہ ہیشی کی مہر توڑی اور یاقوتی
جلی جیش کی۔ اسے پی کر چنوں سے منہ صاف کیا۔
بچے۔ اور بج گئے افسران محکمہ کاغذات اور ملیں لے
کا حاضر ہوئے، ان پر احکام عالی کے، سرمہ کے قلم سے
خوبت ہوئے۔ اور بچتے بچتے کام ختم کر کے جہاں پناہ
کی طرف تشریف لے گئے۔ جسونی نے آواز لگائی۔

پہنچ و مرشد! حضور عالی، بادشاہ سلامت، عمر دراز، ظل
ہائی تحریف لاتے ہیں۔ زمانہ میں معلوم ہو گیا۔ بیگمات
شہزادوں اور قد کھڑی ہو گئیں۔ بادشاہ سلامت نے انہیں
کھانا کھانے، شیرینی داروغہ نے کسو کی مہر توڑی، جھنڈا
تھاڑا کیا۔ بادشاہ نے نوش کیا اور گل وایلوں سے کچھ دیر
کھیں۔ خادمہ مہتاب نے عرض کیا ”دستر خوان تیار
ہے، عجم ہو“ اچھا، بیچے صاحب! خاصہ وایلوں نے پھرتی
ساتر لکھا، ۳۲ تڑچوڑ، چڑے کل ککرا بچھایا۔ اس کے اوپر
چاؤ پانی، اس پر پھر چڑا پھینچا، اس کے اوپر دسترخوان،
چائے چنا جا رہا ہے۔ لیکن ڈوری لگی ہے۔ ۲۲۰۰ قسم کی
کباب، پیتا پٹیاں، جھلکے، پرائے، ۳۲۲۲ قسم کے چاول، ملاؤ،
دلیان، مرغز، کشمی، شعلہ چھری وغیرہ۔ تو رے آئے تو وہ بھی
بہاول قسم کے مرغ، جھلی، ہرن کے کباب، مٹھانیاں، جن
کے نام بھی اب صرف کتابوں میں رہ گئے ہیں مثلاً دُر
بھرت اور مونی پاک۔ مشک و زعفران اور کیڑے کی خوشبو
نہایت ملک آئی، آج کل کھانے والے صرف ایک ننپکن
کے ہیں۔ یہاں زانو پوش، دست ماک، مٹی ماک لے

رومال خانے والیاں کھڑی ہیں بادشاہ نے کسی کو ایش مرحمت فرمایا تو اس نے سرو قد کھڑے ہو کر آداب کیا۔ کھانے کے بعد دعا مانگی گئی۔ بھنڈا نوش کیا گیا۔ دوپہر کی نوبت ہوئی، بادشاہ خواب گاہ میں تشریف لے گئے۔ چینی والیاں چینی پر آہٹیں۔ ظہر تک آرام کیا۔ پھر لوگوں سے ملاقات کی۔ عصر چڑھی جھروکوں میں آئے۔ درجن دیے کے مغرب کی اذان ہو گئی۔ نماز کے بعد وظیفے میں مشغول ہو گئے۔ رات ہوئی تو بجائے فانوس، بتیل سوز، ایک شاشی، دو شاشی، سہ شاشی، پنج شاشی مشعلیں روشن ہوئیں۔ پھر عشا کی نماز پڑھی۔ تان سرن خاں کی چوکی آئی۔ طبلے پر تھاپ پڑی۔ بادشاہ خود بھی موسیقی کے ماہر تھے، ان کی بندشیں آج بھی رائج ہیں۔ ڈیڑھ پہر رات کی توپ چلی تو پھر کھانا لگایا گیا۔ اھر بادشاہ نے قاب میں چیمچ ڈالا اھر چومدار نے آواز لگائی ”طعام مبارک“ دلی کے مفلس فقیروں کے لیے اس من خیریں روئیاں اور ۵۰ روپے سارن تیار ہے۔ وہ کھانے پر ٹوٹ پڑے۔

جہاں پناہ کھانا لکھا چلے کر اس وقت تک ہاتھ نہ کھینچے جب تک دوسرے نہ کھا لیتے۔ یہ سب وضع داریاں تھیں کھانے کے بعد سونے کا خیال کیا۔ بڑی بیگم نے اپنے ہاتھ سے بنا کر گوری پیش کی اور اب بادشاہ خواب گاہ میں سکھ فرمانے تشریف لے گئے، بادشاہت تو جیسی روگ تھی سب کو معلوم تھا۔ وھول میں پول تھا۔ لیکن ٹھات باٹ اپنے بزرگوں کی طرح نبھائے جاتے تھے۔ جنھوں نے پورے ہندوستان پر حکومت کی تھی اور اسے دنیا کا عظیم ترین اور امیر ترین ملک بنا دیا تھا۔

بہادر شاہ کی سواری بھی قابل دید تھی۔ قیاب، چوہدر، سرخ، سبز پگڑیاں، زرد اچکن میں، گول پنجے کی جوتیاں پہنے کھڑے ہیں اور بیگیاں سرخ سبز مردان لباس پہنے ہوا دراپے کھڑی ہیں! لیکری کناؤ کا گاؤں، مقیش کے پردے، کم خواب کا گول تکیہ ہوا دار میں رکھا ہے۔ داروغہ پوچھتا ہے کرامات پردے باندھ دیے جائیں۔ ”جہاں پناہ“ ہوں کہتے ہیں۔ خواجہ سراؤں نے موچھل سنبھالے، سواری چلی، غریب غرام کا جہوم اکٹھا ہوا، خیرات خانے کے نقیب نے

مختصیاں بھر بھر چاندی کے پھول نچھاور کرنے شروع کر دیئے۔ سستے زمانے ۳۰ ماشے کا پھول غریب کو ۳۰ دن کی خوراک مہیا کرتا تھا۔ بادشاہ کی سواری اللہ کے گھر آئی۔ اذان کی آواز سنائی دی۔ کش بردار نے زیر پائی رکھ دی، اترے اور مسجد میں داخل ہوئے۔ یہاں دستور ہے کہ بادشاہ خود سب کو سلام کرتے ہیں۔ خوش پر وضو کر کے نماز ادا کی۔ ان بادشاہوں کی نظر میں ہندو مسلم رعایا برابر تھی۔ پرکھوں سے یہی دستور چلا آتا تھا کہ تمام رعایا کو ایک نظر سے دیکھیں۔ بہادر شاہ کے پردادا عالمگیر ثانی کے دور میں تو مغلوں اور ہندوؤں میں بھائی چارے کے بندھن بندھے۔ عالمگیر ثانی کے نمک حرام وزیر غازی الدین نے بادشاہ کو ایک پیچھے ہوئے درویش سے ملائے کا بہانہ کر کے کوئلہ بلایا، بھولے بادشاہ بیروں، فقیروں اور مقبروں کے عاشق وہاں گئے تو وہاں ۵۰ آدمی تیار تھے۔ انھوں نے خنجر بھونکا۔ بادشاہ نے تڑپ تڑپ کر جان دے دی۔ لاش جنا کے کنارے پھینک دی گئی۔ دلی کی ایک برہمن عورت جتنا میں اٹھان کرنے لگی تو لاش کو دیکھا اور پہچان لیا کہ یہ تو جہاں پناہ کی لاش ہے وہیں بیٹھ کر روئے لگی۔ دن چڑھا تو اکرام بیچ گیا۔ شاہ عالم باپ کی جگہ تخت نشین ہوئے تو رام کنور کو بہن بنا لیا اور فارغہ پہنایا۔ اس کے بعد یہ دستور چل نکلا کہ سلوگو کے تہوار کے موقع پر سب بھائی اپنی بہنوں کے ہاتھ سے راہی بندھواتے ہیں، سب مغل بادشاہ رام کنور کی بیٹیوں، پوتیوں کو بہن بنا کر راہی بندھواتے اور بہن کو زور جواہر سے مالا مال کرنے کی یہ رسم بہادر شاہ ظفر بھی نبھاتے رہے۔ ہر سال برہمنی راہی باندھتی تو کڑھاڑ چڑھتے اور ”مہالی بادشاہ“ کے نعرے بلند ہوتے۔ بادشاہ سلامت مسلمانوں اور ہندوؤں کے سبھی تہواروں میں حصہ لیتے تھے۔ عید بقرہ عید دہرہ، یو سائی، اگر عید کے بعد امام کو خلعت و شمشیر عنایت ہوتی تو دوسرہ میں نیل کٹھن اڑایا جاتا اور انعام و اکرام تقسیم ہوتے، بادشاہی برائے نام رہ گئی تھی لیکن یہ نام بھی بہت بڑا تھا اور لوگ ان بادشاہوں پر جان چھڑکتے تھے۔ یہی جیسی کہ غاصب انگریز بوڑھے اور کردار بادشاہ سے بھی خائف تھے اور شاہی کا خاتمہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ تو بادشاہ تھے اور شخصی

حکومتوں کی کمزوریاں اپنی جگہ موجود تھیں لیکن ان کی میں رعایا بھی شریک تھی۔ اور اس کا بھی بھلا ہوتا تھا۔ آج پبلس میں ڈنر، وائٹ ہاؤس میں ٹیکوئٹ راشن تھی۔ بھوجن یا ایوان صدر میں عشائیہ ہوتا ہے۔ جن میں نے کھایا، وہی اس کا مزہ جائیں۔ مگر شاہی دور میں رعایا تھیں۔ دلی والے تھیک کہتے ہیں۔ ایک داڑھ چلے گئے۔ سلطنتیں چٹخاؤں کی نظر ہوئیں۔ مگر ان چٹخاؤں عوام بھی شریک تھے! پٹنھا چڑھانے قطب صاحب جا رہے ہیں۔ ۵۰/۵۰ غریبوں کا حصہ، بیگمات کے لیے ناول مہندی آئی ہے۔ کلاہتون، زرفلت، زری کے ہاتھ لاکھوں خاندان بنارس، گجرات، سورت، احمد آباد میں پل رہے ہیں، تورہ بندی ہو رہی ہے۔ تو ہر ایک تورہ یعنی ۲۲ باقر خانیاں ڈھائی سیری، ۲۲ پیالے، ۲۲ مٹی، فرنی، مرپ، گاڈوید، مانڈے (باریک روٹی) سے ڈھکا ہوا عطا کیا جا رہا ہے۔ بادشاہ کی دیکھا ہوا امراء بھی تورہ بندی کرتے ہیں۔ یہ سب تھے تو ان کے چونچلے۔ مگر تھے غریبوں کے حق میں۔ اس زمانے لال قلعہ آج کا لال قلعہ نہیں تھا۔ جہاں اب گرد و دیواریں چھوڑ کر جانے والوں کو رو رہی ہیں۔ وہ اب کامرکز تھا۔ باقی مرنے پر بھی سوال لکھ کا تھا۔ بہادر شاہ نے حیات بخش باغ لگوایا۔ پتھ میں چاروں طرف درختوں قسم کے پھلوں کے درخت ناشپاتیاں، انجیر، فالہ، کھرنی، برسات آئی، ایک عورتوں کے لیے مخصوص ہے۔ عورتوں کی حیثیت نکلی۔ آج کے دن کپڑے بیچنے والیاں، دہی بڑے باسٹنیں، حلوائیوں کی چھوکریاں حیات بخش باغ دکانیں لگائے بیٹھی ہیں، چھوٹے چھوٹے لوگ دریاں پہنے پہرہ دے رہے ہیں۔ یہ بیچنے والی بیگمات اور شہزادیاں آ رہی ہیں، کاش ان دنوں ممکن ہوتی تو آپ اس بہار کی رونق دیکھتے اور ٹیکل عورتوں کی بولی ٹھولی سنتے۔ لیکن خیر سیلا اینڈ پرنس

والوں نے اسے کتا بوں کے صفحات پر محفوظ کر لیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ بیگمات سونے میں چلی، موتیوں میں سفید چمچم کرتی چلی آئی ہیں۔ اتانیں، مغلاں، دوا، چھو چھو، لوٹیاں باندیاں ساتھ ساتھ کھتی جاتی ہیں۔ ”ہاؤس چھاؤں، اللہ، بسم اللہ، صدقہ گئی، واری گئی، بیچ چلو، سفید چادر اوڑھ لو اس جھتے میں چوٹی والا رہتا ہے۔ کہیں سایہ نہ ہو جائے۔ تو یہ بوڑھا چوڑا کورے اترے سے منڈ جائے۔“

جھولے پڑے ہوئے ہیں۔ ایک ایک پر بولیاں بولیاں ہو رہی ہیں: ”بواتم نے تو سنہری جوڑے کو کالی گوٹ لگا کر کبھی پیچھو کر دیا۔ واہ۔ اچھی یہ برا معلوم ہوتا ہے۔ اسے اویسی بات ہوئی، ٹاٹ کی انگلیا، مونجھ کی بنجیہ۔“

لوٹیاں بھی باغ میں کدو لگائے لگائی پھرتی ہیں۔ چونچل کنور بڑی شوخ و شنگ ہیں۔ بیگم کی ڈانٹ پڑتی ہے۔ ”بھلائی علامہ، قطامہ، چڑیل، سرمندی، اک کٹی، ایسی شترے مہار ہوگی، ایسا دیدے کا ڈرنکل گیا۔ سب کو ازراش ڈال کر پہن لیا۔ سارے باغ کی جائے پتی پھرتی ہیں اور میں بیٹھی ابو کے گھونٹ پی رہی ہوں۔“ ادھر کسی نے رونا شروع کر دیا آواز آئی۔ ”بواتم بھی کیا نین مٹتی ہو، ذرا ذرا آبی بات پر روتی ہو۔“ قلعہ، معلیٰ کی زبان، مردوں کی بو عورتوں کی، ٹیکسائی مانی جاتی تھی۔ بادشاہ تشریف لاتے ہیں۔ باغ کوٹنے کا حکم ہوتا ہے۔ اور لوٹیاں درختوں کو ہاؤس کی طرح پٹ جاتی ہیں۔ منوں میں سارے پھل شاخوں سے ٹوٹ کر ان کی جھولیوں میں چلے جاتے ہیں۔ رات ہوئی، چاندنی نے نہایت کیا، گانا ہو رہا ہے پیپسی کھیل چارہ ہے۔ کوئی کہانیاں کہہ رہی ہے، کہیں بیلیاں، کہہ کر نیاں ہو رہی ہیں۔ آنکھ چوٹی کی دھماچو کر لیں مچی ہیں۔ غرض یہ ہے کہ قلعہ معلیٰ کے دروہام نے وہ مناظر دیکھے، جواب شخص ایک خواب ہیں۔ اور آخر آخر میں یہ بھی ایک بیگمات خواب پریشانی بن گیا۔ بہادر شاہ ظفر کی زندگی میں قدم قدم پر تنگیاں تھیں۔ اس کی آنکھوں نے وہ مناظر دیکھے تھے جو خدا دشمن کو نہ دکھائے۔ ۱۲ برس کا بچہ تھا جب

اسی قلعہ میں اس کے دادا شاہ عالم کو غلام قادر رہیلہ نے پچھاڑ کر نوک خنجر سے بادشاہ کی آنکھیں نکال کر ایسے پھینک دیں جیسے پھل سے بیج۔ ظفر کے والد اکبر شاہ ثانی اس سے ہمیشہ ہمیشہ کھینچے کھینچے رہے اس لیے کہ وہ دوسرے بیٹے کو دلی عہد بنانا چاہتے تھے۔ یہ بیٹا! مرزا جہانگیر شہر و شوخ طبع تھا۔ انگریز افسر آیا تو اس نے ”ٹوٹو“ کہہ کر مذاق اڑایا، مچھہ چلایا۔ انگریزوں نے اسے الہ آباد میں قید کر دیا، اور کچھ دنوں کے بعد وہ اللہ کو پیارا ہوا۔ بہادر شاہ تخت پر بیٹھا تو ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ہوا۔ اپنوں نے غداری کی۔ غیروں کے ہاتھوں شکست ہوئی! بادشاہ پر خود اپنی بادشاہی کے خلاف بغاوت کا الزام لگایا گیا۔ سزا ہوئی۔ جلا وطن کیا گیا، بڑھاپے میں خوار ہوا۔ ڈنٹیں سہتا رہا۔ بیماری سے لڑتا رہا۔ جو ہاتھ بھی تیر تفنگ پر قابو رکھتے تھے، وہ اب بے بس تھے۔ اس کی دم ساز ملکہ زینت محل تھیں۔ دلی میں جب ان کی سواری نکلتی تو ڈنکے بجتے تھے۔ اور وہ ڈنکا بیگم کے نام سے مشہور تھیں۔

اب وہ بوڑھے بیمار شوہر کے ساتھ ۲۴ کمروں کے مکان میں دن گزار رہی تھیں۔ ظفر نے سب کچھ جھپٹا۔ یہاں تک کہ شمع زندگی جمع کی صبح ۲۷ نومبر ۱۸۶۲ء کو بجھ گئی۔ انگریزوں نے اسے چپکے سے گڑھا کھود کر گاڑ دیا۔ بعد میں قبر بھی برابر ہو گئی۔

پس مرگ میرے مزار پر جو دیا کسی نے جلا دیا اسے آہ وائمن باد نے سرشام ہی سے بجھا دیا۔ (ظفر)

یہ صحیح ہے کہ بہادر شاہ ظفر کمزور تھا۔ بے بس تھا۔ اس کا خزانہ خالی تھا۔ مگر دل بڑا تھا۔ اس کی سلطنت برائے نام تھی مگر اس کی حکومت ۳۰ سالہ ضرورت تھی۔ قلعہ کی چار دیواری میں عام آدمیوں کے دلوں میں اور اقلیم شعر و سخن میں۔ انگریزوں نے قلعہ چھین لیا۔ مگر دلوں پر اس کا بس نہ چلا۔

بہادر شاہ عہد بھی عجیب عہد تھا۔ مغلیہ سلطنت کا گھٹنا درخت، جس کی جڑ کو دیکھ کھا گئی تھی اور جس کے تنے پر انگریز کی کلہاڑی چل رہی تھی۔ مگر ہاتھ۔ لوگ اس کے سائے سے محروم ہونے والے تھے۔ لیکن اس دور میں شعر و ادب

کیا یہ کاروبار ہر قیمتی جانور کی موت تک اسی بے خوفی سے جاری رہے گا!

بیش قیمت جانوروں

کی غیر طبعی موت کا
بے رحم کاروبار عروج پر

ڈیلر نے کہا آپ کسی جانور کا آرڈر دیں
سالم یا کوئی حصہ، وہ لا کر حاضر کر دوں گا

غلام رسول اعوان

سے رنگوں بھیجا گیا تھا تاکہ وہ رعایا جوان پر جان چڑھ کر
تھی کہیں گوروں کی جان کے درپے نہ ہو جائے۔ وہ
سے قید خانے کی طرف جا رہا ہے۔
جلایا پار نے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور طبع کے رونے اس انجمن سے چلے
رنگوں پہنچا تو اس کی بوڑھی آنکھوں نے حیرت سے
دیار غیر میں گرد پیش کو دیکھا۔

کون نگر میں آئے ہم کون نگر میں ہائے ہیں
جائیں گے کون نگر کون میں اب یہ ہرلے ہیں
اور جب دلی کے قلعہ مٹلی کے وارث کو سہر کر دوں
کے مکان میں نظر بند رکھا گیا تو دل سے صد انگلی۔
لگتا نہیں ہے جی مرا اجڑے دیار میں
کس کی بنی ہے عالم ناپائیدار میں
ضعیف، بیماری، غریب الوطنی، قتل، قید تنہائی
نامیدیوں کا جھوم، مصائب کا نرغہ اسی بہادر کا جگر تھا کہ وہ
سب سمجھ سکتا رہا، خون جگر پیتا رہا اور جیتا رہا۔ شاید اس کی
بجھتی ہوئی آنکھوں میں جو آنسو بنتے تھے، وہ اس کے قلب کی
نوک سے ٹپک جاتے تھے، اس نے شاعری کو نہیں چھوڑا کہ
دل کی بھڑاس نکالنے کا یہی ایک راستہ رہ گیا تھا اور شاعری
کی دیوی بھی اس کی کنیز بنی سائے کی طرح اس کے ساتھ گئی
اس کی خدمت کرتی رہی۔ اس زمانے کے اشعار پر ”دکایت
نے“ صادق آتی ہے۔ نیتان سے ”نئے“ اور ہندوستان سے
ظفر کھٹ گئے تو کیا گزری؟ ”نئے“ کہتی ہے۔

از نیتان چوں مرا میریدہ اند
از نفیرم مرد و زن نالیدہ اند
اور ظفر کے دل کی ہوک یوں گونجتی ہے۔
میں نہیں ہیں نغمہ جال فزا مجھے سن کے کوئی کہے گا کیا
میں بڑے بڑے گے ہیں صدائیں بڑے بڑے کی پیکر ہیں
باہر، ہما یوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالمگیر نے
ہندوستان کو جنت نشان بنایا۔ لیکن دہلی کی پکار نے دلوں کو باہر
دیا۔ اس کے دکھ میں ہم آج بھی شریک ہیں۔ مگر اس کی پکار
اس کی آوازوں شعلہ بن کر خود دکھ دینے والوں کو چاٹ گئی۔

کے طیور خوش آواز اس کی شاخوں پر بیٹھے چھپا رہے تھے۔
اُردو کے عظیم شاعر زندہ تھے اور اکثر قلعہ سے متعلق تھے۔
مغلوں کی شمع گل ہو رہی تھی مگر آخری مغل تاجدار شعر و سخن کا
رہا تھا یہ غالب و ذوق کا دور تھا۔ اسی میں حکیم مومن خان
مومن، حکیم آغا خان عیش، نواب مصطفیٰ خاں شیعینہ، خواجہ غلام
غوث بے خبر، میر مہدی مجروح، میر نظام الدین ممتون بھی
جیتے تھے۔ بادشاہ اُردو میں ظفر برج اور دوسری زبانوں میں
”شوق رنگ“ تخلص کرتے تھے۔ برج پنجابی، پوربی کسی میں
بند نہ تھے۔ روایت ہے کہ شروع شروع میں انھوں نے شاہ
نصیر کو کلام دکھایا۔ مشکل زمینوں میں غزلیں اسی کی یادگار
ہیں۔ پھر استاد ذوق سے تلمذ رہا۔ قلعہ مٹلی کی زبان ٹیکسالی
تھی۔ سرسید کا خیال ہے کہ قلعہ کے تعلق سے خود ذوق کو زبان
آگئی۔ خیر ذوق کی بڑی عزت ہوئی تھی۔ ظفر انھیں کلام
دکھاتے تھے۔ لیکن وہ خود بھی قادر الکلام تھے۔ ذوق کے بعد
غالب کو کلام دکھایا۔ ظفر ایک صوفی منش مرثیان مرثیہ قسم کا
انسان تھا۔ جو گلستان کی تغیر شہزادگی کے زمانے میں لکھ چکا
تھا۔ شاعری اس کی اپنی زندگی کی تفسیر ہے۔ اور زندگی اس
کے اشعار کی تصویر۔ دلی سے نکال کر جب اسے کالے کوسوں
دور رنگون بھیجا گیا تو زندگی اندیر ہو گئی۔ غم کی کالی رات چھا
گئی ۱۴ برس اس حال میں گزرے کہ

تاہر بستر میرے حق میں، یار و مار بستر ہے
کیوں کر کانٹوں رات کو مجھ کو تویہ کالے کھائے ہے
ظفر کوئی نا سمجھ بچہ نہیں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ
اعتبار صبر و طاقت خاک میں رکھوں ظفر
فوج ہندوستان نے کب ساتھ ٹیپو کا دیا؟
میں نے عرض کیا کہ ظفر کی شاعری اس کی زندگی
ہے۔ اپنا مسکن، اپنا لال قلعہ چھوڑتے ہوئے اس کے دل
پر سانپ لوٹ گیا۔ دلی کا لال قلعہ دنیا کی عظیم عمارتوں میں
سے ہے۔ کہتا ہے۔

اجاڑے لیڑوں نے وہ قصر اس کے
جو تھے دیکھنے اور دکھانے کے قابل
رات کے پردے میں چھپا کر بادشاہ اور ملکہ کو دلی

کھال بنگال ٹائیگر کی ہی تھی۔ اُس چھوٹی سی جگہ میں اتنے زیادہ جانوروں کی کھالیں، سر، سینگ اور دیگر حصے پڑے تھے کہ انھیں گنتا محال ہی نہیں مانگن بھی تھا۔ میرے سامنے دیوار پر سنف شدہ (کیبانی طریقے سے مردہ جانوروں کو گھٹے سڑنے کے قدرتی عمل سے محفوظ بنانے کے عمل کو سنفنگ کہتے ہیں) نایاب کالا چیتا اور اُس کے پہلو میں ہی ”یاک“ (ایک قسم کا بھینسا) دیوار پر آویزاں تھے۔ اُس کے نیچے ہی فرش پر ایک پورا سالم ہرن پڑا ہوا تھا جس کے منہ پر پلٹھین بگ (شارپ) چڑھا ہوا تھا۔ شاید اُسے سنف کرنے کا عمل ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ سامنے ایک چھوٹی سی سینٹ کی سلیب پر بہت سے نادر و نایاب سنف شدہ پرندے موجود تھے۔ سنف جانوروں و پرندوں کا ڈیلران سب کے نام اور قیمتیں بتا رہا تھا۔ کیونکہ راقم خود ”زوالوجی“ (جانوروں کے مطالعے کے علم کو زوالوجی کہتے ہیں) کا طالب علم تھا اس لیے راقم کو اُن میں سے بیشتر نایاب و نادر پرندوں و جانوروں کے بارے میں کافی علم تھا۔ لیکن اُن میں سے کچھ تو میرے لیے بھی نئے تھے جن کے بارے میں اُس غیر قانونی ڈیلر کا دعویٰ تھا کہ وہ انتہائی نایاب ہیں اور اُس کے علاوہ کسی اور ڈیلر سے نہیں ملیں گے۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ باقی سارے ڈیلر اُس کا کچرا (بچا لگیا) بیچتے ہیں۔ جہاں اُس قبر نما تنگ کمرے میں جا بجا صفحہ ہستی سے ناپید ہوتے نادر و نایاب جانداروں کے محفوظ شدہ، مردہ اجسام اور اُن کے جسم کے وہ حصے موجود تھے جنہیں امراء اپنے ڈائننگ رومز اور محلات کی زینت بنانا فخر

سمجھتے ہیں، وہاں اس بات کو نظر انداز کرتے ہوئے کہ پاکستان سے کتنے ہی جانوروں و پرندوں کا وجود ختم کر دیا گیا ہے اور اس غیر قانونی تجارت سے باقی ماندہ جاندار بھی اسی خطرے سے دوچار ہیں۔ ایک وقت تھا جب پاکستان کی سرزمین پر باہمی و شیرجیے شاندار جانور موجود تھے اور آج یہ جانور پاکستان میں صرف چڑیا گھروں میں ہی ملتے ہیں اور یہاں بھی یہ نایاب جانور محفوظ نہیں۔ چڑیا گھر کے عمل کی ملی بھگت سے ان قیمتی و نایاب جانوروں کو غیر فطری موت سے دوچار کر دیا جاتا ہے اور پھر انہیں موت کے سوداگر خرید لیتے ہیں جن کا کام جانوروں، پرندوں کے اجسام کو محفوظ کر کے ”سنفنگ کر کے“ بیچنا ہے۔

اگر کوئی عام انسان اُس کمرے میں ہو تو اُسے گھمن و بدلو سے الٹی آجائی لیکن کیونکہ مجھے اس قسم کے حالات کا پہلے بھی تجربہ ہو چکا تھا اس لیے میں خود کو اُن بے شمار مردہ اجسام میں سنبھالتے میں کامیاب رہا۔

سینٹ کی بنی اُس سلیب پر جا بجا مختلف بوتلوں میں انواع و اقسام کے کیمیکلز و سپرے نظر آ رہے تھے۔ اُس ”لاشوں کے سوداگر“ کا کہنا تھا کہ بازار میں ایسے سپرے دستیاب ہیں جن کے استعمال سے یہ جانور و پرندے گھٹے سڑتے نہیں۔ ساتھ ہی پلاسٹک کے کچھ ٹب بھی موجود تھے جن میں جانوروں کی باقیات موجود تھیں۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ ٹیکسی ڈرمی (Taxidermy) کا عمل کہیں اور نہیں اُسی چھوٹی سی جگہ پر کیا جاتا تھا۔ اس کا مطلب صاف تھا کہ یہ نادر و نایاب جانور و پرندے بھی کسی دور دراز کے شہر یا قصبے سے نہیں کسی قریبی جگہ سے ہی لائے



”چڑیا گھر سے چند قدم کی دوری پر موجود اس اڈے پر ”سنفنگ“ کا عمل ثابت کر رہا تھا کہ ”خام مال“ کہاں سے آیا ہے“

جاتے تھے اور چڑیا گھر سے چند قدم کی دوری پر موجود اس اڈے پر تازہ تازہ ہوا سنفنگ کا عمل یہ ثابت کر رہا تھا کہ ”خام مال“ چڑیا گھر سے ہی آیا ہے۔ اتنے میں میری نظر دیوار پر کیمیکلنگی ہرن کی کھال پر پڑی۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ اُس کھال کو کچھ ہی دیر قبل ”سلاط“ وغیرہ لگایا گیا تھا تاکہ اُسے محفوظ کیا جاسکے۔

ڈیلر بار بار ایک ہی سوال کر رہا تھا آپ کو کون سا جانور چاہیے؟ آپ کو کون سا جانور چاہیے؟ میں نے معصوم سا چہرہ بناتے ہوئے اُسے کہا بھائی! کچھ دکھاؤ گے تو ہی پسند کریں گے نا اور فیصلہ کریں گے کہ کیا لینا ہے۔ میرے ساتھ آئے ہوئے دوست نے ڈیلر کو بتایا کہ میں ایک یونیورسٹی میں شعبہ زوالوجی (حیوانیات) سے تعلق رکھتا ہوں۔ یہ سن کر ڈیلر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گیا۔ کیونکہ ہر ایک یونیورسٹی و کالج کے بائیولوجی اور زوالوجی شعبہ میں ”سنف شدہ“ مردہ جانوروں کو رکھا جاتا ہے تاکہ طالب علم ان کو بغور مطالعہ کر سکیں۔ لیکن یہ اپنی جگہ ایک اور سوال سوچنے کا مقام ہے کہ انٹرنیٹ و ٹیکنالوجی کے اس جدید دور میں جب تقریباً سارے ہی جانوروں و پرندوں کی تصاویر و ویڈیوز اور معلومات کا ایک وسیع و عریض خزانہ انٹرنیٹ پر موجود ہے تو ان نادر و نایاب پرندوں کو غیر فطری اور بے رحمانہ طریقے کے ذریعے موت سے دوچار کرنے اور اُس کے بعد اُن کے اجسام اور جسم کے حصوں کو مسالا جات (کیمیکلز) لگا کر محفوظ بنانے والے نام نہاد ”ٹیکسی ڈرمسٹس“ (Taxidermists) اور درحقیقت نایاب جانوروں اور پرندوں کی موت کے سوداگروں سے یہ جانور و پرندے خرید کر آخر اُن کی حوصلہ افزائی کیوں کی

”نایاب جانوروں اور پرندوں کے ڈیلر کا حلیہ، ڈیل ڈول دیکھ کر خوف کی لہر محسوس ہو رہی تھی“

جائے۔ اگر اس ”موت“ کے خریدار ہی نہیں ہوں گے تو یہ غیر قانونی کاروبار خود بخود اپنی موت آپ مر جائے گا۔ راقم کا خیال تھا کہ اس غیر قانونی ڈیلر کی دکان صرف ایک ہی کمرے پر مشتمل ہوگی جس میں ہم اُس وقت کھڑے تھے۔ لیکن جیسے ہی موت کے اُس سوداگر کو ہمارے اوپر کچھ اعتماد ہوا اور اُسے یہ محسوس ہوا کہ ہم اُس کے اچھے خریدار ثابت ہو سکتے ہیں اُس نے ایک اور کمرے کا تالاکھول دیا۔ اس کمرے میں تو جیسے پرندوں و جانوروں (سنف ہوئے اور ٹیکسی ڈرمی Taxidermy کے عمل سے گزرے ہوئے) کا گودام ہو۔ ایک دیوار پر ”سانجھر“ کا سر جسے لکڑی کے ایک تختے پر لگایا گیا تھا دیوار پر آویزاں تھا۔ ڈیلر مجھے بڑے فخر سے بتا رہا تھا کہ یہ پاکستان میں بہت ہی نایاب ہے۔ دوسری دیوار پر ”پارا“ Hog Deer کا سر دیوار پر آویزاں تھا۔ کپڑے سکھانے کے لیے استعمال ہونے والی نائیلون کی رسی پر، جن کلیپس (Clips) کی مدد سے کپڑوں کو لٹکایا جاتا ہے، نادر پرندے لٹک رہے تھے۔ مردوں کا سوداگر ایک ایک کر کے سنف شدہ پرندوں کو مجھے دکھا رہا تھا۔ اُس نے مجھے فالکن، کوچ، نایاب اقسام کے تیز و شیر، مور اور بہت ساری اقسام کے نادر پرندے دکھائے۔ چکور کے بارے میں بھی ڈیلر کا یہ دعویٰ تھا کہ اتنا بڑا چکور تو کسی شکاری نے بھی نہیں دیکھا ہوگا جو اُس کے پاس موجود تھا۔ اس ”سوداگر“ کا یہ دعویٰ تھا کہ آپ مجھے کسی بھی جانور کا آرڈر دیں۔ چاہے سالم جانور کا یا کسی خاص حصے کا وہ لاکر حاضر کر دے گا۔ راقم جب گھر سے نکلے گا تھا تو اپنا کیمیرہ ساتھ لے جانے لگا۔ لیکن پھر اس خیال سے اُسے واپس رکھ دیا کہ اُس ڈیلر کو



شک نہ ہو جائے۔ اب ارادہ تو یہ تھا کہ جب موقع ملا موبائل سے ہی سہی چند ایک تصویریں بنالوں گا تاکہ ثبوت کے طور پر استعمال کی جا سکیں لیکن دل میں ایک ڈر بھی تھا کہ اگر ”مردوں اور موت کے اس سوداگر“ کو میرے ارادے کی بھٹک بھی پڑ گئی کہ میں وہاں اُسے اور اس کے غیر قانونی کاروبار کو بے نقاب کرنے آیا ہوں تو کہیں کسی مصیبت سے نہ دوچار ہو جاؤں۔ ویسے بھی اُس ڈیلر کا ذیل ڈول، حلیہ اور وضع قطع کافی بھیا تک تھی۔ اُس کے سر پر پانے زنجوں کے تین واضح نشان تھے اور چہرے سے ایسی پراسراریت نچک رہی تھی کہ اُسے دیکھ کر ہی جسم میں خوف کی ایک لہری محسوس ہوتی تھی۔ ہر لمحے یوں محسوس ہوتا رہا کہ جیسے ہم مافیا کے کسی فرد کے ساتھ بات کر رہے ہیں۔ ہم پوری طرح سے اُس کے رحم و کرم پر تھے۔ اگر اُسے ذرا سا بھی شک ہو جاتا تو ہمارے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس لیے میرا دوست اشاروں کنایوں میں واپس جانے کی بات کر رہا تھا۔ جبکہ میں سب خطروں کو نظر انداز کر کے زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اتنے میں ڈیلر نے مجھے سنف شدہ پورا سالم ”کینکر“ دکھایا۔ کینکر وہ کچھ ہے کہ چہرے پر معصومیت کے ایسے پُراثر تاثرات تھے جن سے میرا دل یہ سوچ کر ہی غمناک ہو گیا کہ نہ جانے کتنے ہی جانوروں و پرندوں کو موت کے ان سوداگروں نے غیر طبعی و غیر فطری موت سے دوچار کیا ہو گیا۔ میں فرش پر پڑے شرمخ کے جسم اور اُس کے خوبصورت و معصوم سر کو کیسے بھول سکتا ہوں جیسے وہ اپنے قاتلوں کے احتساب کا سوال کر رہا ہو۔ فرش پر جا بجا نایاب و نادر جانوروں کے اتنے زیادہ اجسام دکھائیں، سر،

”میں خطروں کو نظر انداز کرتے ہوئے“

ان کے خفیہ کمرے تک جا پہنچا“

سینگ موجود تھے کہ میں نے اُس ”مردوں کے سوداگر“ سے پوچھ ہی لیا کہ کیا یہ سب گھٹا سرتا نہیں۔ اُس کا کہنا تھا کہ اس کمرے میں نہیں۔ میں نے پوچھا اُس کی کیا وجہ ہے۔ اُس ڈیلر کا یہ کہنا تھا کیونکہ اُس نے کمرے میں خاص سپرے کیا ہوا تھا۔ دیواروں پر موجود جو چیز کثرت سے نظر آرہی تھی وہ تھی مختلف اقسام کے ہرنوں کے سر۔ کیونکہ دفتر یہ سینگوں کے ساتھ ہرن اور کچھ اور نایاب جانوروں کا خوبصورت اور معصوم سا سر ایک عجیب سی پُر کیف منظر پیش کرتا ہے اور ان جانوروں کے خریداروں کی بھی کمی نہیں ہے۔ آپ میں سے اکثر لوگوں نے ہرن کے سر کو امرا کے محلات کے داخلی دروازوں اور ڈرائنگ رومز میں سجا دیکھا ہوگا۔ سوداگر کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ہر سائز کے ہرن کا سر لا سکتا ہے اور وہ جلد ہی اتنے بڑے بڑے ہرنوں کے سر لاکے لگائے گا کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چندھیا جائیں گی اور وہ سر اُس یا ک کے سر سے بھی بڑے ہوں گے جو پہلے کمرے میں آویزاں تھا۔ راقم نے تیسرے کمرے میں جانے کی خواہش ظاہر کی تو اُس ڈیلر نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہاں روشنی کا کوئی انتظام نہیں ہے۔ لیکن دور سے ہی میں دیکھ سکتا تھا کہ اُس کمرے میں پہلے والے دو کمروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ جانوروں و پرندوں کے اجسام کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ کبوتر جیسے عام سے پرندے سے لے کر شیر و ٹائیگر جیسے جنگل کے بادشاہ تک ہر قسم کے جانور اور ان کے جسم کے مختلف اعضا (سینگ، سر، کھالیں) وغیرہ غرض بے شمار جانوروں و پرندوں کی لاشیں وہاں موجود تھیں۔ نہ جانے وہاں اور کتنے ہی کمرے موجود تھے۔



ٹیکسی ڈرمسٹ (Taxi Dermist)

”ٹیکسی ڈرمسٹ (Taxi Dermist) (ٹیکسی ڈرمی،

مر جانے والے پرندوں و جانوروں کو اس طرح سے تیار کرنے کا عمل ہے جس میں وہ گلے سڑتے نہیں اور اُن کے اجسام ایسے لگتے ہیں جیسے کہ وہ ابھی زندہ ہوں۔ پھر ان نایاب و نادر پرندوں اور جانوروں کو جو اس کیلئے عمل سے گزر کر ”شوئیں“ بن جاتے ہیں انتہائی مہنگے داموں فروخت کر دیا جاتا ہے) کہتے ہیں۔

روزنامہ نوائے وقت، نیشن اور پاکستان ٹو ڈے کے دفاتر، شارع فاطمہ جناح سے ہر دن کئی لاکھ گزرنے والی گاڑیوں میں بیٹھے بے خبر شہری کب جانتے ہوں گے کہ سڑک سے چند قدم دور کیسا گھٹاؤنا کاروبار جاری ہے۔ ایسے کھلے عام اور سرعام یہ کاروبار ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ متعلقہ حکومتی ادارے ہمیشہ کی طرح بے نیاز اور خاموش تماشاخی بن کر ان سوداگروں کی سرپرستی کر رہے ہیں۔ اس محلے میں داخل ہوتے ہی ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم کسی ایسے علاقہ غیر میں آگئے ہیں جہاں قانون نام کی کوئی چیز نہیں اور ”لاشوں کے سوداگروں“ کا غنڈہ راج ہے۔ رات کو چڑیا گھر میں جو نایاب و معدوم جانور اور پرندے ”مر“ جاتے ہیں قطع نظر اس کے کہ ان کی موت قدرتی ہوتی ہے یا غیر طبعی وہ صبح ہی آپ کو ”مردوں کے سوداگر“ کے پاس سے مل جائیں گے اور اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ آپ نے کسی سٹفڈ (Stuffed) جانور یا پرندے کا آرڈر دیا اور اگلے ہی دن وہ جانور چڑیا گھر میں اتفاق سے مر جائے اور اس سوداگر کی دکان پر ”سنف“ ہونے پہنچ کر آپ کو حیران کر دے۔ آپ میں حیران ہونے کی قوت سے زیادہ، حیران کرنے والوں کی طاقت اور پہنچ زیادہ طاقتور ہے۔ اس لیے یہ کاروبار پورے سکون سے جاری ہے۔ خدا جانے ”لاشوں کی یہ سوداگری“ کب ختم ہوگی۔ شاید جب تک چڑیا گھر میں ایک بھی جانور یا پرندہ باقی ہے، یہ جاری رہے گی۔

وہاں موجود جانوروں و پرندوں کے اجسام کو دیکھ کر ایک عام آدمی بھی یہ بتا سکتا تھا کہ وہ اپنی قدرتی یا طبعی موت نہیں مرے بلکہ انھیں تندرستی و جوانی میں ہی ”موتیں“ بنانے کے لیے اس بے رحم سوداگری کی بھینٹ چڑھا دیا گیا۔ اب تو وہاں کھڑے ہونے میں بھی خوف محسوس ہو رہا تھا۔ دیوبند کی قد و قامت کا وہ سوداگر جو دیکھنے میں ہی بے انتہا ڈراؤنا تھا اگر وہ چاہتا تو ہمیں بھی اُن تنگ و تاریک قبر نما چھوٹے چھوٹے کمروں میں بند کر دیتا۔ لیکن وہ اپنی ظاہری شخصیت کے برعکس ایک سیزمین اور دکان دار کی طرح اپنے پاس موجود انواع و اقسام کے نادر و نایاب جانوروں کی لاشوں کی تعریف میں زمین آسمان ایک کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

اس سوداگر کے پاس بیٹھنے کا واقعہ بڑا ہی عجیب تھا۔ راقم کو مدبر محترم نے چڑیا گھر سے ملحقہ آبادی میں ہونے والی اس غیر قانونی تجارت کے بارے میں بتایا اور کہا کہ مجھے پاکستان کے نامور چڑیا گھر میں پرندوں، جانوروں، جن میں بیشتر بہت ہی نایاب اور صفحہ ہستی سے معدوم ہونے کے قریب ہیں، کی غیر فطری موت اور پھر ملحقہ آبادی میں انھیں امراء کو بیچنے کے ناجائز کاروبار کا آنکھوں دیکھا حال چاہیے سنی سنائی باتیں نہیں۔ بظاہر تین کمروں پر محیط اُس سوداگر کی دکان کم، ستوروم زیادہ لگ رہا تھا اور سب سے اہم بات یہ کہ اُسی آبادی میں ہی اُن جانوروں کی لاشوں کو کیلانی طریقے سے محفوظ کرنے کا عمل کیا جاتا ہے۔ جس کا واضح مطلب ہے کہ مردہ جانور و پرندے چڑیا گھر سے مہیا کیے جاتے ہیں۔ اصل نکتہ یہ ہے کہ اتنے نایاب و نادر پرندے اور جانور طبعی و قدرتی موت سے نہیں (مرتیاں) منافع بخش کاروبار کی بھینٹ چڑھانے کے لیے مار دیے جاتے ہیں۔ چڑیا گھر، اُس سے ملحقہ یہ محلہ اور اس مردوں کے سوداگر کی ناجائز کاروباری دکان شہر لاہور کے انتہائی حساس مقام پر واقع ہے۔ ایک طرف وزیر اعلیٰ ہاؤس کی بلند و بالا دیواریں ہیں، دوسری طرف لاہور پولیس کے سربراہ کا دفتر متصل بلال احمد کا دفتر ہے اور بالکل سامنے

انوکھے لوگ دلچسپ واقعات

شاہد احمد دہلوی کے لکھے ہوئے ۴۳ نادر و نادر نگار شخصیات کے خاکے

محمود عزیز

دادا سیر تھا تو پوتا سواسیر

مشہور زمانہ ماہنامہ ”ساقی“ کے مدیر، ڈپٹی نذیر احمد کی شہرت کا اپنا حوالہ ہے اور ان کے پوتے اردو کے بے مثال خاکہ نگار شاہد احمد دہلوی کی اپنی پہچان ہے۔ جن لوگوں نے ایتھے اور کامیاب خاکے لکھے ہیں ان میں شاہد احمد دہلوی کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ ان کے خاکے زبان و بیان اور شخصیت کے انوکھے پن کی وجہ سے غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ شاہد احمد دہلوی نے جہاں ”ساقی“ کے ذریعے کم از کم ۳۰ رسالوں کی آبیاری کی، وہاں یہ خاکے اردو زبان و ادب کے وہ نگین اور خوشبودار پھول ہیں جو ہمیشہ مہکتے رہیں گے۔ (مدیر)

زندہ دل اور دوست دار نواب تابیلا

نواب تابیلا نواب سائل کے بڑے بھائی تھے۔ بالکل انھیں کی طرح میدہ و شاب رنگ، ویسا ہی ذیل ڈول، ناک نقشہ اور لباس مگر دونوں بھائیوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بڑے بھائی کو چھوٹے بھائی سے نہ جانے کیا کدھی کہ ہمیشہ برا بھلا ہی کہتے رہتے تھے۔ بلکہ گالیاں دینے سے نہ چوکتے تھے اور گالی بھی ایک سے ایک نئی تراشتے تھے۔ سائل بے چارے سر جھکا کر کہتے ”بھائی جان آدھی مجھ پر پڑ رہی ہیں اور آدھی آپ پر“ اس پر وہ اور جگڑتے اور ایسی سناتے جو دھری جائیں نہ اٹھائی جائیں۔ نواب تابیلا کے مزاج کی کیفیت بیان کر کے شاہد صاحب مولانا شبلی نعمانی سے اُن کے ٹاکر کا حال بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

چارہ کھل گیا اور مولانا شبلی کو اپنا پنڈ چھڑانا مشکل ہو گیا تاہم شاہد صاحب ان کی یہ خوبی بیان کرنا نہیں بھولتے کہ: دیسے اپنی روزمرہ کی زندگی میں نواب تابیلا بڑے زندہ دل اور دوستوں کو کھلا پلا کر خوش ہونے والے آدمی تھے۔ کھانے پلانے کا ذکر آیا ہے تو کھانے والوں کا ذکر بھی ہو جائے۔ اس سلسلے میں شاہد صاحب جوش صاحب کے کھانے پینے اور ان کی خوش خوراک کے قصوں میں رقم طراز ہیں کہ یاش بخیر حضرت جوش ملیح آبادی کھانے پینے کے بڑے رسیا ہیں۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ صرف پینے کے جی نہیں، کھانے کے بھی مجھے چند بار انھیں کھاتے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ اس معاملے میں وہ قطعی غیر شاعر ہیں۔ جوش صاحب بڑی بے دردی سے کھانے پینے پر ملتے ہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ ادھر سورج غروب ہوا اور ادھر وہ ساغر کف طلوع ہوئے۔ ۲۲ گھنٹے تک ان کا یہ شغل جاری رہتا ہے۔ مفت خورے تو ساتھ لگے ہی رہتے ہیں مگر یہ اتنے تنگ ظرف ہوتے ہیں کہ ایک ایک دو گلاس ہی میں چمک جاتے ہیں۔ جوش بلا نوش ہیں۔ ۲۲ گھنٹے میں ۲، ۳ گھنٹے بھی گلاس ہو جاتے ہیں سب چڑھا جاتے ہیں اور ڈرامیں بھیتے۔ بلکہ یہی وہ وقت ہوتا ہے جب ان کی گل افشانی گفتار دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ ۲۲ گھنٹے کے اس ریاش کے بعد کھانا طلب کیا جاتا ہے۔ اب آپ ان کے تبادل طعام کی رفتار دیکھیے۔ بریانی کی چوٹی دار قابیں آتی رہیں گی اور غائب ہوتی رہیں گی۔ قورمہ اور شیر مائیں پناہ مانگ جائیں گی۔ آم کی ٹھیلیوں کا ڈھیر سامنے لگ جائے گا اور ہلاکو کی کھوپڑیوں کے مینار کی یاد تازہ کر جائے گا۔ جوش صاحب کی اس خوش خوری کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوتی ہے کم از کم ایک شخص تو ہماری برادری میں ایسا ہے جو کھانے کے ساتھ پورا پورا انصاف کر سکتا ہے۔

ترجمے کی قابلیت میں باپ سے بڑھا ہوا بیٹا
مولانا عنایت اللہ

”مولانا عنایت اللہ دہلوی ترجمہ کرنے میں غیر معمولی

صلاحیت رکھتے تھے۔ یوں تو ان کے والد شمس العلماء منشی ذکاء اللہ دہلوی بھی اپنے وقت کے مشہور مترجم تھے اور انھوں نے بھی بہت ترجمے کیے مگر ان ترجموں میں وہ روانی اور بے ساختگی نہیں ہے جو مولانا عنایت اللہ کے تراجم میں پائی جاتی ہے۔ شاہد صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی اس صلاحیت کا احساس سب سے پہلے سر سید احمد خاں کو ہوا۔ جب سر سید نے مولانا عنایت اللہ سے آرنلڈ کی کتاب ”دی پریکٹیکل آف اسلام“ کا ترجمہ کرایا۔ جسے دیکھ کر سر سید پھرک اٹھے اور مزاحاً اپنے ایک خط میں منشی ذکاء اللہ کو لکھا ”میاں تم اپنے لڑکے سے ترجمہ کرنا سیکھو“ مولانا عنایت اللہ نے حیدر آباد دکن کی بدنگی اور افرا تفری کا ذکر شاہد صاحب سے کیا کہ:

یہاں تو پارٹی بنیادیں بنتی ہیں۔ آج اُس پارٹی کا زور ہے، کل اُس پارٹی کا۔ رعایا میں لوٹ کھسوٹ مچی ہوئی ہے۔ خود اعلیٰ حضرت کو روپیہ جمع کرنے کا ہوکا ہو گیا ہے۔ دورے کرتے ہیں، پایاگاہوں اور چھوٹی چھوٹی ریاستوں سے پھٹکے بھر بھر کے سونا چاندی لاتے ہیں۔ ریسوں میں مسابقت ہو رہی ہے، ایک کہتا ہے کہ اگر اعلیٰ حضرت یہاں تشریف لائیں تو ۱۰ لاکھ کی نذر گزاروں گا۔ دوسرا کہتا ہے میرے یہاں تشریف لائیں گے تو میں ۱۱ لاکھ پیش کروں گا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت پہلے ۱۰ لاکھ والے سے ۱۱ لاکھ وصول کرتے ہیں اور پھر ۱۱ لاکھ والے سے ۱۱ لاکھ۔ اس طرح دونوں کو خوش کر دیتے ہیں۔ یہ روپیہ کیسے جمع کیا جاتا ہے؟ کہیں اپنے تعلقداروں سے کہتا ہے کہ ۱۰ لاکھ روپیہ جمع کرو۔ تعلقدار تحصیل داروں سے کہتے ہیں، تحصیل دار پٹواریوں سے کہتے ہیں اور پٹواری رعایا کی کھال ادھیڑتے ہیں۔ ۱۶، ۱۵ لاکھ روپیہ جمع کیا جاتا ہے اور اپنا اپنا حق رکھ کر اوپر پہنچا دیا جاتا ہے۔ ۶، ۵ لاکھ کنوٹیوں میں غائب ہو جاتا ہے۔ باقی ۱۰ لاکھ اعلیٰ حضرت کی بھیٹ چڑھ جاتا۔ رعایا لکھکھ ہوتی چلی جارہی ہے اور اعلیٰ حضرت کے خزانے اٹنے چلے جا رہے ہیں۔ ایک خزانہ بھر جاتا ہے تو اس کے منہ پر تیفہ کرا دیا

جاتا ہے اور خزانے میں بجلی کی رو چھوڑ دی جاتی ہے۔ جن لوگوں نے ان خزانوں کو بہ چشم خود دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ جن گاڑیوں میں روپے اور اشرفیوں کے توڑے لاد کر لائے جاتے ان پر سے انھیں اتارنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی جاتی۔ گاڑیاں یوں کی یوں ہی کسروں میں کھڑی کر دی جاتیں۔ ان ہی دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ بوجھ سے گاڑیوں کے پیسے زمین میں جھنسن گئے تھے۔ اعلیٰ حضرت کی یہ زرا ندوزی دیوانگی کی حد کو پہنچ گئی تھی۔ اس میں انھیں بُرے بھلے کی تیز نہیں رہی تھی۔ انھیں روپیہ ملنا چاہیے تھا کسی طرح بھی ہو۔ رئیسوں اور امرا کی شادی میں اس وقت شریک ہوتے جب پہلے نذر کھول لیتے کہ کتنا روپیہ ملے گا۔ بیٹے والے اسے الگ لیتے اور بیٹی والے سے الگ لیتے۔ اس طرح دونوں گھروں کو شاد آباد کرتے۔ اس جنون کی آخر یہ کیفیت ہو گئی تھی کہ اگر کوئی غریب کوئی تحفہ یا نادر چیز اس امید پر بارگاہ خسروی میں پیش کرتا کہ اُسے مالی منفعت ہو تو اسے اُلٹے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ اسی زمانے کا ذکر ہے کہ ایک شخص اپنے باغ سے پانسو عمدہ آم اپنے بادشاہ کے لیے لایا۔ بادشاہ انھیں دیکھ کر باغ باغ ہو گیا۔ آموں کی بہت تعریف کی۔ پوچھا ”کہاں سے لائے، کس باغ سے لائے۔ ان کی قیمت کیا ہے؟“ لانے والے نے کہا ”خداوند، ان کی قیمت کیا؟ نذر قبول ہو جائے۔“ بس ”ارشاد ہوا“ نہیں، پھر بھی کتنے کے ہوں گے یہ آم؟“

غریب نے سوچا کہ قسمت نے یاور کی نصیب کھلنے کا وقت آ پہنچا۔ بولا ”سرکار، ہے کوئی ۵۰/۵ روپے کا ایک“ فرمایا ”ہاں ہاں، کیوں نہیں، بہت عمدہ آم ہے۔ ضرور ہوگا ۵۰/۵ روپے کا۔ مگر میں کہاں کھا سکتا ہوں اتنے آم! لے جا“

”جس کو انھوں نے پڑھا دیا، پارس بنادیا

شاگردی میں مشکل سے ہی کسی کو قبول کرتے تھے“

تو ہی انھیں۔ مجھے تو ان کا روپیہ بھیج دے بس“، لوصاحب! حکم حاکم! مرگ منافات۔ پران ڈھیلے ہو گئے۔ ڈھائی ہزار روپیہ شاہی خزانے میں قرض وام کر کے بھرا اور اپنے نصیبوں کو کوستا، روتا پینتا گھر واپس آیا۔

بازاروں میں سودا بیچنے والوں نے بیٹھنا چھوڑ دیا تھا کہ اعلیٰ حضرت من مانی قیمت پر ضرورت کی چیزیں خرید لیتے تھے۔ جس دکان یا ہراج خانے میں گستے تہلکہ بچ جاتا۔ ہزار روپے کی چیز دس روپے میں لے جاتے اور ان دس روپوں کو بھی دکان دار جھینکتا پھرتا۔ نیلام میں سب سے پہلے بولی سرکار خود لگا دیتے۔ کس کی ماں نے دھوڑا کھایا ہے کہ بڑھ کر بولی لگائے۔ زن بچہ نہ کو ابو پلو دیا جاتا۔ غرض جہاں جاتے اڑا پڑ جاتا۔

اعلیٰ حضرت نے اُس زمانے میں یہ تنگدلی بھی کر رکھی تھی کہ جس کسی کے ہاں سے کوئی تحفہ آتا اس کو کوئی حصوں میں بانٹ کر عمدہ داروں کو بھیج دیتے اور عمدہ داروں کا فرض ہو جاتا کہ اگلے دن ”ڈیوڑھی مبارک“ پر حاضر ہوں اور بار دیا بھوکہ سرفرازی کی نذر گزاریں۔

اپنے شاگردوں کو بھی اپنے جیسا بنانے والے
مولانا عبدالسلام نیازی

شاہد صاحب مولانا عبدالسلام نیازی کے خاکے میں لکھتے ہیں کہ مولانا کے علم و فضل کی تعریفیں غائبانہ بہت سنیں، تو انھیں دیکھنے کا اشتیاق ہوا اور جب مولانا کو خواجہ حسن نظامی کے ہاں دیکھا تو انھیں وہ بے شمار باتیں جو ان کے بارے میں سنیں تھیں جھوم کر آئیں۔ پھر شاہد صاحب ان کے علم اور انوکھی عادتوں کے بارے میں

جان کرستے ہیں کہ: مولانا نے ساری دنیا کا علم چاٹ رکھا تھا۔ عربی، فارسی اور اردو کے منتہی تھے۔ مذہبی علم، معقول و منقول دونوں ان کے پاس اتنا تھا کہ سوائے مولوی ایوب کے کوئی اور ان کے آگے ٹھہر نہیں سکتا تھا۔ ہر علم سے خدا کا وجود ثابت کر دیتے تھے یہاں تک کہ علم موسیقی سے بھی۔ حافظہ غضب کا پایا تھا۔ ہر کتاب انھیں از بر تھی۔ یہاں تک کہ بعض کتابوں کے صفحے تک بتا دیتے تھے کہ فلاں صفحے پر دیکھو، یہ عبارت ملے گی۔ مزاج میں درشتی بہت تھی اس لیے اپنی شاگردی میں مشکل ہی سے کسی کو قبول کرتے تھے۔ مگر جس کو انھوں نے پڑھا دیا وہ پارس بن گیا۔ شاگرد سے ناراض ہوتے تھے تو اسے سخت سے سخت سزا دیتے تھے مثلاً اسے ستون سے باندھ دیتے اور زیادہ غصہ آتا تو اسے بید سے اذیت دیکر رکھ دیتے۔ علم کا ایک سمندر تھا کہ ان کے دماغ میں موجیں مارتا رہتا تھا۔ چاہتے تھے کہ شاگرد بھی ان ہی جیسا ہو جائے۔ جب یہ توقع پوری نہ ہوتی تو جھنجھلاتے اور شاگرد کی شامت آ جاتی۔

مولانا کی کرامت کا یہ قصہ سنئے:

حیدرآباد دکن سے ایک نواب صاحب دلی آئے اور مولانا کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مولانا نے پوچھا ”کیسے آتا ہوا؟“ نواب صاحب نے کہا ”سرکار نے آپ کو بلا فرمایا۔“ مولانا کو جلال آ گیا۔ فرمایا ”کیوں بلایا ہے اس نے ہمیں؟ اگر وہ اپنے علم سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتا ہے تو ہم اس کے رعب میں آنے والے نہیں اور اگر وہ ہمیں اپنی دولت دینا چاہتا ہے تو ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اسے عثمان اور کچھو، وہ سامنے بچان پر جو بوری رکھی ہے اٹھا لائے۔“ عثمان جا کر بوری اٹھا لایا۔ مولانا نے فرمایا ”اس میں جو کچھ ہے، باہر نکال“ عثمان نے بوری میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو نوٹوں کی گڈی نکلی۔ عثمان نے وہ گڈی نکال کر فرش پر رکھ

دی۔ غرض یوں ہی نوٹوں کی گڈیاں نکالتا رہا اور گڈیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ مولانا نے نواب صاحب سے کہا ”اور دیکھیے گا؟“ نواب صاحب تھرا گئے۔ ہکلا کر بولے ”حضور کے پاس کیا کیا ہے؟“ مولانا نے فرمایا ”جا، اپنے نظام سے کہہ دے، ہم کسی کے پاس نہیں جایا کرتے۔“ نواب صاحب ہاتھ جوڑتے اور سلام بھجواتے وہاں سے رخصت ہوئے۔ مولانا نے عثمان سے کہا انھیں بوری میں بھر کے وہیں رکھ آ۔ عثمان نے نوٹوں کی گڈیاں نکٹیں اور بوری پھر بچان پر رکھ دی۔ رمضان کے دل میں بدی آئی۔ عثمان سے کہا ”ابے دو ایک گڈیاں تو پار کر دے“ عثمان نے ہنس کر کہا ”بوری میں کیا رکھا ہے؟ بوری تو خالی ہے“ استاد رمضان خاں زندہ سلامت ہیں اور کراچی میں موجود ہیں۔ انھوں نے قسمیں کھا کھا کر اپنا یہ چشم دید واقعہ سنایا۔

”ان جیسی جرات کم ہی کسی میں دیکھی“
خواجہ حسن نظامی

فقیروں کے گھروں میں لطف کی راتیں بھی آتی ہیں
نہایت کے لیے اکثر مسامتیں بھی آتی ہیں



اکبر الہ آبادی
کے اس شعر کی شان
نزدول کے بارے میں
صاحب طرز
انشا پرداز ملا واحدی
جن کو دہلی کی عیسائی
زبان کھنسنے میں
مہارت حاصل ہے
اور جنھوں نے اپنے

ثقافت اور دل آویز طرزِ تحریر میں مصروفِ طر خواجہ حسن نظامی کی سوانح عمری پُر اثر انداز میں لکھی ہے، اس

”بادشاہ سے کہیو، بادشاہ چھڑکاؤ کی گاڑی ہوتے ہیں اور رعایا پیاسے ذرات“

واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضرت اکبر کا منہ کمرے کے دروازے کی جانب تھا اور خواجہ صاحب کا منہ حضرت اکبر کی طرف۔ میں بھی حاضر تھا۔ ایک ایک حضرت اکبر نے فرمایا، ”آئیے آئیے“ خواجہ صاحب نے اور میں نے مرکز دیکھا تو ۲۰ طوائفیں ہمارے پیچھے کھڑی تھیں۔ خواجہ صاحب کا حکم تھا کہ جب تک حضرت اکبر میں کسی طوائف کو گھر میں مت گھننے دینا۔ ویسے مستقل ممانعت نہ تھی۔ فقیروں کے ہاں اچھے برے کی روک ٹوک نہیں ہوا کرتی۔ وہ ۲۰ طوائفیں خدا جانے کس طرح آنکھ بچا کر اندر گھس آئیں۔ خیر، خواجہ صاحب نے ہنس آنے پر بھی انہیں واپس کیا۔ ان کے جانے کے بعد حضرت اکبر نے بغیر مسکرائے کہا، ”میں تو سمجھتا تھا اس گھر میں فقط فرشتے نازل ہوتے ہیں۔“

واحدی صاحب اکبر کی شعر گوئی کے بارے میں لکھتے ہیں۔ شعر حضرت اکبر بے ساختہ ہی فرمایا کرتے تھے۔ ۱۹۱۲ء میں میری شادی کا دعوت نامہ گیا تو حضرت اکبر نے اس کی رسید یہ شعر لکھ کر دی:

واحدی کو دوئی مبارک ہو
یعنی شادی ہوئی مبارک ہو
آمد شعر کے بارے میں واحدی صاحب مزید لکھتے ہیں۔ حضرت اکبر خواجہ صاحب کو الہ آباد بلا رہے تھے اور خواجہ صاحب متعدد تقاضوں کے باوجود جانا نہ سکتے تھے۔ حضرت اکبر نے مجھ سے اس بات کی شکایت کی اور لکھا:

خواجہ حسن نظامی سے دلی نہ چھٹ سکی
حضرت ابو ہریرہ سے بلی نہ چھٹ سکی
کلام اکبر میں آورد نام کو نہیں تھی۔ طویل نظموں میں بے ساختگی ہے، حتیٰ کہ نظموں کے ترجمے بے ساختگی سے کیے ہیں، ترجموں کو اصل نظموں سے بڑھا دیا ہے۔

خواجہ صاحب کے نوابوں اور راجاؤں کے ساتھ تعلقات کس طرح کے تھے اس بارے میں واحدی صاحب کہتے ہیں:

ہر ریاست نے خواجہ صاحب کو درباری لباس سے مستثنیٰ کر رکھا تھا، خواجہ صاحب درباروں میں وہی لمبا کرتا

اور پچ گوتی ٹوپی پہن کر شریک ہوتے تھے۔

میں نے خواجہ صاحب کو ہندوستان کے راجہ نواب اور افغانستان کے بادشاہ سے ملتے اور باتیں کرتے دیکھے ہیں۔ راجہ، نواب اور بادشاہ جھکاؤ کھاتے تھے۔ خواجہ صاحب جھکاؤ نہیں کھاتے تھے۔ زیادہ سے زیادہ نوعیت کی ادائیں برداشت کر لیتے تھے۔

پڑھنے والوں کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ برصغیر سے پہلے ہندوستان میں چھوٹی بڑی سرکاری عمارتیں تھیں۔ جن کے اپنے اپنے دربار اور درباری تھے۔ خوشامد، چالپوسی، سازشیں، ریشہ دوانیاں عام تھیں۔ ریاستوں میں حیدر آباد کن سب سے بڑی ریاست تھی۔ اس کے برابر تھی۔ اس سازش ماحول میں کسی کی دل مشکل تھی اور پھر بادشاہوں کی طبع نازک پر ذرا ذرا سی گستاخانہ گوار گزرتی تھی۔ مگر خواجہ صاحب اس فضا میں کس طرح فاتح رہے اس کے لیے واحدی صاحب مولانا حسن ندوی کے مضمون، کا حوالہ دیتے ہیں جو بیان کرتے ہیں

خواجہ صاحب جتنے ذہین و فطین تھے اتنے ہی جملے بے باک بھی تھے اور اتنے ہی ماہر نفسیات بھی تھے۔ سب سے نازک اور ٹھن سے ٹھن گھڑیوں میں بھی ان کا دل ان کا ساتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ لیکن اس سے بھی زیادہ بڑی گراں قدر چیز خواجہ صاحب کی وہ جرأت تھی جس کا ہر مقصد اور انسان دوستی سے بندھا ہوا تھا۔ صاحب نے وادریک کے دربار میں کم ہی لوگ ہیں جنہوں نے بڑی بے باکی سے کام لیا ہو اور اس جرأت و بے باکی میں ان ہی دل کش و دل آویز پیام بھی موجود ہو۔ خواجہ صاحب ان خوبیوں کا ذکر کرنے کے بعد ندوی صاحب لکھتے ہیں۔

خسر و دن نواب میر عثمان علی خاں کے عہد عروج طمطراق شاہانہ کے قصبے ابھی بھولے نہ ہوں گے۔ اسے بڑوں کے سراسر بارگاہ بلند میں ادب و احترام سے جاتے تھے۔ خواجہ صاحب حیدر آباد پہنچے تو حسب باریابی کی عزت بخش گئی اور خواجہ صاحب بارگاہ خروار میں باریابی کے لیے روانہ ہوئے مگر زار دیر لگ گئی۔

کیا کہا؟

اُن کا غصہ ابھی پوری طرح فرو نہیں ہوا تھا۔ خواجہ صاحب نے جواب دیا۔ ظل سبحانی وہی عرش کر رہا ہوں۔ لیٹر بکس نے کہا۔

حسن نظامی! تو بادشاہ کے ہاں جا رہا ہے۔ وہاں جانے سے پہلے میری بات سنتا جا۔ میں لیٹر بکس ہوں۔ دن رات ایک طرح کھڑا

میر عثمان علی خان



رہتا ہوں۔ آنے والے لپک لپک کرتے ہیں۔ ان میں عورت مرد، بوڑھے، جوان، باپ، بیٹے، بھائی، بہن، میاں بیوی، عاشق، مشوق، امیر، غریب، گورے، کالے، سبھی ہوتے ہیں۔ سب آتے ہیں اور مجھ پر اعتماد کر کے اپنی اپنی امانتیں اپنے سینوں سے نکال نکال کر میرے سینے میں ڈال جاتے ہیں۔ میں جاڑوں میں ٹھہرتا ہوں، گرمیوں میں تپتا جھلتا ہوں۔ برسات میں بھیگتا ہوں مگر کسی کی امانت ضائع نہیں ہونے دیتا۔ سب کی امانتوں کو سینے سے لگائے رکھتا ہوں اور چھپائے رکھتا ہوں اور ساری امانتیں ان تک پہنچاتا ہوں جن کے حصے کی ہوتی ہیں۔ حسن نظامی! تو بادشاہ کے ہاں جا رہا ہے تو میرا پیغام بھی لیتا جا۔ بادشاہ سے کہو۔ بادشاہ لیٹر بکس ہیں۔ سب کی امانتوں کے امین۔ سب کے معتمد علیہ اور سب کی امانتوں کو صحیح جگہ پہنچانے والے۔ بس ظل سبحانی! ان باتوں کی وجہ سے بارگاہ خسروی تک پہنچنے میں دیر ہوگئی۔ ورنہ حسن نظامی ٹھیک وقت پر پہنچتا۔

نظام جھوم اٹھے اور بہت خوب۔ بہت خوب کے نعرے لگانے لگے۔ یہ واقعہ خواجہ صاحب نے اپنے روزنامے میں لکھا ہے۔ ان کے بیان و زبان میں جو کیف اور اثر ہوتا تھا اسے چھوڑیے۔



مجرموں کا سامنا کرتے ہوئے اپنی حفاظت خود کرنا سیکھیے

ان طریقوں کا بیان جن کی مدد سے آپ ہر قسم کے مجرم کا بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں

حبیب صاحب، بیگم اور تین بچوں کے ہمراہ اپنی گاڑی میں سواری جی ٹی روڈ پر سفر کر رہے تھے۔ ایک سنان مقام پر اچانک کوئی پک اپ والا ان کے پیچھے پڑ گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ اپنی گاڑی ان کی کار کے آگے لے آئے۔ نجانے وہ کیا چاہتا تھا؟ حبیب نے پوری رفتار سے کار چلا دی۔

لگتا تھا کہ پک اپ والا شرمی ہے کیونکہ وہ لہراتے ہوئے گاڑی چلا رہا تھا۔ خطرہ دیکھ کر حبیب کے بیوی بچے چیخیں مارنے لگے۔ ان کی خوش قسمتی دو میل بعد ہی انہیں پولیس کی ایک گاڑی نظر آگئی۔ اسے دیکھ کر پک اپ والا رو چکر ہوا۔ حبیب آج تک نہیں جان پائے کہ وہ دیوانہ پک اپ والا آخر کیا چاہتا تھا؟

یہ روح فرسا واقعہ کسی کے ساتھ بھی پیش آ سکتا ہے لیکن وہ لوگ زیادہ متاثر ہوتے اور نقصان اٹھاتے ہیں جو ذہنی و جسمانی طور پر یکا یک روٹنا ہونے والے جرم یا حادثے کے لیے تیار نہ ہوں۔ مگر جو مرد وزن پیش بینی

مردانی دنیا میں گن ہوں۔
اگر آپ کسی جگہ مجرم میں ہوں تو اس شخص پر نظر رکھیے
پہلے رویے، لباس یا طور طریق سے علیحدہ و ممتاز نظر
کے۔

رد عمل کیسا ہونا چاہیے؟

ماہرین کا کہنا ہے کہ اگر کوئی چور یا ڈاکو آپ پر حملہ کرے تو ”مد، مد“ پکارنے کے بجائے ”آگ، آگ“ کہے۔ وجہ یہ ہے کہ ”مد، مد“ یا ”بچاؤ، بچاؤ“ کے الفاظ سن کر ہر کوئی اپنی جان بچانے کی فکر کرتا ہے لیکن بالفاظ مختلف رد عمل پیدا کرتا ہے۔

جب بیشتر لوگ کوشش کرتے ہیں کہ ”آگ، آگ“ پکارنے والے کی مدد کو پہنچیں یا کم از کم تجسس کے ہاتھوں چور کو آپ کے پاس آجائیں گے۔ معاملہ جو بھی ہو، آپ تک مدد پہنچ جائے گی۔ اگر رات کو سوتے میں کوئی کھانا یا آواز سن کر آپ کی آنکھ کھل جائے تو جی ہرگز نہ کہیں۔ وجہ یہ ہے کہ پھر آپ اندھیرے میں دیکھنے کے قابل نہیں رہیں گے۔ مزید برآں چور یا ڈاکو فوراً پتا چل جائے گا کہ آپ کہاں ہیں۔

ماہرین مشورہ دیتے ہیں کہ ایسی صورت حال میں فوراً پولیس یا محلے کے چوکیداروں سے بذریعہ موبائل یا فون رابطہ کیجیے۔ نیز گھر میں کوئی ایسا آلہ لگوا کیجیے جو اونچی اور خوفناک آواز پیدا کرے۔ چور یا ڈاکو کی آمد پر ایسا آلہ بجایا جائے تو وہ عموماً ڈر کر فرار ہو جاتے ہیں۔

آپ اگر اغوا ہو جائیں

اغوا خطرناک جرائم میں شامل ہے۔ وجہ یہ ہے کہ مجرم باقاعدہ منصوبہ بنا کر کسی کو اغوا کرتے اور اسے ایسی جگہ لے جاتے ہیں جہاں اسے موت کے کھٹک بھی اتارا سکتے۔ چنانچہ ایسی صورت حال میں اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے درج ذیل قدم اٹھائیے۔

اگر باڈار یا اغوا مقام پر اغوا کی کوشش ہو تو یہی

وقت مجرم یا مجرموں پر سب سے بھاری ہوتا ہے اور آپ کے بچنے کا بھی یہی موقع ہے۔ چنانچہ خوب شور مچائیے، مجرم سے ہاتھ پائی کریں اور بچنے کی ہر ممکن کوشش کیجیے۔ اگر اغوا کنندہ مسح ہیں تو صورت حال دیکھ کر فیصلہ کریں کہ آپ نے خاموش رہنا یا بیچنا ہے۔

اگر آپ گاڑی کی ڈک میں بند ہو جائیں تو حواس قابو میں رکھیے۔ جی کاروں میں ڈک کے اندر حفاظتی ہینڈل ہوتا ہے۔ اسے دبا کر ڈک کھول لیجیے۔ اگر ہینڈل نہ ملے تو کچھلی جی کو توڑیے اور پھر سوراخ سے بازو یا ٹانگ نکال کر دوسروں کی توجہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

مشق کیجیے

جب کوئی ناگہانی آفت آئے تو بہت سے لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور چہرہ سفید پڑ جاتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ خطرے کی حالت میں جسم انسانی کے دفاعی نظاموں کی ہدایت پر خون چہرے، ہاتھوں اور پیروں سے نکل کر بدن کے اندرونی حصوں میں چلا جاتا ہے۔ اس عمل سے ہمارے حرکی (Motor) نظام کو دھچکا پہنچتا ہے۔ ایسی حالت میں پھر ہماری انگلیاں حتیٰ کہ زبان بھی اپنا کام صحیح طرح انجام نہیں دے پاتی۔

اس لیے ماہرین کہتے ہیں کہ پولیس یا کسی امدادی ادارے کو نہ صرف فون کرنے کی مشق کیجیے، بلکہ یہ بھی کہ آپ نے کیا کہنا ہے۔ مثلاً یہ کہ ”میں ۵۳-بی، گلشن اقبال سے بول رہا ہوں۔ میرے گھر میں چور گھر آئے ہیں، فوراً آئیے۔“

مشق کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ پولیس طلب کرنا یا کسی سے مدد مانگنا مشینی عمل بن جاتا ہے جو خود بخود انجام پاتا ہے۔ ورنہ خصوصاً خطرے کی حالت میں بوڑھے مرد وزن سے بولا بھی نہیں جاتا۔ اسی طرح بزدل اور کمزور دل خواتین و حضرات کی بھی سٹی گم ہو جاتی ہے۔ دراصل جب موت سر پر کھڑی ہو، تو ذہن ماؤف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ مدد مانگنے کا عمل مشینی ہونا چاہیے۔ ■

یہاں دنیا میں سب سے زیادہ بارش ہوتی ہے

چرانپونجی کے نرالے باسی

دشوار گزار راستے عبور کرنے کی خاطر درختوں کی جڑوں سے
بنے عجیب و غریب پل سیاحوں کو حیران کئے دیتے ہیں

فتح نیاز

بارش

خاصیوں کے لیے اجنبی شے نہیں
بلکہ وہ اس کی معیت میں زندگی
بسر کرنے کے عادی ہو چکے۔

تریا ۱۰۰ ہزار خاصی شمال مشرقی بھارتی ریاست،
میشالاہ کے ضلع مشرقی خاصی ہل (East Khasi Hill)
میشالاہ کے قبیلہ خاصی جنوب مشرقی ایشیائی قبائل سے
تعلق رکھتے ہیں۔

ضلع مشرقی خاصی ہل کی خصوصیت یہ ہے کہ دنیا
میں سب سے زیادہ بارشیں اسی علاقے میں ہوتی ہیں۔
خاص طور پر ضلع کے دو علاقے چرانپونجی اور مہسوام تو
اس قسم میں عالمی شہرت رکھتے ہیں۔ دراصل علاقے
کے چاروں طرف پہاڑ واقع ہیں۔ چنانچہ وہ خلیج بنگال
سے آنے والے بادلوں کو اپنے چھوٹے سے علاقے
میں جمع کرتے اور پھر انھیں برسنے پر مجبور کر دیتے
ہیں۔ لہذا چرانپونجی وغیرہ میں سال کے بیشتر عرصے
بارشیں جاری رہتی ہیں۔

۱۹۷۳ء سے ۲۰۱۰ء تک چرانپونجی میں ۱۲ میٹر بارش
ہوئی۔ یہی قصبہ یہ ریکارڈ بھی رکھتا ہے کہ ایک سال میں
میں سب سے زیادہ بارش ہوئی۔ جولائی ۱۸۶۰ء تا جولائی
۱۸۶۱ء چرانپونجی میں ۳۶ میٹر سے زیادہ بارش ہوئی۔

جہاں بارشیں زیادہ ہوتی ہوں، وہاں رہنا بسنا آسان
نہیں۔ ایسے علاقے میں وہی بس سکتے ہیں جو قوت
برداشت، مضبوط جسم اور اختراع پسندی کی خاصیتیں رکھتے
ہوں۔ چنانچہ خاصی انہی خصوصیات سے متصف ہیں۔
چرانپونجی کا علاقہ بڑا اگ تھلگ ہے۔ پہلے کلکتہ سے

میشالاہ کے صدر مقام، گوبائی پہنچے پھر وہاں سے ٹوٹی
پھوٹی سڑک چرانپونجی جاتی ہے۔ علاقے تک پہنچتے ہوئے
۶ گھنٹے لگتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر پھر سیاح رہنما (کانیڈ)
کے ساتھ من پسند دیہات کا دورہ کرنے نکل جاتے ہیں۔
سیاحوں کے لیے علاقے کی سب سے پرکشش شے
درختوں کی جڑوں اور بانسوں سے بنے انوکھے پل ہیں۔
ایک گاؤں، سوہرت کا کھیا ۵۸ سالہ نجوت فارنگ بتاتا
ہے ”ہم اسٹیل سے اپنے پل تیار کرنا چاہتے تھے لیکن رقم
کی عدم دستیابی کے باعث فطرت سے مدد لینا پڑی۔“
سوہرت دیہہ کے نزدیک ہی ایک بڑا قدیم جڑوں والا
پل ”اموٹوئی“ واقع ہے۔

دراصل علاقے میں چھ سات ماہ بارشیں ہوتی ہیں
پھر پہاڑی ہونے کے باعث علاقہ دشوار گزار اور گھاٹیوں
سے پر ہے۔ چنانچہ دیہاتیوں کو اپنے باغات تک پہنچنے یا
جلانے کی لکڑی جمع کرنے کے واسطے کئی ندیاں نالے عبور
کرنے پڑتے ہیں۔

سوہرت میں ایک سوگھرانے بستے ہیں۔ علاقے
کے مختلف مقامات پر ہر گھرانے کا ایک باغ واقع ہے۔
وہاں وہ مختلف پھل یا مسالہ جات اگاتے ہیں لیکن ہر
گھرانہ علاقے کے تین پل پار کر کے ہی اپنے باغ تک
پہنچتا ہے۔ ان میں سب سے اہم اموٹوئی ہے۔ ہفتے کے
چھ چھ دن گھرانے کا ہر فرد باغ میں کام کر کے پیٹ
پالنے کا بندوبست کرتا ہے۔ تیار ہونے پر مال قریبی
منڈیوں میں فروخت ہوتا ہے۔

علاقے کے فطری چیلنجوں سے مقابلہ اور اپنی بقا کی



”یہاں وہی زندہ رہ سکتے ہیں جن کے مضبوط

اجسام میں بے پناہ قوتِ برداشت ہو“

کلسی سے

کم زہدیں

تحریم حنا صدیقی

۳ گمرگ نام پاکستانی ہیروز

جن کے واقعات پڑھ کر انسان کا سر فخر سے بلند ہو جاتا اور اپنے پاکستانی ہونے پر ناز محسوس ہوتا ہے
باوقار زندگی کے لیے خدا موقع سب کو دیتا ہے

ہے جس کے صحت مند اور نامیل انسان تو ایک طرف ، معذور بھی حوصلہ مند اور باوقار زندگی گزارنے کے خواہش مند ہیں۔ بے حساب مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں لیکن صفحات کی کمی آڑے آ رہی ہے۔

یہ ہمارے ہی معاشرے کی چند جھلکیاں ہیں۔ یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر مواقع و وسائل مہیا کیے جائیں تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے۔

ماہ رفتہ میں رونما ہونے والے
اہم واقعات اور ان سے
ملنے والی شخصیات کا اجتماعی تذکرہ
جو ملک کا دستارِ روح ہے
پاکستان

ان کے لیے خاص جتنیں پاکستان اور
پاکستان کی عزت بے حد عزیز ہے

آج ہم آپ کی ملاقات تین ذہین و فطین مگر جسمانی لحاظ سے معذور پاکستانی افراد سے کر رہے ہیں جنہوں نے اپنی معذوری کو اپنی راہ میں رکاوٹ نہ بننے دیا، بلکہ اسے ایک چیلنج سمجھ کر قبول کیا اور صحت مند انسانوں کے ساتھ اپنے آپ کو جرات و ہمت کا ایک مثالی کردار بنا کر پیش کیا۔
ہم یہ بات یقین سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ وہ عظیم قوم



خاطر صدیوں پہلے خاصوں نے فطرت ہی سے مدد لی۔ انھوں نے پہلے تنوں اور بانسوں سے پل بنائے لیکن تیز بارشوں نے بہت جلد انہیں نیست و نابود کر دیا۔ آخر کئی سو سال پہلے ایک خاصی کو خیال آیا کہ درخت کی جڑوں کو پل بنانے میں استعمال کیا جائے۔

خوش قسمتی سے علاقے میں ملنے والے ربڑ درخت بڑی لمبی اور مضبوط جڑیں رکھتے ہیں۔ مزید برآں جڑوں کی نشوونما بھی تیز رفتار ہوتی ہے۔ خاصیوں کو جہاں پل بنانا ہو، وہاں لگے ربڑ کے درخت کام میں لائے جاتے ہیں۔ لاکھوں برس کے عرصے میں ربڑ کے درخت فطرتاً اس قابل ہو چکے کہ شدید بارشوں اور آب بردگی (Erosion) کو برداشت کر

سکیں۔ لہذا ۱۵ سے ۲۰ سال میں پل اتنا مضبوط ہو جاتا ہے کہ انسانوں کا بوجھ سہا سکا۔ اس پل کا فرش و سہارے باہم پیوست مضبوط جڑوں، بانسوں اور تختوں سے بنتے اور انسانوں کو یہ سنہرا موقع عطا کرتے ہیں کہ وہ بہ اطمینان و حفاظت انھیں استعمال کر لیں۔

اس وقت علاقے میں جڑوں سے تحقیق ہوئے ایسے ۱۵ پل روزانہ ۴ ہزار خاصیوں کو یہ سہولت عطا کرتے ہیں کہ وہ آرام سے سرکش ندی نالے پار کر لیں۔ تاہم یہ ضروری ہے کہ پل استعمال کرنے والے ۲۳ گھنٹے ان کی نگہداشت کریں۔ اس ضمن میں نجات فارنگ کا کہنا ہے: ”میرے گاؤں کے کبھی مردوں، عورتوں اور بچوں نے بھی نہ کبھی ۱۷ میٹر طویل امومونی پل کی تعمیر یا مرمت میں حصہ لیا۔ جب بھی پل پار کرتے ہوئے کوئی دیکھے کہ کوئی جرباس سے الگ ہو چکی تو وہ اسے پھر باندھ دیتا ہے۔“

یہ پل دراصل محض جڑیں نہیں رہے بلکہ مقامی تہذیب و ثقافت کا حصہ بن چکے۔ چنانچہ خاصی بچوں کی طرح ان پلوں کی حفاظت کرتے اور انھیں چاہتے ہیں۔ روایت ہے کہ امومونی پل ڈیڑھ سو سال پرانا ہے۔ لہذا کئی

آج

خاصیوں کے اجداد اسے استعمال کر چکے۔ اس لیے بھی کے نزدیک یہ پل مقدس درجہ رکھتے ہیں۔ امومونی تو سب سے قدیم ہے، جب کہ علاقے مشہور پل ”امشیا گنگ“ ہے۔ یہ نو گریٹ نامی گاؤں کے نزدیک واقع اور ۲۰ میٹر لمبا ہے۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ دو گزر گاہوں پر مشتمل ہے۔ اسی لیے ”ڈبل ڈیکر“ کی عریت سے شہرت رکھتا ہے۔ پل پر ایک وقت میں چالیس پچاس افراد چل سکتے ہیں۔

امشیا گنگ کی دو گزر گاہیں خاص مقصد کے تحت بنائی گئیں۔ دراصل ۱۵ سال قبل پل کی ندی میں اتنا پانی تھا کہ وہ اس میں ڈوب گیا۔ لہذا دیہاتیوں نے موجودہ گزر گاہ سے اوپر ایک اور راستہ بنا لیا۔ چنانچہ اب ندی میں زیادہ پانی آئے تو اوپر والی گزر گاہ استعمال ہوتی ہے۔ درختوں کی جڑوں سے بننے والی کئی سو برس سے انسانوں کے کام آ رہے ہیں۔ اب یہ سیاحوں کی نگاہ میں بھی آچکے۔ لہذا دنیا بھر سے سیاح چرانیچھی دیکھنے کے علاوہ ان عجیب و غریب پلوں کی دید کے لیے بھی آتے ہیں۔ گویا یہ بھی علاقے کی پہچان بن چکے۔

ڈاکٹر صاحب جنہوں

نے اپنی معذوری کو اپنی

راہ میں آڑے آنے

نہیں دیا۔ دنیا میں

ایسے بہت سے

انسان ہیں جو صرف

اللہ کی مخلوق سے

محبت کے لیے پیدا

ہوتے ہیں اور ان کی

زندگی کا صرف ایک ہی مشن



ہوتا ہے کہ دھمی انسانیت کو راحت اور آسودگی پہنچانے کے اسباب پیدا کیے جائیں۔ اس راستے میں آنے والی دشواریوں کو وہ خندہ پیشانی اور جواں ہمتی سے برداشت کرتے ہیں اور ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔ ایسی ہی ایک نیک دل ہمتی میوہپتال لاہور کے ڈیپارٹمنٹ آف فزیکل میڈیسن اینڈ ری ہیبیلی ٹیشن (Rehabilitation) کے سربراہ ڈاکٹر خالد جمیل اختر ہیں جنہوں نے معذوری کو اپنے مشن کے آڑے نہیں آنے دیا اور آج ہزاروں انسان ان سے مستفید ہو رہے ہیں۔ حال ہی میں انہیں ان کی انسانیت کی بے مثال خدمت کے اعتراف میں حکومت پاکستان نے ستارہ امتیاز سے نوازنے کا اعلان کیا ہے۔ آپ آل پاکستان ڈین آف میڈیکل فیکلٹی ری ہیبیلی ٹیشن کے چیئرمین ہیں جبکہ سول اور فوجی اداروں میں بھی آپ کے ٹرینڈ (تربیت شدہ) ڈاکٹرز اس وقت اپنے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

☆ تعلیمی کیریئر

ڈاکٹر صاحب نے بتایا ”میرے والد صاحب کیونکہ سول سروس میں تھے، اس لیے میں نے اپنی تعلیم پورے ملک میں گھوم پھر کر مکمل کی۔ ہمارا تعلق اگرچہ پنجاب سے ہے لیکن میری ابتدائی تعلیم کراچی سے شروع ہوئی۔ پانچویں جماعت تک میں کراچی میں پڑھتا رہا۔ بعد ازاں میٹرک اور ایف ایس سی کیڈٹ کالج پٹنارو سے کیا اور میں نے ٹاپ پوزیشن حاصل کرتے ہوئے سینٹر (CENTO) سکالرشپ حاصل کیا۔ کیڈٹ کالج میں تعلیم کے دوران ہی مجھے اعلیٰ تعلیمی ریکارڈ کے باعث امریکی حکومت کی طرف سے سوڈ آف آنر ملا۔

☆ زندگی کا سنگین ترین حادثہ

میں اُن دنوں ایم بی بی ایس تھروڈاٹر کا سٹوڈنٹ تھا، جب میں اور میرا دوست سمج گاڑی پر چارے تھے کہ ہمارا ایکسیڈنٹ ہو گیا اور میری کمر کی ہڈی فریکچر ہو گئی جس کے بعد میں چارپائی سے لگ گیا اور ڈاکٹروں نے میرے والدین کو بتایا کہ اب یہ ساری زندگی اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لیکن خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میرے والدین کی دعاؤں اور میری قوت ارادی (Will power) کی بدولت میں دوبارہ زندگی کی طرف رواں دواں ہو گیا۔ اس موقع پر یہ بتانا چاہوں گا کہ اگر میرے والدین اسی طور پر مضبوط نہ ہوتے تو شاید میرا اچھا حال نہ ہو پاتا۔ میرے والدین نے اندرون اور بیرون ملک (برطانیہ) میں میرے علاج کے لیے کوئی کسر نہ چھوڑی۔ میرا دوست سمج جو میرے ساتھ تھا اس کو فریکچر ہو گئے تھے لیکن اس کیونکہ ایک غریب گھرانے کا فرد تھا اس لیے اس کا علاج اس طرح نہ ہو سکا جس طرح میرا ہو سکا۔

☆ جذباتی سہارا نہ ہوتا

میرا نظریہ ہے کہ کسی بھی قسم کے صدمے اور مصیبت

نے نکلنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان دماغی طور پر مضبوط ہونے کے ساتھ دل کے معاملے میں بھی مضبوط ہونا چاہیے۔ درود دل رکھنے والے افراد ہمیشہ ترقی کرتے ہیں لیکن اس کی ابتدا دماغ سے ہوتی ہے۔ یعنی کوئی جذباتی سہارا نہ ہو تو انسان ترقی نہیں کر سکتا۔ اگر ایک گناہ سپاہی بارڈر پر بیٹھ کے یہ سوچے میں یہاں اکیلا پڑا ہوا ہوں میری کیا اہمیت ہے، تو وہ ملک کا دفاع نہیں کر سکتا جب تک کہ اس کے دل میں وطن کے لیے جذباتی محبت نہ ہو۔ اسی طرح مجھے بھی اپنے والدین کی طرف سے جذباتی سپورٹ حاصل تھی جس کے بل بوتے پر میں اس صدمے سے نکلنے میں کامیاب ہو سکا۔

میں اس ڈیپارٹمنٹ کو اپنا گھر اور اس سے متعلقہ افراد کو اپنے بچوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ سب لوگ بھی مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتے ہیں۔ اس ادارے میں اس وقت ۱۳۰ مختلف قسم کے مصنوعی جسمانی آلات بن رہے ہیں۔ انسان کے جسم کا کوئی ایسا عضو نہیں جو اس وقت یہاں نہیں بن رہا۔ اس سلسلے میں ہمیں بیت المال اور دیگر اداروں کا بھرپور تعاون حاصل رہتا ہے۔ ہماری ایک ورکشاپ ملتان میں بھی ہے جہاں مصنوعی اعضاء بنتے ہیں۔ کراچی میں ڈاکٹر نبیلہ سومرو میری شاگرد ہیں اور وہاں پر ورکشاپ چلا رہی ہیں جبکہ راولپنڈی میں فوجی فاؤنڈیشن میں بھی ہماری ہی زیر نگرانی کام ہو رہا ہے۔

☆ پولیو کے شکار بچے کی جہد مسلسل کی کہانی

علی حسین شوکت

علی حسین شوکت کا گھر جی ٹی روڈ باغیانپورہ کے تنگ و تاریک گلیوں میں واقع ہے۔ کئی سال قبل خستہ حال کوئی دیوار اور گری ہوئی چھت پر مشتمل یہ گھر آج کے

مکان میں تبدیل ہو چکا ہے۔ دروازے پر علی حسین شوکت ریجنل منیجر لوکل کپنی نام کی پلیٹ اس کی کامیابیوں کی گواہی دے رہی تھی۔ علی حسین کی والدہ نے ایک سچے اور اعلیٰ نفاست کے حامل ڈرائنگ روم میں بٹھایا جس کے ایک شوکیں میں علی حسین کی تعلیمی کامیابیوں کے میڈل اور ٹرافیوں بھی ہوئی تھیں۔ علی حسین کی والدہ نے بتایا کہ ان کا تعلق فیصل آباد کے ایک نواحی گاؤں سے ہے۔ ہم غریب لوگ ہیں، ہماری کوئی جائیداد نہیں اور ہمارا آبائی پیشہ ترکھانوں کا کام تھا۔ گھر میں غربت تھی، گاؤں میں کوئی چارپائی مرمت یا لکڑی کا چھوٹا موٹا کام مل جاتا تو ۲ روپے کی روٹی پکا لیتے ورنہ اکثر فالتے ہی رہتے۔ علی حسین میری دوسری اولاد تھی۔ یہ خوبصورت بچہ اپنی قسمت لے کر دنیا میں آیا۔ اس سے بڑی بیٹی ہے۔ میں سارا دن لوگوں کے گھروں میں کام کرتی تھی۔ علی حسین کے والد کچے گھر کی دیوار کے ساتھ اپنے اوزار سجائے اپنی دکانداری میں مصروف رہتا۔

☆ پولیو کا حملہ

چھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ علی حسین کی ایک ٹانگ کام نہیں کر رہی اور بے جان ہے۔ اس کی جسمانی نشوونما میں تبدیلی تو نظر آئی لیکن ٹانگ جیسے سوکھ رہی ہے۔ گاؤں کے کسی سیانے نے بتایا کہ یہ پولیو ہے اور اس کا علاج ناممکن ہے۔ زندگی کی گاڑی چلتی رہی، ۲ روپے کی روٹی کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے۔ ایک دن اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ ہم نے تو جیسے تیسے زندگی گزار دی۔ یہ معذور بچہ تو اپنے باپ دادا والا کام بھی نہیں کر سکتے گا، نہ تعلیم نہ ہنر اور نہ ہی کوئی جائیداد جس کی آمدنی سے اس کی زندگی کا سفر کٹ جائے۔ میں نے علی حسین کے والد سے مشورہ کیا۔ وہ اس گاؤں کو چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ تھا

لیکن میری ضد اور علی حسین کے مستقبل کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ ۴ سالہ پولیو زدہ علی حسین کو لے کر ہم لوگ لاہور آگئے۔ یہاں باغبانپورہ میں جہاں یہ گھر آباد ہے ایک کچا مکان اور اس کے کنارے پر جہاں آج یہ ڈرائنگ روم تعمیر ہے ایک تور ہوتا تھا۔ علی حسین کے والد نے اس تور پر نوکری کر لی۔ سارا دن تندرستی آگ میں جھلتا روٹیاں تان لگاتا اور روزی کھاتا۔

☆ حافظہ کمال کا تھا

علی حسین کو مقامی سکول میں داخل کرایا تو اس کی آنکھوں میں ایک چمک نے اس کے اساتذہ کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ کچھ کرنا چاہتا تھا۔ خدا نے اسے غیر معمولی دماغی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ اس کا حافظہ کمال کا تھا اور پڑھائی میں اس کی دلچسپی جنوں کی حد تک تھی۔ اس کی استانی بشری گود میں اٹھا کر ایک کلاس سے دوسری کلاس میں لے جاتی۔ اس کے دیگر اساتذہ پرنسپل اور دیگر شاف اس کا خاص خیال رکھتے علی حسین کی زندگی کی پہلی کامیابی پنجم جماعت میں وظیفے کے امتحان کو پاس کرنے کی صورت میں ملی اور اسے وظیفہ ملا۔ گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ میں داخل کرایا تو یہاں ظہور احمد، محمد عارف اور ہیڈ ماسٹر ملک نذیر احمد جیسے قابل اساتذہ سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔

”میں بھی اپنا چمک بھکاری ہو سکتا تھا۔“ علی حسین نے اپنی عینک کے شیشے صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمارے گھر میں بھڑی نہ تھی۔ میری ماں اندازے سے مجھے اپنے سکول پہنچاتی۔ کئی دفعہ تو چھٹی سے ایک گھنٹہ پہلے آجاتی اور سکول کے باہر زمین پر بیٹھ کر چھٹی کا انتظار کرتی۔ کئی دفعہ وہ تاخیر سے پہنچتی تو مجھے انتظار کرنا پڑتا۔ ایک روز وہ بروقت نہ پہنچ سکی، چوکیدار نے بے خبری میں سکول کو تالا لگا دیا اور میں اندر بند ہو گیا۔ میری ماں روٹی ہوئی چوکیدار کے گھر پہنچی اور اسے لے کر آئی۔ میں اندر بیٹھا روتا رہا تھا۔ اگر میری

بہن اور ماں کسی میں میرا ساتھ نہ دیتیں تو آج میں ایک پانچ اور بھکاری کی زندگی گزار رہا ہوتا۔“ علی حسین عینک خاموش ہو گیا اور اس کی آواز کہیں گم ہو گئی۔ اس کے چہرے پر اپنی مہربان ماں اور بہن کے لیے مومنیت کے رنگ ابھرنے لگے جنہیں عینک کے پیچھے آنکھوں سے گرتے آنسوؤں نے مزید نکھار دیا۔ میں سوچنے لگا کہ اگر اللہ تعالیٰ اس کی ماں کو اپنے معذور بیٹے کا مددگار بننے کا شعور اور ہمت عطا نہ کرتا تو آج میرے سامنے بیٹھا ہوا یہ باہمت نوجوان معاشرے کا ایک گمنام، بے حیثیت معذور نوجوان ہوتا جو ایک وقت کے کھانے کے لیے بھی دوسروں کا محتاج ہوتا۔ مصائب، عزم اور انسانیت کے رنگوں سے مزین کہانی کا سلسلہ پھر سے جڑ گیا۔

میں نے میٹرک کا امتحان اعلیٰ نمبروں سے پاس کرایا اور ایف ایس سی میں داخلہ لینا چاہتا تھا لیکن میرے والد مجھے ایک بار پھر درزی بننے کی تلقین کرنے لگے۔ اس موقع پر میرے استاد محمد عارف نے میرے والد کے ساتھ ہر کھپائی کی اور گورنمنٹ کالج باغبانپورہ میں داخل کرایا۔ میں نے ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا۔ ابتداء میں تو مجھے کچھ ہی نہیں آئی۔ نصاب انگریزی میں تھا اور مجھے کسی قسم کی ٹیوشن یا کوچنگ کی سہولت نہ تھی۔ میرا تعلیمی سفر جاری تھا۔ میں اپنے دستوں کی کتابوں سے نوٹس بناتا۔ کئی گھنٹے شاییار باغ کی دیوار کے سائے میں بیٹھ کر کتابیں پڑھتا، کالج میں میرے شفیق استاد ظفر اقبال صاحب اکثر میری مالی مدد بھی کیا کرتے تھے۔ ادھر میرے والد کا تور جلتا رہا اور ادھر میں تمام تر مصائب کے باوجود تعلیمی منزلیں طے کرتا چلا گیا۔ ایف ایس سی کے بعد میں نے کمپیوٹر سائنسز کی تعلیم حاصل کرنے کی ٹھان لی۔ مقامی یونیورسٹی کی فیس میری دسترس میں نہ تھی۔ کوئی آس اور امید نہ تھی، میں نے یونیورسٹی کے چکر لگائے۔ اس کارشب کے لیے اپلائی کیا، مگر کسی نے نہ سنی۔ اکثر اوقات میری معذوری آڑے آئی۔ لوگ ترس بھری نظروں سے دیکھتے

میں رنگ کے چلتا تھا۔ میرے پرانے کپڑے بھی گندے ہو جاتے۔ کئی دفعہ تو مجھے بھیک مانگنے والا سمجھ کر لوگ سکے اچال جاتے تھے لیکن میں نے ہمت نہ ہاری۔ کسی مہربان سے مشورے سے ایک خیراتی ادارے میں یونیورسٹی فیس کے اخراجات برداشت کرنے کی درخواست دی جسے قبول کر لیا گیا اور یوں میرا داخلہ لاہور کی اچھی نجی یونیورسٹی میں ہو گیا۔ کالج کے ایک شفیق استاد عامر خان صاحب نے کہیں سے ایک پرانی ویل چیمبر کا بندوبست کر دیا جس سے مجھے آنے جانے میں سہولت مل گئی۔ میں باغبانپورہ سے گبرگ ویل چیمبر پر ہی سفر کرتا۔ شام کو محلے کے بچوں کو یونین پڑھاتا۔ ساتھ میں ایک آدھ گھنٹہ اپنے والد کی مدد کے لیے تور پر نانوں پر کچی لگانے کا کام بھی سرانجام دیتا۔ رات گئے تک کتابوں میں مغز ماری کر کے صبح یونیورسٹی چلا جاتا۔ میری ماں نے اپنا پیٹ کاٹ کر قسط پر ایک کمپیوٹر لے دیا جس نے میری زندگی ہی پلٹ دی۔ میرا بہت سادہ کمپیوٹر پر گزرتا اور میں نے کمپیوٹر سائنس میں بی ای ایس کی ڈگری نمایاں نمبروں سے حاصل کی۔ یونیورسٹی نے میرے لیے سکارشپ اور ایم سی ایس کے لیے مفت تعلیم کا اعلان کیا۔

☆ ملٹی نیشنل کمپنی میں

فیصل آباد کے نواحی گاؤں کے کچے مکان کی چارپائی کے ساتھ بندھے ہوئے کپڑے کے جھولے میں پڑنے معذور بچے جس پر کھیاں جھبھکتی تھیں، جسے دن میں ایک مرتبہ دودھ میسر تھا۔ اپنی ماں کے ساتھ یونیورسٹی کے کانوینشن میں اپنی ایم سی ایس کی ڈگری اور رول آف آئز لینے کے لیے پہنچا تو ہال میں موجود تمام طلباء و طالبات اور شرکاء نے تالیوں کی گونج میں میرا استقبال کیا۔ آنسو برسے گاؤں سے لڑھکتے جا رہے تھے اور میں نے اپنی ماں کے ساتھ اس ڈگری کو وصول کیا۔

لوگوں سے مبارکبادیں وصول کرتے ہال سے باہر

اپنی ویل چیمبر دھکیلتا آیا تو ایک سفید بالوں والی انتہائی نفیس شخصیت کی آواز نے روک لیا۔ ”میرے آفس میں کام کریں گے؟“، مسکراہٹ والے چہرے نے یہ سوال کیا۔ ”جی کہاں؟.....“ میں نے تجسس بھرے لہجے میں جواب دیا۔ وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا مالک تھا۔ مختلف کمپنیز کے لیے مشاورت دینے کا کام تھا لیکن یہ اتنا آسان نہیں جتنا لکھ دیا گیا۔ اس کمپنی کو کسی بھی کاروبار کے لیے مارکیٹ کا سروے مارکیٹ کے حالات اور پیش گوئیوں کی روشنی میں کسی کے مستقبل کے بارے میں بتانا ہوتا ہے۔ مجھے یہاں پہلے تو اسسٹنٹ منیجر کی جگہ تعینات کیا گیا۔ تین ماہ کے بعد ریجنل منیجر بنا کر میرے عہدے میں اضافہ کر دیا گیا۔ تین سالوں میں میں نے سخت محنت کر کے یہاں اپنا نام اور مقام بنایا ہے۔ یہ کمپنی مجھے معقول تنخواہ دے رہی ہے۔ میں نے سب سے پہلے وہ جگہ جہاں میرے والد نے ساری عمر روئیاں اور نان لگائے، اُسے خریدا اور اس پر یہ گھر تعمیر کرایا۔ میرے والدین ج کی سعادت سے فیضیاب ہوئے اور میں اب ایک خوش حال زندگی بسر کر رہا ہوں۔

(ایس۔ ایچ صاحب)

شبانہ روز کوششوں اور کاوشوں کا شہر

طارق مرزا

جسمانی معذوری کے باوجود فنی سفر کا میابی سے طے کیا۔ طارق مرزا ایک پرعزم اور جوان ہمت ڈر نایاب ہے۔ جسمانی معذوری کے باوجود اپنی فنی تحقیقی صلاحیتوں سے معاشرے میں ایک عظیم آرٹسٹ کی حیثیت سے ایک بلند مقام اور بے پناہ مقبولیت حاصل کر چکا ہے حالانکہ افراتفری کے اس دور میں ہمارا معاشرہ اور معاشرتی نظام ایسے توجہ طلب اشخاص کو ذہنی اور جسمانی طور پر نامکمل ہونے کی وجہ

سے وہ مقام اور مرتبہ و ماحول مہیا نہیں کرتا جس کا ایک جیتا جاگتا انسان حقدار ہے۔ بے جا حوصلہ شکنی، تشکیک آمیز رویہ اور عدم توجہ سے ایسے خوبصورت انسانوں کی صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور وہ معاشرے میں بہت پیچھے رہ جاتے ہیں۔ طارق مرزا ۱۹۶۲ء میں ساہیوال کے ایک محنت کش گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ہوش سنبھالا تو بڑے بھائی صداقت علی موتی کی طرح خود کو معذور پایا۔ معذوری اور نامساعد حالات کے باعث میٹرک کے بعد تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھا جاسکا۔ روزگار حیات چلانے کے لیے بڑے بھائی کے ساتھ دکان پر جانا شروع کر دیا۔ بعد ازاں کچھ عرصہ کپڑے سینے کا کام سیکھا۔ بالآخر دیرینہ دوست امتیاز کے کہنے پر فوٹو گرافی میں فنشنگ، ری چنگ اور کلرنگ کا کام سیکھا۔ اس زمانے میں بلیک اینڈ وائٹ فوٹو کو ہاتھوں سے کلر کیا جاتا تھا۔ امتیاز صاحب کی تکنیکی رہنمائی، شبانہ روز محنت اور دلی لگن سے آپ نے جلد ہی کام میں مہارت حاصل کر لی اور کمرشل بنیادوں پر کام شروع کر دیا۔ ابتداء میں تو سارا کام گھر پر ہی کرتے تھے، بعد میں لالہ اشفاق بیٹ نے سٹوڈیو بنایا تو ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو بے رنگ زندگی میں رنگ ہی رنگ نظر آنے لگے۔ بقول طارق مرزا مجھے میرے مخلص دوستوں نے قدم قدم پر جینے کا حوصلہ دیا۔ تصویریں کو کلر کرتے کرتے تصویر بنانے کا شوق پیدا ہوا تو بھائی صلاح الدین کی وساطت سے شہر کے معروف پینٹر عبدالستار کے ہاں حاضر ہوا۔ جہاں پہلے پہل انہوں نے میری رہنمائی فرمائی اور بعد ازاں فرحت شاہ کی رہنمائی میں تحریک پاکستان کی مشہور شخصیات کے پورٹریٹ بنائے تو انہیں اپنے باذوق احباب کی طرف سے غیر معمولی پذیرائی

حاصل ہوئی، یوں تو وقت کے ساتھ ساتھ بے شمار نامور آرٹسٹوں نے مختلف سٹائل میں کام کیا، مگر طارق مرزا کے کام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے فوٹو گرافک پیپر پر آئی رنگوں سے تصاویر بنا کر ایک نئے دلستان کی بنیاد رکھی۔ آئل پینٹ کی نسبت وائر کلر میں کام کرنا مشکل سمجھا جاتا ہے کیونکہ وائر کلر میں ایک بھی غلط ٹچ پوری تصویر کو خراب کر سکتا ہے اور سکارٹشٹ کی نسبت فوٹو گرافک پیپر پر اور بھی مشکل ترین کام ہے۔ سو طارق مرزا نے اپنی فنی مہارت سے اس میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ طارق مرزا کو پاکستان اور پاکستان سے متعلقہ شخصیات سے دلی محبت ہے اس لیے وہ ان کے پورٹریٹ بنا کر ایک قلبی سکون حاصل کرتے ہیں۔ انہیں پاکستان ٹیلی ویژن کے پروگرام نیلام گھر میں شرکت کا موقع ملا۔ بعد ازاں ۱۹۸۱ء ساہیوال میں منعقدہ معذوروں کے عالمی سال کی تقریب کے موقع پر طارق مرزا کے بنائے ہوئے قومی و بین الاقوامی شخصیات کے پورٹریٹ کی نمائش منعقد کی گئی، جسے شائقین نے بہت سراہا، یوں نمائش کے اختتام پر عالمی ادارہ یو این او کی طرف سے یونیسکو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۲ء میں آفتاب کاوش کے وسیلے سے معروف سکارل ڈاکٹر عبدالرزاق شاہد سے ملاقات ہوئی جو اس وقت پنجابی ادبی بورڈ کے سیکرٹری کی حیثیت سے الگ مقام رکھتے تھے۔ انہوں نے بے شمار تقاریب میں طارق مرزا کے بنائے ہوئے فنی پاروں کی رونمائی کرائی۔ ۱۹۸۲ء میں ہی جناح ہال ساہیوال میں سہ روزہ تصویریری نمائش کا اہتمام کیا گیا جسے اہل ذوق نے بے حد سراہا۔ انہی دنوں بی بی سی لندن کے عالمی مقابلہ مصوری میں حصہ لیا جس میں اول پوزیشن حاصل کر کے پاکستان کا نام روشن

کیا۔ آخر اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے انہوں نے اپنا فوٹو سٹوڈیو بنایا۔ جہاں ابتدا میں ارشد اور نصر اللہ نے معاون کے طور پر کام کیا۔ بعد ازاں رزاق شاہد کے چھوٹے بھائی جمیل ناصر نے شاگردی اختیار کی جو تا حال معاون دوست اور فوٹو گرافر کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ مخلص دوستوں کے تعاون اور مالی آسودگی نے شاندار تخلیقات کے مواقع فراہم کیے اور اس سفر مصوری میں بے شمار آرٹسٹوں کا کام دیکھنے کا موقع ملا۔ جن میں سرفہرست سعید اختر، اسلم کمال، آفتاب ظفر، شکیل فاروقی، زبیدہ آغا، اینا مولیکا احمد اور استاد اللہ بخش کے نام نمایاں ہیں۔ لندن میں مقیم شکیل قمر کے توسط سے طارق مرزا کے پورٹریٹ کی نمائش ہوئی۔ جہاں انہیں آرٹسٹ آف دی ایئر قرار دیا گیا۔ ۱۹۸۶ء میں پی ٹی وی پروگرام پنچند میں مدعو کیا گیا جہاں دلدار پرویز بھٹی (مرحوم) نے طارق مرزا کے کام پر روشنی ڈالی۔ ۱۹۹۱ء میں سابق پارلیمانی سیکرٹری مرحوم عبداللطیف مغل کے تعاون سے جناح ہال ساہیوال میں نمائش کا اہتمام کیا گیا۔ جہاں ان کے کام کے اعتراف میں تاج پوشی کا اعلان کیا گیا۔ اگلے سال ممتاز سیاسی، سماجی شخصیات کی موجودگی میں ۱۴ اگست قومی دن کے موقع پر طارق مرزا کو سونے کا تاج پہنایا گیا اور بہترین کارکردگی پر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ طارق مرزا نے نامور شخصیات کے پورٹریٹ کے ساتھ ساتھ مختلف کتب کے سرورق بھی تخلیق کیے، جن میں نمایاں نام حاجی بشیر احمد، گوہر ہوشیار پوری، رزاق شاہد، آفتاب کاوش، طالب جتوئی اور بابا اشفاق احمد، زاویہ پروگرام والے شامل ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں پاکستان کی گولڈن جوبلی کے موقع پر سچے موتی کے نمونے سے ایک بہت بڑی نمائش کا اہتمام کیا گیا۔

جس کا افتتاح سابق گورنر پنجاب میاں اظہر نے کیا۔ طارق مرزا کے بنائے ہوئے پورٹریٹ اکثر و بیشتر رسائل و جرائد اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں۔ ساہیوال کے اس پُر عزم نوجوان نے جہاں پورٹریٹ تخلیق کیے وہاں پنجابی دیہاتی کچھر اور صوفیائے کرام کی تصاویر بھی بنائیں۔ طارق مرزا نے آرٹ پیپر، سکارٹشٹ، فوٹو گرافی پیپر پر وائر کلر اور پنسل ورک میں فن پارے تخلیق کر کے شائقین کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا، البتہ وائر کلر میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ طارق مرزا نے حکومتی اداروں کے عدم تعاون اور صاحب اقتدار لوگوں کی بے حسی کی وجہ سے احتجاجاً ۲۰۰۴ء تک کی کسی بھی نمائش میں حصہ نہ لیا۔ بعد ازاں اپنے قدردانوں کے اصرار پر دیپالپور میں منعقدہ پنجاب لوک بولی میلہ میں صوفیائے کرام کے پورٹریٹ کی نمائش کا اہتمام کیا۔ جس میں کینیڈا، برطانیہ اور بھارت سے آنے والے مندوبین نے بے حد سراہا اور حوصلہ افزائی فرمائی۔ ۲۰۰۴ء میں ذاتی کاوشوں اور کوششوں سے ساہیوال میں آرٹ گیلری کی بنیاد رکھی۔ طارق مرزا جیسے عظیم فنکار نے جسمانی معذوری کے باوجود اپنا فنی سفر بنا کسی سیاسی بیسیاکیوں کے طے کیا اور خوبصورت تخلیقات پر بے پناہ عزت اور شہرت حاصل کی۔ آپ کی صلاحیتوں کا جائزہ لیا جائے تو عظیم فنکار جسمانی معذوری کے باوجود اپنے فن کی چٹائی سے ملک کے نامور آرٹسٹوں میں نمایاں نظر آتا ہے۔ ایسے پر عزم و عظیم فنکاروں کی حوصلہ افزائی معاشرے میں طبقاتی تقسیم کے خلاف جہاد اکبر ہوگا۔ حکومت کو چاہیے کہ ملک و قوم کی تہذیب و تمدن اور ورثہ کو محفوظ رکھنے کے لیے ایسے فنکاروں کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کرنی چاہیے تاکہ آنے والی نسل کے لیے تاریخ محفوظ ہو سکے۔ (سلیم ناز)



رضوان علی شاہ

امریکا سے آسٹریلیا پہنچنے والی ایک نادار اور دیہاتی کا تذکرہ
ایک ”پوسٹم“ اس کی وجہ بنا تھا اور ایک سیاح اس کا نشانہ

شرارتاً با عادتاً

کوئی یقین کرنے پر تیار نہ تھا کہ چوہے جیسا دیکھنے والے جانور
بھی حیاتی دہشت گردی پھیلانے کا باعث بن سکتا ہے

اپریل ۲۰۱۱ء کی بات ہے۔
۳۵ سالہ کیتھرین چک سیرتفریح
کی غرض سے آسٹریلیوی ریاست،
تسمانیہ کے پہاڑی مقام پر پہنچی۔ وہ وہاں ساتھیوں کے
ہمراہ پہاڑوں پر چڑھی اور خوبصورت فطری مناظر سے

لطف اندوز ہوئی۔ کیتھرین ایک ہسپتال میں بحیثیت
ٹیکنیشن کام کرتی تھی اور اس نے ۱۳ دن بڑے مزے
سے گزارے۔

۱۵/دوبی دن وہ واپس تسمانیہ کے صدر مقام،
ہویرٹ کی سمت چل پڑے جہاں ان کے گھر واقع

تھے۔ کیتھرین ہی چلا رہی تھی۔ ایک قصبہ، کونز ٹاؤن
سے لڑنے ہی کیتھرین کو سڑک پر کوئی بڑی سی شے بڑی نظر
آئی۔ اس نے فوراً بریک لگا دی پھر کھڑکی سے جھانک کر
دیکھا تو اسے چوہے نما جانور، پوسٹم بیٹھا نظر آیا۔ یہ حیوان
تسمانیہ کے پہاڑی علاقوں میں عام ملتا ہے۔

کیتھرین کار سے باہر نکلے، پوسٹم کو آرام سے ہاتھوں
میں اٹھا اور اسے سڑک کنارے رکھ دیا۔ جب وہ پوسٹم کو
دیکھ رہی تھی، تو اچانک اس نے خاتون کی انگلیت شہادت
برکاتا اور پھر آٹافانا قرہی بھائیوں میں غائب ہو گیا۔

”سچارا پوسٹم! یقیناً یہ مجھ سے خوفزدہ تھا۔“ کیتھرین
نے سوچا اور واپس آگئی۔ کار میں ابتدائی طبی امداد کا سارا
مہمان موجود تھا۔ اس نے انگلی پانی سے دھوئی، جراثیم کش
لگا دی، نئی باندھی اور پھر سفر کا آغاز ہو گیا۔ وہ ساتھیوں
سے باتیں کرتی منزل پر پہنچ گئی۔ تقریح خاصی ہو چکی، اب
اکام بر لگنا چاہتی تھی۔

لیکن اگلے دن کیتھرین کو تیز بخار چڑھ گیا۔ ساتھ ہی
ہم غیر ارادی طور پر کاٹنے لگا۔ شام تک اس کی کہنی سوج
گئی اور پھتوں گلوں کے لمفی غدود (Lymph Glands) کو
نشانہ بنانے لگا۔

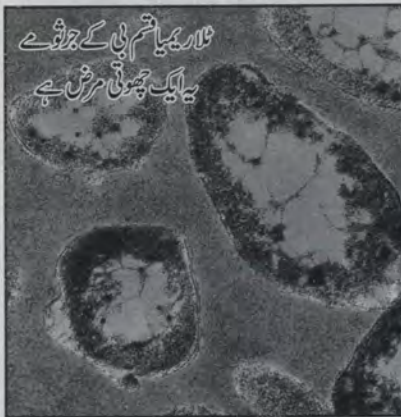
دوسرے دن کیتھرین ڈاکٹر کے پاس پہنچی۔ تب
تک شدید جسمانی درد نے اسے بے حال کر دیا تھا۔
ڈاکٹر نے اسے ضد حیات (ایسٹی بائیوٹک) ادویہ دی اور
گھر بھیج دیا۔ تب پوسٹم کے کانے کا نشان ٹوٹ گیا،
لیکن سیدھے بازو کی زیر جلد واقع لمفی گھنڈیوں
(Nodes) میں دم بڑھ رہا تھا۔ کہنی پر تو ایک پھوڑا
نمودار ہو گیا جس میں پس پڑنے لگی۔

کیتھرین کے ڈاکٹر نے زخم صاف کیے اور مزید
علاقہ در ضد حیات ادویہ دیں لیکن وہ تندرست نہ ہوئی۔
ڈاکٹر ایک ہفتے تک پریشانی کے عالم میں اس کا علاج کرتا
لیکن بیماری معطل نہ کر سکا۔ کیتھرین ہر دوسرے دن
اس کے پاس آتی کیونکہ کہنی کے پھوڑے سے پس مسلسل
نکلتی رہتی تھی۔

آخر کار تھک ہار کر ڈاکٹر نے ماہرین امراض چھوت
سے رابطہ کیا، تاہم ان سے بھی اسے کوئی مدد نہ مل سکی۔
جب پانی سر سے پار ہو گیا تو کیتھرین ہویرٹ کے سب
سے بڑے ہسپتال، رائل ہویرٹ میں داخل ہو گئی۔ تب
تک پوسٹم والے واقعے کو جنم لیے ۴۷ دن بیت چکے تھے۔
کیتھرین کو فوراً ڈریس لگائی گئیں۔ نیز ضد حیات
ادویہ کے ٹیکے لگائے گئے۔ طویل بیماری نے اسے پریشان
اور خوفزدہ کر دیا تھا۔ اسے امید تھی کہ ہسپتال میں تجربے کار
ڈاکٹر کی نگرانی میں صحت یاب ہو جائے گی مگر کیتھرین
کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

نمونے کی امریکا روانگی

جین بینک (Gen Bank) امریکی شہر پیٹھیڈا میں
واقع نیشنل سینٹر فار بائیوٹیکنالوجی انفارمیشن (NCBI) کا
اہم حصہ ہے۔ اس جین بینک میں دینا بھر میں پائی جانے
والی ڈھائی لاکھ نامیات (زندہ اشیاء) کے ڈی این اے یا
جینیاتی سلسلے (نمونے) موجود ہیں۔ اس زبردست
ذخیرے کا فائدہ یہ ہے کہ دنیا بھر میں جب کوئی ڈاکٹر کسی
نامعلوم جراثیم یا وائرس وغیرہ کا ڈی این اے سلسلہ
حاصل کرے تو وہ جین بینک بھجوا کر اس کی شناخت کرتا
ہے۔ اہم بات یہ کہ تمام ترقی یافتہ ممالک کے ڈاکٹر



نارسیا تسمانی کے جراثیم
یہ ایک چھوٹی مرض ہے

بذریعہ انٹرنیٹ چین بینک میں محفوظ ڈی این اے سلسلوں تک رسائی رکھتے ہیں۔

اب پروفیسر ویٹانی نے ساتھیوں کے ساتھ کیتھرن کے بدن سے حاصل کردہ ڈی این اے سلسلے کو بذریعہ نیٹ چین بینک میں محفوظ سلسلوں سے ملایا۔ بذریعہ تلاش وہ سلسلہ بارہ نامیات کے سلسلوں سے میل کھا گیا۔ ان میں سرفہرست ایسے جرثومے کا سلسلہ تھا جو نایاب مرض ملاریمیا (Tularaemia) پیدا کرتا ہے۔

ملاریمیا کی کئی اقسام ہیں۔ ایک قسم تو اتنی شدید بیماری پیدا کرتی ہے کہ ماہرین اسے ”حیاتیاتی اسلحے“ میں شمار کرتے ہیں۔ کیتھرن اس بیماری کی ”قسم بی“ کا نشانہ بنی۔ یہ نایاب بیماری یورپ اور شمالی امریکا میں سامنے آئی تھی جہاں اسے ”خرگوش بخار“ (Rabbit Fever) کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر اور سائنس دان مستند نتیجہ حاصل کرنے کی خاطر

عمل تشخیص کو معمولی نہ سمجھیے

جب ہم بیمار ہوں تو ہمیں امید ہوتی ہے کہ ڈاکٹر جلد ہی مرض سمجھ کر بذریعہ دوا ہم کو تندرست کر دے گا۔ کبھی کبھی ہمیں ماہر امراض خصوصی سے بھی ملنا پڑتا ہے۔ لیکن یہ بھی خاص بات نہیں کیونکہ ہمیں کامیاب علاج کی توقع ہوتی ہے۔ لیکن بعض اوقات ہماری ساری امیدیں خاک میں بھی مل جاتی ہیں۔

دراصل سچ یہ ہے کہ کسی مرض کو صحیح طرح شناخت کرنے میں کئی ماہ بلکہ کبھی کبھی تو سال لگ جاتے ہیں۔ اس ضمن میں رائل ہوبرٹ ہسپتال میں شعبہ خرد حیاتیات و چھوٹی امراض کے ڈاکٹر الیسیئر میگور کا کہنا ہے ”مرض شناخت“ جائے تب بھی عموماً ڈاکٹر طبی کتب کی مشاورت نہیں اپنے تجربے سے کام لیتے ہوئے علاج کرتا ہے۔“ یہ ڈاکٹر ایسی ہی ہے جو کیتھرن کے علاج پر مامور ہوا۔

جب ڈاکٹر کسی بیماری کی تشخیص نہ کر سکیں تو وہ تمام امکانات کا جائزہ لیتے ہیں۔ سب سے پہلے وہ دیکھتے ہیں کہ بیماری نے کیونکر جنم لیا اور اس کی علامات کیا ہیں؟ چنانچہ کیتھرن کے سلسلے میں بھی یہی طریق کار اپنایا گیا۔

ڈاکٹروں نے پہلے اس حقیقت کو مد نظر رکھا کہ جب ایک حیوان نے اسے کاٹ کھایا تو کیتھرن بیمار پڑ گئی۔ چنانچہ انھیں یقین ہو گیا کہ یہ بیماری کسی جرثومے کے چھوت سے تعلق رکھتی ہے۔ لہذا ڈاکٹر الیسیئر کی ٹیم نے مریضہ کی کھانسی کے نمونے لیے اور انھیں بذریعہ خوردبین دیکھا۔ لیکن ان میں کسی قسم کے جراثیم نظر نہیں آئے۔

آخر ڈاکٹر الیسیئر نے بافتیں مزید تحقیق کے لیے سڈنی میں واقع سینٹر فار انفیکشن ویزیز اینڈ مائیکرو بایولوجی

اس دوران ڈاکٹر الیسیئر اور ان کی ٹیم نے یورپی امریکی طبی کتب کا مطالعہ کیا تاکہ جان سکیں مرض سے کونسا جراثیم متعلق ہے۔ معلوم ہوا کہ ملاریمیا عموماً جانوروں کے ٹیکس (Ticks) سے انسان کو چمٹتا ہے۔

کالے یا چمچڑیوں کے ایک دو ہفتے بعد بیمار پڑ جاتے ہیں۔ تاہم بیماری کے جراثیم موزوں ماحول میں کئی ہفتے زندہ رہ سکتے ہیں۔

بیماری کی سرآتی علامات یہ ہیں: سر درد، سردی لگنا، متلی آنا، تھکاوٹ، تیز بخار، بدن سو جانا اور شدید تھکن۔

پچھونڈیوں (Fungi) کی تحقیق ہوتی ہے۔

چنانچہ بافتوں کو ایک خاص ڈی این اے ٹیسٹ، پی سی آر (پولی میری چین ری ایکشن) سے گزرا گیا۔ اس میں ان جینز (Genes) پر توجہ مرکوز ہوتی ہے جو بیشتر جراثیم میں پائے جاتے ہیں۔ اس ٹیسٹ کے ذریعے کیتھرن کے ڈی این اے کا ایک مکمل سلسلہ (Sequence) حاصل کر لیا گیا۔ اب ماہرین نے یہ جائزہ لینا تھا کہ اس ڈی این اے سلسلے کے جینز کس جرثومے یا وائرس کے جینیاتی مادے سے مطابقت و مماثلت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹروں نے اس دوران کیتھرن کو گھر بچھو دیا اور اسے انتظار کرنے کا کہا۔ انھیں یقین تھا وہ کسی چھوٹی مرض میں گرفتار نہیں کہ دوسرے بھی مبتلا ہو بلا ہو جائیں۔ تاہم کیتھرن کی حالت بدستور خراب رہی۔ جسم میں شدید ایشیون، ہلکا دھبہ حرارت اور رات کو تشنگی نما دورے۔ وہ پریشان ہو کر بار بار سوچتی ”کیا کوئی ڈاکٹر یہ دریافت نہیں کر سکتا کہ میں کس مرض کا نشانہ بنی ہوں؟“

ادویہ دی گئیں جو بیماری کے جراثیم مار لیں۔ چنانچہ دو ہفتوں میں کیتھرن تندرست ہو کر گھر واپس لوٹ گئی۔

اگر دی آسٹریلیو حکمہ صحت کے کارپردازان ایک مشکل میں پڑ گئے۔ ان کے سامنے چیلنج یہ تھا کہ ملاریمیا کے متعلق عوام کو کس طرح بتایا جائے کہ ان میں افزائش اور بے چینی نہ پھیلے۔ آخر یہ انتہائی نایاب مرض کا معاملہ تھا۔ چونکہ یہ آسٹریلیا میں پہلا کیس تھا لہذا حکمہ صحت نے اسے مشکوک طور پر رکھا۔

عالمی حالات کے تناظر میں پہلے اسے حیاتی دہشت گردی کا حملہ سمجھا گیا۔ جب یہ معاملہ غیر اغلب قرار پایا تو آسٹریلیو حکمہ صحت حرکت میں آ گیا۔ جو لوگ جنگل کے قریب یا جانوروں کے ساتھ مقیم تھے، انھیں بیماری کے متعلق خبردار کر دیا گیا۔

چند ماہ بعد رائل ہوبرٹ ہسپتال میں ملاریمیا قسم بی کا ایک اور کیس سامنے آیا۔ دلچسپ بات یہ کہ اس نئے مریض کو بھی اسی سڑک پر ایک پونم نے کاٹا۔ تاہم یہ

دیں۔ یہ جدید ترین آلات سے لیس آسٹریلیا کا واحد تحقیقی مرکز ہے جہاں نایاب اور غیر معروف جراثیم، وائرسوں اور

چنانچہ بافتوں کو ایک خاص ڈی این اے ٹیسٹ، پی سی آر (پولی میری چین ری ایکشن) سے گزرا گیا۔ اس میں ان جینز (Genes) پر توجہ مرکوز ہوتی ہے جو بیشتر جراثیم میں پائے جاتے ہیں۔ اس ٹیسٹ کے ذریعے کیتھرن کے ڈی این اے کا ایک مکمل سلسلہ (Sequence) حاصل کر لیا گیا۔ اب ماہرین نے یہ جائزہ لینا تھا کہ اس ڈی این اے سلسلے کے جینز کس جرثومے یا وائرس کے جینیاتی مادے سے مطابقت و مماثلت رکھتے ہیں۔

ڈاکٹروں نے اس دوران کیتھرن کو گھر بچھو دیا اور اسے انتظار کرنے کا کہا۔ انھیں یقین تھا وہ کسی چھوٹی مرض میں گرفتار نہیں کہ دوسرے بھی مبتلا ہو بلا ہو جائیں۔ تاہم کیتھرن کی حالت بدستور خراب رہی۔ جسم میں شدید ایشیون، ہلکا دھبہ حرارت اور رات کو تشنگی نما دورے۔ وہ پریشان ہو کر بار بار سوچتی ”کیا کوئی ڈاکٹر یہ دریافت نہیں کر سکتا کہ میں کس مرض کا نشانہ بنی ہوں؟“

انوکھی سیر

جہاں ہوتے تھے بے خبری کے اندھیرے وہیں گویا ہوائے
آگیا دیکھیے! آپ اس سفر پر ایک بار روانہ ہو گئے تو پھر کہیں گے نہیں

قاضی مظہر الدین طارق

خود ناواقف تھا۔ یہ جہاز ہم سب کو لے کر فضاء میں بلند
ہوا، جیسے جیسے بلند ہوتا گیا چھوٹا ہوتا گیا یہاں تک کہ ہم
سمیت ہمارا یہ جہاز گلوکوز کے ایک مائیکروپل کے برابر ہو گیا۔
ہم منزل کی طرف رواں دواں تھے..... ہم اپنے شہر کے
ایک گھر میں داخل ہوئے، کمروں میں چکر لگانے لگے، ہم نے
دیکھا کہ ایک کمرے میں کچھ لوگ کھانا کھا رہے ہیں..... آہ!
کھانا، یہ دیکھ کر ہی ہمارے منہ میں پانی بھر آیا، خوشبو بھی آ رہی
تھی، جانے کیا کیا دسترخوان پر سجا ہوا تھا، ایسے میں تو منہ میں
پانی آتا ہی ہے، مگر اس وقت ہم اتنے چھوٹے ہیں کہ یہ سب
کچھ کھا نہیں سکتے..... ہم دسترخوان پر منڈلانے لگے..... آخر
ہم نے ایک بیچ کی پلیٹ میں اپنے جہاز کو اتار لیا۔

ہم انتظار کرنے لگے..... اب کیا ہوگا..... ایک ایک لمحہ
ہم کو پہاڑ لگ رہا تھا..... آخر طویل انتظار کے بعد اس بچے
نے ایک نوالے کے ساتھ ہمارے جہاز کو بھی اٹھا لیا اور منہ
میں رکھ لیا..... اُف! کتنا پرخطر مرحلہ تھا، خوفناک واقعات نے
نوالے کو چھاننا شروع کر دیا، زبان اس کو الٹ پلٹ کرتی جا رہی

کلاس میں داخل ہوا، بچوں پر ایک
نظر ڈالتے ہوئے ”السلام
علیکم“ کہا، سب بچوں نے مل کر
ایک آواز میں ”علیکم السلام“ کہا۔ بچے میری طرف غور
سے دیکھنے لگے، میں اس کلاس میں پہلی دفعہ داخل ہوا تھا۔
میں نے کہا: ”آپ کی کلاس کے لیے میں حیاتیات
کا پائلوٹی کا دنیا بھر ہوں، آج پہلا دن ہے..... مجھے لگ
رہا ہے کہ پڑھائی کا موڈ نہیں ہے..... کیا خیال ہے
بھائی ایک طرف..... چلیں آج سیر کو چلتے ہیں۔“

میں نے بورڈ پر ایک خلائی جہاز کی تصویر بنائی اور
کہا: ”آؤ بچو! آؤ اس جہاز میں سوار ہو کر سیر کو چلتے ہیں،
ہم انکی اونچی جگہوں کی سیر کریں گے جہاں کی سیر اب
تم کیلئے نہ کی ہوگی۔“

ہم اپنے خیالوں میں غم تصور ہی تصور میں اس جہاز
کا سیر ہو گئے۔ ہم اپنے تصورات کے سہارے مگر ایک حقیقی
نئی طرف جا رہے تھے، اپنے اندر کی دنیا جس سے انسان

میں



پروفیسر ویٹانی اور ان کی ٹیم جس
نے ڈی این اے کا سلسلہ تیار کیا

تو اس کا فوری علاج کیا جائے۔ ادھر آسٹریلیوی ڈاکٹر اس
امر پر حیران پریشان ہیں کہ ٹلاریمیا قسم کی ایک دم امریکا
سے آسٹریلیا کیسے آ پہنچا؟ اور پھر جیسے اچانک آیا تھا،
ویسے ہی غائب بھی ہو گیا۔

کیتھرین کو مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں خاصا
عرصہ لگا وہ کہتی ہے ”بھی بھئی میں آج بھی کمزوری محسوس
کرتی ہوں۔ دراصل انتہائی طاقتور ضد حیاتی ادویہ نے میرا
اندرونی نظام تباہ کر ڈالا اور وہ اب بھی عمل تعمیر نو سے گزر
رہا ہے۔“ اس کا مزید کہنا ہے:

”گو معالجین نے میرا مرض دریافت کرنے میں خاصا
عرصہ لگایا، لیکن مجھے خوشی ہے کہ آخر کار وہ اس کا قلع قمع
کرنے میں کامیاب رہے۔ یوں معالج کو بیماری پر
حاصل ہو گئی۔ مگر اس بات پر پردہ ہی پڑا رہا کہ پوسم نے
مجھے شرارتا کاٹا تھا یا عادتاً۔“

واقعہ کیتھرین والی جگہ سے خاصی دور پیش آیا لہذا یہ لازماً
دوسرا پوسم تھا۔

اب ٹی وی، ریڈیو، اخبارات اور نیٹ کے ذریعے
وسیع پیمانے پر خبر دی گئی کہ وہ جنگلی علاقوں میں دیکھ بھال
کے سفر کریں اور کوئی پوسم یا دوسرا جانور انھیں کاٹ لے تو
فوراً مسترد ڈاکٹر سے رجوع کریں۔

بعد ازاں تسمانوی محکمہ جنگلات نے سارے جنگلی
علاقوں کی پڑتال کی۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کہیں
جانوروں کی غیر معمولی تعداد تو جان سے نہیں گزر گئی؟
لیکن انھیں کہیں جانوروں کی زیادہ لاشیں نہیں ملیں۔ مزید
برآں پوسم کی لاشوں پر بھی تجربات ہوئے۔ خوش خبری یہ
ہے کہ اس سال ٹلاریمیا قسم کی کا کوئی کیس تسمانیہ میں
سائنس نہیں آیا۔ تاہم ریاستی محکمہ صحت کے اہل کار پوری
طرح مستعد اور تیار ہیں کہ کوئی مریض اچانک عیاں ہوا

تھی اور یہ بھی چیک کرتی جاری تھی کہ کوئی سخت چیز چب کر باریک ہونے سے نہ رہ جائے یا کوئی اور سخت و نامطلوب شے پیٹ میں نہ چلی جائے۔ ہم بڑی مشکل سے اپنے جہاز کو ادھر ادھر کر کے ان دونوں خوفناک بلاؤں سے اپنے آپ کو بچا رہے تھے..... ویسے تو یہ ہمارے لیے اتنا بڑا مسئلہ نہ تھا کیونکہ ہم اس چبائے ہوئے کھانے سے بہت چھوٹے تھے..... اس نوالے میں منہ کا پانی بھی شامل ہو رہا تھا جو اس کو نرم کر رہا تھا، زبان اس کو گھما گھما کر ایک گولے کی شکل دے رہی تھی تاکہ اس حلق سے اترنا آسان ہو جائے۔

عمر نے پوچھا ”سرا! یہ پانی کہاں سے آ رہا ہے؟“ میں نے بتایا کہ یہ ہمارا ایک خادم غدوہ ’سلائیوری گلیڈز‘ بھیج رہا ہے اس پانی کو ’سلائیو‘ کہتے ہیں۔ احمد نے پوچھا ”سرا! عجیب سا نام ہے، یہ کیا کام کرتا ہے؟“ میں نے کہا ذرا صبر کرو سب معلوم ہو جائے گا۔ فاروق دور خلاؤں میں گھور رہا تھا، منہ ہی منہ میں بڑبڑایا ”کون ہے جس نے اس پانی کا انتظام کیا ہے اور کہاں سے کتنا بھیج رہا ہے؟“..... یہ غدوہ زبان کے پیچھے ہیں، دیکھ بھی نہیں سکتے، مگر انکھیں دیکھتی ہیں، ناک خوشبو سنھتی ہیں، زبان کو اس کی لذت محسوس ہوتی ہے، یہ سب ’نرؤں‘ سسٹم کے ذریعہ دماغ کو پیغام دے رہے ہیں..... پھر یہ دماغ ’سلائیوری غدوہ‘ کو حکم دے رہا ہے کہ ایک لعاب بنا کر منہ میں روانہ کرو۔ عمر پھر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے کہا ”کیا تم کو چھنا چاہتے ہو کہ اس ’سلائیو‘ میں کیا ہے؟ عمر نے کہا ”جی سرا!“ یہ جو خام ’سلائیوری گلیڈز‘ ہے یہ اپنے لعاب کے ساتھ اپنا ایک عامل ’انالیٹیز‘ بھیجتا ہے جو کچھ ہم کھاتے ہیں اس کو خون میں جانے کے لئے باریک ترین بنیادی اجزاء میں تقسیم ہونا ضروری ہوتا ہے، یہ انزائم ’انالیٹیز‘ منہ ہی سے یہ کام شروع کر دیتا ہے یہ ’کاربوائیڈز‘ کو کیوبائی عمل سے توڑنے کا کام کرتا ہے۔ گلوکوز اور ذرہ کوڑا واحد مایکریول سے بنے ہوئے مرکب ہیں جبکہ شکر اور نشاستے ایک سے زیادہ سالموں سے ملکر بنتے ہیں۔ ۲۱ سالموں سے بنی ہوئی شکر خون میں داخل نہیں ہو سکتی ’انالیٹیز‘ اس کو سٹگل مایکریول میں تقسیم کر کے گلوکوز میں تبدیل کرتی ہے تاکہ یہ خون میں داخل ہو سکے اور خون ان کو ہر خلیے ’سیل‘ تک

پہنچائے اس طرح سیل کو انرجی حاصل ہوتی ہے اور ان غلیظ سے بنے ہوئے اعضاء کو پھول ملتا ہے جس سے یہ اپنے کام سرانجام دیتے ہیں۔ اس عمل کو ’انالیٹیزیشن‘ کہتے ہیں۔ مایکریول یہ بھی کام ہے کہ یہ نشاستے ’اسٹارچ‘ کے مایکریولز کو تقسیم کر کے ’مالٹوز‘ میں تبدیل کرتا ہے۔

اسی لعاب نے نوالے کو گولا بنا دیا اور بچے نے ہم سیرت اس کو اپنے حلق کی نالی میں دھکا دے دیا، اس نالی میں ’مرز‘ کے ’مسلز‘ ہیں ایک سریکولر مسلز اور دوسرے لائنگٹیٹیوڈ مسلز دونوں ملکر نوالے کو معدے کی طرف دھکیل رہے ہیں۔ اس نالی میں ’پنٹھیلیٹل سیلز‘ بھی ہماری خدمت پر مامور نظر آتے ہیں۔ اس سے بھی ایک لعاب ’میوکس‘ آ رہا ہے جو ہمارے کھانے کی نالی ’ایسوفیگس‘ بلکہ پوری ’گٹ‘ کو صاف اور چمک رکھنے کا کام سرانجام دے رہا ہے تاکہ غذا آسانی سے ’گٹ‘ میں حرکت کر سکے، یہاں ’ایسوفیگس‘ میں میکائیٹا کی کیوبائی تجربہ کار کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔

اب ہم معدے میں پہنچے تو دیکھا کہ ہمارے ساتھ پانی ’مرزلز‘ (نملکت)، حیاتین کے علاوہ مختلف قسم کے کاربوائیڈز (نشاستے)، لپڈز (تیل چربی) اور پروٹین (لحمیات) بھی موجود ہیں، اب تک صرف ایک عامل ’انالیٹیز‘ نے نشاستوں کے ایک چھوٹے سے حصے کو کیوبائی عمل سے تقسیم کیا تھا، باقی غذا تو ایسے ہی معدے میں پہنچ گئی ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ معدہ پھر دونوں کام کر رہا ہے، غذا ’میکٹیکل طریقہ‘ سے مسل رہا ہے اور گرائینڈز کی طرح گرائینڈز اور کس بھی کر رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں کیوبائی عمل بھی جاری ہے جو مختلف غذاؤں کو مختلف انزائمز کی مدد سے تقسیم در تقسیم کر رہا ہے تاکہ وہ چھوٹے سے چھوٹے بنیادی اجزاء میں تبدیل ہو کر خون میں داخل ہونے کے قابل ہو جائیں۔ ہمارا یہاں پر کئی گھنٹے قیام رہنا ہے۔ یہاں ’پروٹین‘ کی پہلے مرحلے کی کیوبائی تقسیم عمل میں آتی ہے۔

معدے میں سب سے پہلے ہم کو ’تیزابیت‘ سے واقف پڑا، معدہ اپنی اندرونی دیوار سے ہائیڈروکلورک ایسڈ بنا کر بھیج رہا ہے۔ فاروق پھر خلاؤں میں گھورتا ہوا بڑبڑاتا

”معدے کو کیسے خبر کہ اب غذا کو ہم کرنے کیلئے تیزابیت کی ضرورت ہے، بہر حال اس نے معدے کے ماحول کو تیزاب زدہ (ایسٹک) کر دیا۔ اس تیزابیت کی وجہ سے یہاں اسٹریچیم کا خاتمہ ہو گیا اور انسان فوڈ پوائیزنگ سے قائل کیا۔“

معدہ اب بھیج رہا ہے ’پروٹینز‘ قسم کے انزائمز جن میں سے ایک کا نام ’پپسین‘ ہے، اس کا کام کرنے کیلئے ’ایسٹک‘ ماحول کی ضرورت ہے اسی لئے یہ ماحول ابھی بنایا گیا ہے۔ علی بہت دیر سے خاموش بیٹھا تھا پوچھا ”سرا! یہ عامل ’پپسین‘ کیا کرتا ہے؟“..... ’پپسین‘ ’پروٹین‘ کو کیوبائی طریقہ سے تقسیم کر کے ’پپٹائیڈز‘ میں تبدیل کر رہا ہے تاکہ آگے جا کر مزید تقسیم آسان ہو جائے۔

معدہ ہم کو اس زور سے گھما رہا ہے کہ بعض بچوں کو چکر آنے لگے۔ عمر پریشانی کے عالم میں بولا، ”یہ معدہ اپنا دروازہ کیوں نہیں کھول رہا ہے..... تاکہ ہم جلدی سے آگے برویں؟“ میں نے کہا یہاں صبر کرنا ضروری ہے ورنہ جو ’پروٹینز‘ ’پپٹائیڈز‘ بننے رہ گئے وہ بے کار ہو جائیں گے۔ یہ جو مسلو ہیں یا کیوکورک اسٹنڈر مسلو اس نے معدے کے منہ پر تالا لگا رکھا ہے۔ اس کو جب تک حکم نہ ملے یہ دروازہ نہیں کھولتا، فاروق پھر گویا ہوا ”ان مسلو کو کون اور کب در کھولے گا حکم دیا؟“ کہا جاتا ہے کہ معدے میں دن کوڑو تیزور انزائمز ہیں جو پہلے تو یہ دیکھتے ہیں کہ پیٹ بھرا کہ نہیں بھرا، پھر یہ دیکھتے ہیں کہ سب ’پروٹینز‘ ’پپٹائیڈز‘ بن گئے کہ نہیں، پھر یہ دماغ کو ان کاموں کی تکمیل کی اطلاع دیتے ہیں۔ تب ہمارا دماغ ہے جو ’اسٹنڈر مسلو‘ کو تالا کھولنے کی اجازت دیتا ہے۔ احمد بولا ”سرا! ہم کو تو پتا ہی نہیں چلتا کہ دماغ نے کوئی ایسا آؤر دیا اور کب دیا ہے؟“ میں نے کہا ہاں! ہم کیا جانتے ہمارے اندر کیا کیا ہو رہا ہے اور یہ سب کون کر رہا ہے؟ کوئی تو ضرور ہے جس کے حکم سے یہ سب کام ہو رہے ہیں، کسی نے تو ان سب کو سکھایا ہے کہ کس نے کب کیا کرتا ہے۔

خدا خدا کر کے معدے کا در کھلا ہم کو تو اس کو کھولنے کا

کوئی اختیار نہ تھا، ہم چھوٹی آنت کے پہلے حصے ’ڈیوڈینیم‘ میں داخل ہو گئے۔ علی بولا ”ارے! یہاں کا تو ماحول ہی مختلف ہے، یہاں تیز حرکت کے مقابلے میں کتنا سکون ہے۔“ میں نے کہا یہاں بہت سے ’ڈیوڈینیم‘ انزائمز شامل ہو رہے ہیں اس نیم، ضخیم سی لیکیڈ غذا کو ’چائیم‘ کہتے ہیں، پروٹینز کو گلانے والے انزائمز کو ’پروٹیزرز‘ کہتے ہیں۔ معدے میں اس کی ایک قسم ’پپسین‘ شامل ہو چکی ہے، دیکھو یہاں ’ڈیوڈینیم‘ میں دوسرا پروٹیزر، انزائم ’ٹرائپسین‘ شامل ہو رہا ہے۔ عمر نے سوال کیا ”سرا! یہ کہاں سے آ رہا ہے؟“ ہمارا ایک خادم لہلہ ہونٹنری اس اس عامل کو بنا کر ایک نالی (ڈکٹ) کے ذریعہ یہاں بھیج رہا ہے..... یہی خادم ہونٹنری اس وہی انزائم ’انالیٹیز‘ بھی دوبارہ بنا کر بھیج رہا ہے جو اس سے پہلے ’سلائیوری گلیڈز‘ نے بنا کر منہ میں جاری کیا تھا، اس عامل انزائم کا کام یہ ہے کہ یہ اسٹارچ کو ’مالٹوز‘ میں تبدیل کر رہا ہے۔ یہاں ایک اور خادم جگر (یور) بھی ایک کام کر رہا ہے کہ وہ ایک جوس ’بائیل‘ بنا کر بھیج رہا ہے۔ یہ ایک ہرے رنگ کا جوس ہے جو جگر پہلے پتے (گالیلڈز) میں جمع کرتا رہتا ہے جیسے ہی لپڈ (تیل چکنائی) والی غذا یہاں پہنچتی ہے اور چھٹی پہنچتی ہے اس کے مطابق جگر اس جوس ’بائیل‘ کو غذا میں شامل کرتا جاتا ہے۔ بائیل میں کوئی انزائمز نہیں ہوتے مگر یہ ایک اہم کام کرتا ہے کہ تیل اور چکنائی کو چھوٹے چھوٹے اجزاء میں تقسیم کرتا ہے تاکہ یہ پانی میں مل جائے اور انزائم اس پر آسانی سے عمل کر سکیں۔

خادم لہلہ (ہونٹنری اس) ایک اور عامل ’لی پیپسیر‘ تیار کرتا ہے، یہ ’لی پیپسیر‘ کی ایک قسم ہے یہ ’لیپیڈز‘ (تیل اور چکنائی) کی کیوبائی تقسیم کر کے ’گلائیسیرول‘ اور ’فیشی ایسڈز‘ میں تبدیل کرتا ہے یہ فائینل تقسیم ہے اس سے یہ خون میں داخل ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔ چھوٹی آنت کی دیوار سے ایک اور انزائم ’پپسین‘ اور ’ڈیسیز‘ آ رہا ہے جس کا کام یہ ہے کہ جو ’پپسین‘ اور ’ڈیسیز‘ نے پروٹینز کو ’پپٹائیڈز‘ میں تبدیل کیا ہے، اس کو مزید تقسیم کر کے ’امینو ایسڈز‘ میں تبدیل کر دے، یہ پروٹین کی

مقررہ قصہ

ایک سر بین کہانی دو بہادر آدمیوں کا قصہ، وہ دشمنی کے آداب سے اچھی طرح واقف تھے

سویتوزاز کوروچ
خالد بن اسلام

فائل تقسیم ہے اب یہ خون میں داخل ہونے کے لائق ہو گیا۔ اسی جگہ سے ایک اور انزائم 'ہائیز' بھی چھوٹی آنت کی دیواروں سے آ رہا ہے اور یہ آخری مرتبہ مائٹو کو 'گلوکوز' میں تبدیل کر رہا ہے۔ جگر اور لیلے سے جو 'بوسس' آ رہے ہیں ان کی خاص بات یہ ہے کہ یہ انکلائن ہیں۔ معدے سے آنے والا 'چائیم' لیسٹیک ہے اس کو یہ انکلائن جو سوسو معتدل (نیوٹرلائز) کر رہے ہیں تاکہ ایسے بہت سے انزائم کام کر سکیں جو نیوٹرل ماحول میں ہی کام کر سکتے ہیں۔

اب ہم چھوٹی آنت کے آخری حصہ 'ہیلیم' میں داخل ہو رہے ہیں، ہم اس جگہ اتنی آہستہ حرکت کر رہے ہیں کہ بچے بھی پور ہو رہے ہیں، یہاں بھی مزید مختلف قسم کے انزائم مسلسل شامل ہو رہے ہیں اور بہت سارے کام کر رہے ہیں تو ظاہر ہے اس میں وقت بھی زیادہ صرف ہو رہا ہے، 'ہیلیم' کا ضروری کام یہ یقین کر لینا ہے کہ سب غذا تقسیم در تقسیم ہو کر خون میں جانے کے قابل ہوئی کہ نہیں۔

'ہیلیم' میں ایک آخری اور اہم کام یہ بھی شروع ہو چکا ہے کہ جو غذا خون میں جانے کے قابل ہو چکی ہے اس کو جذب کر کے خون میں داخل کرانا، اس کام کو کرنے کیلئے 'ہیلیم' کو بہترین ساخت دی گئی ہے، ایک تو آنتیں بہت لمبی ہیں۔ اور 'ہیلیم' کی اندرونی دیوار میں سلوس (فولڈز) اور پروجکشنز ہیں اس سے جاذب سطح بڑھ جاتی ہے، غذا خون کی باریک نالیوں 'کپیلریز' کے قریب سے گزرتی ہے تاکہ اس کا خون میں جذب ہونا آسان ہو جائے۔ چھوٹی آنت کی لمبائی اور اس میں آہستہ آہستہ حرکت بھی اس کام میں معاون ہوتی ہے۔ اندرونی دیواری پروجکشنز کو 'ولائی' کہتے ہیں۔ یہ صرف ایک سے دو ملی میٹر لمبی ہوتی ہیں، ان میں خون کی 'کپیلریز' کا ایک جال ہوتا ہے۔ ان 'ولائی' کی سطح پر جو خلیے 'سیل' ہوتے ہیں اس پر بھی مزید ہزاروں باریک پروجکشنز ہوتے ہیں ان کو 'مائیکرو وولائی' کہتے ہیں، یہ جاذب سطح کو بہت زیادہ بڑھا دیتے ہیں۔

ہر 'ولائی' (ولائی کا واحد) میں کپیلریز کے جال کے علاوہ اس کے درمیان میں ایک 'لیکٹیل' بھی ہوتا ہے،

نالیوں کا جال زیادہ تر غذا جذب کر کے خون میں پہنچاتا ہے، اس کے علاوہ 'لیکٹیل' میں 'فٹی ایسڈز' جذب ہو جاتے ہیں۔ وہاں ایک 'لیکٹو لیف' بھی ہوتا ہے جو آخر کار اپنے سب لوازمات کے ساتھ 'ڈکٹ' کے ذریعہ خون میں شامل ہو جاتا ہے، اس نظام کو 'ہیپٹک سسٹم' کہتے ہیں۔ 'ہیلیم' سے نکلنے والی یہ خون کی باریک نالیاں 'کپیلریز' خون کی بڑی ورید 'ہیپٹک پورٹل وین' سے جڑ جاتی ہیں اور یہاں سے خون جگر 'لیور' میں چلا جاتا ہے۔

ہمارا جہاز 'ولائی' کے درمیان سفر کر رہا ہے، 'ہیلیم' کے آخری حصے تک زیادہ تر غذا، ہمکیات، حیاتین اور پانی خون میں جذب ہو چکا ہے۔ اب جو بچا ہوا پیرکار فضلہ ہے اس میں زیادہ تر تو 'سیلیوز' فائبر ہے جو 'ہیپٹک سسٹم' میں حرکت میں مدد دیتا ہے اور بیماریوں سے بچاتا ہے، اس کے علاوہ زندہ و مردہ بکٹیریا، کھانے کی نالی 'گٹ' کے ٹوٹ پھوٹ جانے والے 'سیل' اور ایسے دیگر اجزاء ہوتے ہیں جو ہضم ہونے کے قابل نہیں تھے۔ یہ سب بڑی آنت کے پہلے حصے 'کولون' میں داخل ہو گئے، یہاں باقی بچا ہوا پانی وغیرہ بھی جذب ہو رہا ہے اور نیم ٹھوس فضلہ آگے جا کر بڑی آنت کے آخری حصے 'رکٹم' میں جمع ہو رہا ہے جس کے بعد پھر اس کو 'انیس' کے راستے بدن سے باہر نکل جاتا ہے۔

کئی گھنٹے کے سفر سے بچے اب تھکنے لگے تھے مگر فاروق اب بھی اپنی سوچوں میں گم تھا کہنے لگا "سر! یہ اتنے سارے پیچیدہ اعضاء اور ان کے پرقیامت کام! ترتیب و ایک دوسرے پر منحصر کاموں کو دیکھ کر کبھی کوئی ہٹ دھرم ہی ہوگا جو یہ گمان کرے کہ یہ سب اتفاقی حادثے سے اپنے آپ خود بخود بن گیا ہے،" میں نے کہا، ہاں! یہ بات یقینی ہے کہ سب کو ایک خالق نے پیدا کیا ہے اور یہ ہی وہ 'زب' ہے جو اس سارے کارخانے کو چلا رہا ہے۔" اسی دوران میں نے اپنے خیالی جہاز کو آنتوں کی 'فصلوں' (Villi) کے درمیان اتار دیا۔ عمر پریشان تھا، بولا "سر! اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟" میں نے کہا آپ لوگ بھی تھک گئے ہیں اب جاگنیں صبح دیکھیں گے کہ ہم کہاں جاگنیں گے.....

اُس سے سفر کے دوران تعارف ہوا تھا۔ ہم دونوں نے رات ایک ہی سرائے میں گزاری تھی اور ہماری منزل بھی ایک تھی۔ وہ ملک کا ایک جانا پہچانا آدمی تھا، اس کی ہم سفری پر مجھے فخر محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا نام پورے ہر زیگووینا میں گونجتا تھا۔

ہم دونوں ساتھ ساتھ سفر کر رہے تھے۔ میں ایک اعلیٰ نسل گھوڑے پر سوار تھا۔ گھوڑے کی نسل اعلیٰ ہونے کی دلیل یہ تھی کہ وہ کئی مرتبہ مجھے گرا چکا تھا۔ میں عموماً اسی گھوڑے سے گرتا ہوں جو بہت اچھا ہو۔ میرا گھوڑا پر تکبیر انداز میں سینہ پھلائے گردن آسمان کی جانب کیے شاہانہ حرکت سے قدم اٹھا رہا تھا۔

میرا ہم سفر، سفر کی ابتدا سے ہی خاموش خاموش تھا۔ وہ اپنی سفید گھوڑی پر سوار تھا۔ اس کے ساتھ ۴، ۵، ۶ بار بردار گھوڑے بھی تھے۔ اُن پر زین تو کسی ہوئی تھی لیکن کوئی سامان نہیں تھا۔

وہ ایک تونمند شخص تھا۔ طویل قامت، کشادہ سینہ، وحشی عمر میں بھی اس کی صحت قابل رشک تھی، بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ جوانی میں وہ کیسا وجیہ ہوگا۔ وہ اپنا روایتی لباس زیب تن کیے ہوئے تھا جس میں خوش نما سنہرے بن لگے تھے۔ اس کی پیشانی پر چمک دار ریشی رومال بندھا تھا، رومال کے کنارے دونوں طرف اس کے سینے پر پھول رہے تھے۔ اس کی وضع قطع، لباس اور وجاہت، یہ سب کچھ اتنا دیدہ زیب تھا کہ میں چاہنے کے باوجود اس کی طرف سے نظر نہیں ہٹا سکتا تھا۔ وہ اتنا بازعجب تھا کہ اس سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے کچھ پکچھ ہورہی تھی۔

اس کا نام ڈیکویراؤچ تھا۔ اس کے متعلق طرح طرح کی کہانیاں مشہور تھیں۔ اس کی دلیری، چالاکی اور بہادری کا زبردست چرچا تھا۔ وہ اپنی قانون شکن بہادری کے لیے دور دور تک جانا پہچانا جاتا تھا۔ وہ بہت ڈنڈن تھا۔ اس نے ہر زیگووینا کا ایک بڑا علاقہ

مذقوں دہشت زدہ رکھا۔ ہم دونوں خاموشی سے سفر کر رہے تھے، اجنبیوں کی طرح۔ اس کیفیت پر مجھے الجھن ہونے لگی۔ میں نے چپ توڑتے ہوئے اُسے مخاطب کر ہی لیا، میرا مقصد اس سے صرف گفتگو کرنا تھا۔ ”برادر! تمہارے ساتھ یہ اتنے سارے گھوڑے کیوں ہیں؟ ان پر کوئی سامان بھی نہیں ہے۔“

”میں سامان لے کر شہر گیا تھا اب وہاں سے خالی لوٹ رہا ہوں۔“

”سامان تم کسی کے لیے لے گئے تھے یا تجارت کرتے ہو؟“

اس نے مجھے گھور کر دیکھا جیسے میرا سوال اسے ناگوار گزرا ہو، میں ہڑ بڑا گیا، چند لمحوں بعد اس نے جواب دیا۔ ”میں یہ سامان مرحوم علی میویا گچ کے بچوں کے لیے لے گیا تھا۔“

میں نے حیرانی سے اسے دیکھا کیونکہ علی میویا گچ اس کے دشمن کا نام تھا۔ ”تم یہ سامان اس کے بچوں کو دینے گئے تھے؟“ میرے منہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

”ہاں، اس لیے کہ میں علی میویا گچ کا مقروض ہوں، اس کے بھاری قرض تلے دبا ہوا ہوں۔“ اس نے سر جھکا کر گھوڑی کی گردن پر ضرب لگائی، گھوڑی پہلے ہی تیز چل رہی تھی، اب وہ برق رفتاری سے آگے بڑھی۔ مجھے مزید سوالات کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں نے بھی گھوڑے کی راس ڈھیلی چھوڑ دی اور نقد گنگنا تا ہوا اس کے ساتھ ساتھ بڑھنے لگا، اس وقت یہ یاد نہیں آ رہا کہ میں کون سا نفعہ گنگنا رہا تھا۔ شاید میرا نفعہ اسے پسند آیا، اس نے رفتار جیسی کر لی اور غور سے سننے لگا۔ ”اوچی آواز میں گاؤ۔“ اس نے اپنی فرمائش کی، میں نے آواز اوچی کر لی۔ اس نے اپنی پیشانی پر بندھا ہوا رومال ڈھیلا کیا، رومال اس کی گردن میں آگیا۔ ڈیکویراؤچ آواز کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ سر ہلانے لگا۔ کچھ دیر بعد میں خاموش ہو گیا۔ اس نے کہا: ”آگے گاؤ۔“

”مجھے اس کے بول یاد نہیں۔“ شاید میرا جواب اسے

انچھانیں لگا، وہ ایک بار پھر مجھ سے آگے نکل گیا۔
 یکا یک اس نے گھوڑی موڑی اور اسے اڑ لگائی۔
 اب اس کا رخ سڑک سے اتر کر درختوں کی جانب
 تھا۔ میں نے دریافت کیا۔ ”کہاں جا رہے ہو؟“
 ”درختوں کے نیچے، ہمیں کچھ دیر آرام کر لینا
 چاہیے۔“

میں بھی اس کے پیچھے پیچھے ہولیا۔ سائے میں پہنچ کر
 ہم نے گھوڑے چرنے کے لیے آزاد کر دیے، پھر ایک
 گئے بیڑ کی چھاؤں میں بیٹھ کر ہم دونوں خاموشی سے
 باپ پینے لگے۔ گھوڑوں کے جڑے چلنے کی آواز اور دور
 نہیں ”گڈ گڈوا“ کی ٹھک ٹھک کے علاوہ بالکل سناٹا
 تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے اس سے پوچھا۔ ”تم علی کے کب
 مقروض ہوئے؟“

اس نے ایک گہری سانس لی اور ہاتھ ہلایا۔ ”ایک
 مدت گزر گئی۔“
 ”مدت ہو گئی۔“ میں نے تعجب سے کہا۔ ”اور قرض
 ادا نہیں ہوا۔“

”ہاں، یہ قرض ادا کرنے میں طویل وقت لگے گا۔“
 ”مذہب دھرم کے دو تین مرغولے ہوا میں چھوڑنے کے
 بعد اس نے مجھے دیکھا اور پھر خلا میں گھورتے ہوئے مجھ
 سے مخاطب ہوا۔ ”یہ ایک لمبی کہانی ہے میرے دوست! اور
 میرے لیے یہ بہت تکلیف دہ ہے۔“

”مجھے بتاؤ گے؟“ میں نے اشتیاق سے کہا۔
 وہ میرے التجا آمیز اشتیاق سے متاثر ہوا اور اداسی
 سے بولا۔ ”کیا کرو گے سن کے!“

”اگر مناسب ہو تو.....“ میں نے اصرار کیا۔
 اس کی آواز کہیں دور سے آتی محسوس ہو رہی تھی۔
 کہنے لگا۔ ”تمہیں معلوم ہوگا، ترک حکمرانوں کے ظلم و ستم
 نے مجھے ڈاکو بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ ہم سرب باشندے
 ترکوں کی حکومت میں اپنی ہی زمین پر معتب شہریوں کی
 طرح زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ ہمیں کوئی انسانی حق
 حاصل نہیں تھا۔ آخر کوئی فرد یا کوئی قوم کب تک ظلم سہے۔“

ہر ترک کے سامنے سر جھکانا اور اس کا غلام بن کر رہنا
 ہمارے لیے مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ میں ان دنوں جوان تھا۔
 ترکوں کے خلاف نفرت کی آگ سربوں میں بڑھتی جا رہی
 تھی۔ مجھ جیسے کچھ اور سر پھرے بھی تھے، ہم خیالی نے
 ہمیں یک جا کر دیا۔ ہم ہر وقت ترکوں سے بدلہ لینے،
 انہیں زک پہنچانے کے بارے میں باتیں کرتے۔ میرے
 ساتھیوں کی تعداد صرف ۶ تھی۔ ہم سب اسلحہ لے کر جنگل
 میں روپوش ہو گئے۔ جنگل سے ہم ترکوں پر نگاہ رکھتے اور
 جیسے ہی موقع ملتا، ان پر ٹوٹ پڑتے۔ شاید ہی کوئی دن
 گزرتا ہو جب ہم کسی طرح ترکوں کو نقصان نہ پہنچاتے
 ہوں۔ رفتہ رفتہ ہمارے ساتھیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ نفری
 بڑھی تو ہمارا اعتقاد بھی بڑھا۔ ایک دن پرانا حساب چکانے
 کے لیے ہم نے علی میوا گج کے گھر پر حملہ کر دیا۔ کے نہیں
 معلوم کہ علی علاقے کا سب سے خود سر ترک تھا اور قریب
 قریب تمام ترک زمیندار اس کی سرپرستی کرتے تھے۔
 ہمارے حملے سے اس کے خاندان کے تین افراد مارے
 گئے لیکن وہ خود بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا۔ ہم نے اسے
 بہت تلاش کیا لیکن وہ نہیں ملا۔ ہم نے اس کا گھر جی بھر کر
 لوٹا، پھر لوٹ کے سامان سے لدے پھدے جنگل میں
 اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے۔

”ہمیں اس کارروائی کی بہت بھاری قیمت ادا کرنی
 پڑی۔ جواباً علی نے ہم سے زیادہ لڑنے والے جمع کیے اور
 ہمارے پیچھے پر گیا۔ وہ ہمیں جنگلوں اور پہاڑوں سے جگہ
 جگہ بھاگنے پر مجبور کرتا رہا۔ ہم بھاگتے رہے، بھاگتے
 بھاگتے ہم پہاڑوں کے اس حصے تک چلے گئے جہاں
 پہاڑی بکرے بھی نہیں پہنچتے۔ علی اور اس کے ساتھی
 ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ اب ہمارے پاس اس کے سوا
 کوئی چارہ نہیں تھا کہ دشمن کا مقابلہ کیا جائے اور لڑتے
 ہوئے جان دے دی جائے۔ علی کے پاس نفری بہت تھی۔
 علی نے چاروں طرف سے ہمیں گھیرے میں لے لیا۔
 ہمارے پاس نہ کھانے کے لیے کچھ تھا، نہ پانی تھا۔ ہم
 بھوک، پیاس اور تھکن سے بے حال تھے اور زندگی سے

نامید ہو چکے تھے۔ کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ دشمن کا گھبرا توڑ کر نکل جائے، ہم سب موت کا انتظار کر رہے تھے۔ بہت سوچنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ ہمیں خود بڑھ کر غنیمت پر حملہ کر دینا چاہیے۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے کہا ”بھائیو! ہم چاروں طرف سے گھرے ہوئے ہیں۔ ہمارے پاس دانہ پانی بھی نہیں ہے۔ کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ ہم خود چاہل کرتے ہوئے دشمن پر قہر بن کر ٹوٹ پڑیں اور بہادری کی طرح جان دے دیں۔ مرنا تو ہر حال میں ہے، کیوں نہ ہم ان ترکوں کو مار کر مریں۔ فرض کرو اگر ہم قسمت سے بچ گئے تو یہ ہمارا انعام ہوگا۔ ساتھیوں نے میری رائے سے اتفاق کیا۔ سب سے پہلے میں بندوقی لہراتا ہوا پناہ گاہ سے نکلا۔ میری تقلید میں دوسرے ساتھی بھی باہر آ گئے۔

”ترکوں نے ہمیں فوراً نشانے پر رکھ لیا۔ میں نے اپنے دوستاقتی کرتے ہوئے دیکھے۔ پیچھے پٹنے کا موقع نہیں تھا، میں گولیاں چلاتا ہوا آگے بڑھا، ساتھی بھی میرے ساتھ تھے۔ میری آنکھیں خون آلود تھیں، مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچانک میری پشت پر ایک زبردست جھکا لگا، میں لڑکھڑایا اور ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

”ہوش آیا تو میں نے خود کو علی میوا گج کے گھر میں پایا۔ میں ایک آرام دہ بستر پر لیٹا تھا اور علی سمیت کئی ترک میرے بستر کے چاروں طرف کھڑے تھے۔ میری آنکھیں کھلیں تو علی نے جھک کر میرے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ ”کیسا محسوس کر رہے ہو؟“ اس نے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ میں نے اٹھنا چاہا لیکن تکلیف کی شدت نے اٹھنے نہیں دیا۔ ایسا محسوس ہوا جیسے پیٹھ میں دوبارہ گولی بوسٹ ہو گئی ہو۔ میں پھر بے ہوش ہو گیا۔

”پورے ایک مہینے تک میں موت سے لڑتا رہا۔ علی نے ایک لمحے کے لیے بھی مجھے نہیں چھوڑا۔ وہ احتیاط اور تن دہی سے میری دیکھ بھال کر رہا تھا۔ وہ خود میرا زخم دھونا، اپنے ہاتھوں سے مرہم پٹی کرتا اور اپنے ہاتھوں سے مجھے کھانا کھلاتا۔ اگر میں کم کھاتا تو وہ ضد کر کے مجھے اور

کھلاتا۔ اکثر وہ میرا سراپے زانو پر رکھ کے میرے بالوں میں آہستہ آہستہ انگلیاں پھیلاتا، اس طرح مجھے نیند آ جاتی۔ ”اس کی اس جاں فاشی کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے موت کو شکست دے دی۔ میرے جسم میں تیزی سے توانائی آنے لگی۔ زخم مندمل ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ایک دن دیوار کا سہارا لے کر میں اپنے پیروں پر کھڑا ہو گیا۔

”علی روز مجھے باغ میں ٹھلانا لگا۔ جب میں تھک جاتا تو وہ مجھے کسی درخت کے سائے میں آرام کے لیے بٹھا دیتا۔ طاقت روز بروز بڑھتی گئی۔ مجھے صحت یاب ہوتے دیکھ کر علی کے چہرے سے خوشی پھوٹنے لگی تھی۔ ”اب کیسا لگتا ہے؟ کیا تم میں دوڑنے اور کودنے کی طاقت آ گئی؟“ ایک دن اس نے مسکراتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں۔ میں اب بھی نقاہت محسوس کرتا ہوں۔“

”اس نے اپنی انگلیاں مروڑتے ہوئے زوردار قہقہہ لگایا۔ جلد، بہت جلد تم بالکل تن درست ہو جاؤ گے۔“

چند دنوں بعد اس نے اپنا یہ سوال پھر دہرایا۔ ”تم میں دوڑنے اور کودنے کی طاقت آ گئی؟“

”کوشش کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔ وہ ایک جانب ہٹ گیا۔

میں نے دوڑنے اور اچھلنے، کودنے کا مظاہرہ کیا۔ علی نے خوشی سے بھرپور قہقہہ لگایا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ اب تم بالکل تن درست ہو گئے ہو۔“

”وہ مجھے باغ میں چھوڑ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد وہ لوٹا تو اس کے ہاتھوں میں دو بندوقیں تھیں۔ اب اس کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا تھا اور آنکھوں میں بھوکی بلی والی چمک تھی۔ ”میں نے تمہیں اس قابل کر دیا ہے کہ تم دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑے ہو سکو۔“ اس نے میرے سامنے آ کر کہا۔ ”اب تم پہلے کی طرح طاقتور ہو، اتنے ہی طاقتور ہو جتنے زخمی ہونے سے پہلے تھے۔ اب تم اس قابل ہو گئے ہو کہ میرا قرض ادا کر سکو۔ تم پر میرا بہت بھاری قرض ہے۔ تین سروں کا قرض، جن میں

ایک دعا

آنکھیں پھرائی ہوئیں اور لب محروم سوال
برزخ یاس میں صدیوں سے جیسے جاتے ہیں
یہ جو ہیں عُشّہ زدگان بے مہری وقت
ٹھہرے معتبہ بارگاہ جمال
رایگاں ہوتے رہے اسم غلامی کے اسیر
اے خدا ان کو رہائی دے دے
اک نیا عزم دے اک جرأت زندانہ دے
چند کرئیں کسی خورشید جہاں سوز کی دے
جن کی حدت سے پھل جائے کھولت کا محمود
ان کی آنکھوں میں نئے خواب جگا
ان کے ہونٹوں کو ملیں معجزہ آسا الفاظ
ان کے ہاتھوں کو بنا تیشہ مزدور وفا
ان پر ایسا اُتار اسمِ عظم
جو انھیں پھر سے معتبر کر دے

(میجر جنرل (ر) محمد جاوید)

لبلی دہائی تھی یا نہیں۔ مجھے صرف یہ نظر آیا کہ وہ لڑکھڑاتا
ہوا زمین پر گر رہا ہے۔ میں افسوس اور غم سے جلاتا ہوا اس
کی طرف لپکا اور اس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا لیکن آہ وہ
ختم ہو چکا تھا۔

”اس دن کے بعد سے میں اس کے بچوں کو اجناس،
سبزیاں اور دیگر چیزیں پہنچاتا ہوں، میں بھیڑیں، بکریاں
اور گائیں بھی لے جاتا ہوں تا کہ وہ ان سے اپنے دیگر
اخراجات پورے کر سکیں۔“

ڈیکو نے اپنی کہانی ختم کی اور سر جھکا کر زمین
کریدنے لگا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ اسے آنسو روکنے میں
کامیابی نہیں ہو رہی ہے۔ آنسو بہہ بہہ کر اس کے گالوں پر
پھیل رہے تھے۔

سے دوسرے میرے بھائیوں کے تھے۔ اس کی آنکھوں میں
فون بھرا ہوا تھا، نکلا جڑا پھڑکنے لگا۔

”جب تم دھنی ہو کر میرے قدموں میں بے ہوش
ہوئے تھے، اس وقت میں آسانی سے تمہیں مار سکتا تھا لیکن
نہ دشمن پر حملہ کرنا ترکوں کی روایت نہیں ہے۔ میں تمہیں
دوبارہ چاق و چوبند کرنا چاہتا تھا۔ علی میویا بچنے
کسی مجبور دشمن کو بھی قتل نہیں کیا۔ تمہیں بے ہوشی میں مار
کے میں اپنے دامن پر داغ کیسے لگا سکتا تھا۔“

”اس نے ایک بندوق میرے ہاتھوں میں تھما دی۔“
یہ بندوق بالکل میری بندوق جیسی ہے اور میری بندوق کی
طرح اس میں بھی گولی ہے۔ ہم دونوں جنگل میں جائیں
گے اور اپنے اپنے نشانے کا امتحان لیں گے۔“

”میری زبان پر جیسے تالا پڑ گیا۔ میں سر کو جھکائے
کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چلنے لگا۔ ہم جنگل میں
چلے گئے۔“

”اب میرے حواس دوبارہ کام کرنے لگے تھے۔
میں نے بندوق پھینک دی اور ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ علی
چلایا۔ ”کیا تم یہ سمجھ رہے ہو کہ میں ایک طرفہ طور پر گولی
چلاؤں گا تا کہ دنیا میرے نام پر تھو کے کہ میں نے غیر مسلح
دشمن کو قتل کر دیا۔ کان کھول کر سن لو، تمہیں وہی کرنا ہے جو
میں تم سے کہہ رہا ہوں، میں یہ مقابلہ ترک کرنے کا کوئی
ارادہ نہیں رکھتا اور نہ مقابلے کے بعد تم پر حملہ کروں گا۔“
اس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ میں خاموش کھڑا
تھا۔ ”بندوق اٹھاؤ۔“ وہ زور سے چیخا۔ ”نہیں تو میں تمہیں
خزائن کہہ کے پکاروں گا۔“

”میں نے جھک کر زمین سے بندوق اٹھالی۔“ اس
طرف مڑ جاؤ۔“

”میں اس کے حکم کے مطابق مڑ گیا۔“

”میری طرف نشانہ باندھو۔“

”میں نے قیبل کی۔ اس نے بھی بندوق کا رخ میری
جانب کر دیا۔ اس نے فائر کیا، اسکی گولی جنگل میں کہیں
اور ہلاکت پیدا کرتی ہوئی گزری۔ مجھے یاد نہیں، میں نے

بقا



زندگی اس سے روٹھی ہوئی تھی اور موت کی بھی خبر نہ تھی

ایک باپ کا ماجرا وہ تماشا بھی تھا اور تماشائی بھی

کبھی رشتوں کے دھاگے رنگ چھوڑ بھی دیتے ہیں

انیلا

تم آگئے ہو۔ سنبھالو اپنی ڈیوٹی۔ مجھے کل ضرور لاہور جانا ہے
ورنہ کوئی بات نہ تھی۔ ڈیڈی کی خاطر ہفتہ اور رہ جانی۔
”مجھے تو خود بہت فکر تھی باجی، اللہ کی قسم جو جھوٹ
بولوں۔ لے کر تو میں اپنے باپ کو اسپتال جا رہا تھا، مگر فکر
صاحب جی کی لگی ہوئی تھی۔“

انیلا نے پرس اٹھایا اور دوسرے نوٹ نکالے۔
”لو، یہ رکھ لو۔ ڈیڈی کا اچھی طرح خیال رکھنا۔“ اس
نے تصدق کو بیگ اٹھانے کا اشارہ کیا جو اس نے صبح سے
تیار کر کے رکھا ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر تک ڈیڈی کے بیڈ کے پاس
کھڑی ہو کر ان کے چہرے کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر
کمرے پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے کہ کوئی چیز رہ تو نہیں گئی،
باہر کو ریڈور میں نکل گئی۔ آفیسرز وارڈ کے بالکل سامنے
بہت وسیع خوب صورت لان تھا۔ سلیپے سے بنی ہوئی
پھولوں بھری کباہیاں تھیں۔ سرسبز گھاس پر گلاب، جرمینم
اور ڈیلیا کے جلو میں مریضوں کے متعلقین چھوٹے چھوٹے
گروپ بنائے بیٹھے تھے۔ کوئی نیم دراز تھا، کوئی کچھ کھارہ
تھا۔ کوئی قہر موم سے چائے انڈیل رہا تھا۔ چھوٹے بچے
ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ انیلا نے گاڑی پارکنگ سے نکالی۔
اسپتال سے نکلنے ہوئی کھلی فضا میں اس نے لمبا

کو تصدق پر رہ کر غصہ آ رہا تھا۔ تین
دن کا کہہ کر گیا تھا اور آج پانچواں دن
تھا۔ ان کم بخت لوکروں کو چھٹی پر
جاتے وقت پتا نہیں کیا موت پڑ جاتی ہے۔ بھی سچ نہیں
بولتے، کہیں گے تین دن اور مطلب ہو گا آٹھ دن۔
احسان فراموش طبقہ، سارے ایک جیسے، ایک کو اٹھاؤ
دوسرے کو رکھو۔ انیلا کا اگلے دن لاہور جانا بہت ضروری
تھا۔ نرسری میں بچکی کے داخلے کا آخری دن تھا۔ اس کا
شوہر خالد لاہور سے فون کر کر کے تھک گیا تھا کہ کس
فلائٹ سے آ رہی ہو؟ لیکن یہ مکینہ تصدق چھٹی پر جا کر مرم
ہی گیا تھا۔ مجبوری نہ ہو تو بندہ نکال باہر کرے۔

”سلام علیکم باجی!“ کمرے کے دروازے میں تصدق کا
گورا کشمیری چہرہ چمکا۔ اس نے بالکل نئی نیلی شلوار قمیص پہن
رکھی تھی اور ہاتھ میں چھوٹا سا براؤن بیگ تھا۔ وہ مسکرا رہا تھا۔
”شکر ہے۔ تم نے تو سال لگا دیا تھا۔“ وہ خاتما ہو کے بولی۔
”مجبوری تھی باجی! ابا جی کے دل میں تکلیف ہو گئی
تھی۔ اسپتال بہت دور تھا، چار پائی پر ڈال کر لے گئے۔“
”دل میں تکلیف؟“ لوجی، نوکروں کے اباؤں کے دلوں
میں بھی تکلیف ہونے لگی۔ صاف بہانہ لیکن خیر۔ چلو اب تو

سانس لیا۔ اگر شام کی فلائٹ مل گئی تو رات تک وہ خالد کے پاس ہوگی۔ چنکی کو وہ پہلی دفعہ اکیلے چھوڑ آئی تھی۔ اس کے ہونٹ چنکی کے پلاسٹک کی گڑیا جیسے لگانی گال چومنے کو بے چین تھے۔ چنکی نے فون پر فرتوں دانے فراک، ملک چاکلیٹ اور بڑی سی بولنے والی گڑیا کی فرمائش کی تھی۔ وہ سوچ کر مسکرا دی۔ کتنے سارے کام تھے۔ سیٹ کفرم کرانا، پھر شاپنگ کرنا۔ خالد کو اس کے بغیر سونے کی عادت نہیں تھی اسی لیے فون پر فون کیے جا رہا تھا۔ شکر ہے، تصدق آگیا۔

گزری ہوئی رات کا سوچ کر انیلا کو جھرجھری آگئی۔ ڈیڈی کے زخروں سے لکھنے والی وہ خوفناک خرخراہٹ۔ وہ خوف زدہ ہو کر ڈیڈی نرس کی طرف دوڑی تھی لیکن نرس کو اپنی کرسی سے اٹھنے کی کوئی خاص جلدی نہیں تھی۔ وہ نہایت اطمینان سے آہستہ آہستہ آئی تھی اور ڈیڈی کے بیڈ کے پاس دو چار سینکڑے ہو کر اس نے کہا تھا کہ یہ معمول کی بات ہے، خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ انیلا کو تو ایسا لگا تھا جیسے ڈیڈی کا آخری وقت آگیا۔ وارڈ کی مخصوص بو، کمرے کی بند کھڑکیاں، ڈیڈی کے پوری طرح کھلے ہوئے منہ سے تیز تیز سانس کی آواز، خشک چمڑے جیسے سوکھے ہونٹ۔ اسے یاد آیا، جھپٹی دفعہ جب وہ آئی تھی تو کمرے کے بند ماحول اور گھٹن میں اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ وہ کھڑکی کھولنے کو بڑھی تھی تو تصدق نے چیل کی طرح جھپٹ کر کھڑکی بند کر دی تھی۔ ”صاحب جی کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں، نمویہ کا خطرہ ہے۔“

ایک لمحے کو انیلا نے غیر ارادی طور پر سوچا تھا کہ اگر ڈیڈی کو نمونیا ہو بھی جائے تو کیا فرق پڑتا ہے لیکن ایسی بات وہ شعوری طور پر سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی پھر اس نے سوچا کہ تصدق کتنا اچھا ہے، کتنا خیال ہے اسے ڈیڈی کا۔ سب ٹھیک ہی تو کہتے ہیں کہ تصدق فرشتہ ہے فرشتہ۔

اس کا اپنا ہی حال تھا کہ پوری شام اور رات اس سے کچھ نہیں کھایا گیا تھا، ہسپتال کا کھانا سوپ، چکن، پڈنگ، پھل دیکھ کر ہی جانے کیوں اس کا جی اُوب رہا تھا۔ ڈیڈی کو

دیکھ دیکھ کر شاید اس کی بھوک مر گئی تھی اور یہ تصدق کیسے ڈنٹ کر کھاتا تھا، پوری ٹرے صاف کر دیتا تھا۔ کمرے میں چھوٹی ساٹی وی بیڈ کے سامنے والی دیوار پر نصب تھا اس پر زیادہ تر ادھیڑ عمر کے بے کش مرد طویل اقتصادی اور معاشی بحوالوں میں مشغول نظر آتے تھے۔ کبھی کوئی مولوی لیکچر دیتا۔ انیلا وقت گزاری کے لیے اپنے ساتھ ڈائجسٹ لیتے آئی تھی۔ زیادہ وقت وہی پڑھتی رہی۔ وہ ساری رات کرسی پر بیٹھی رہی تھی۔ اینڈنٹ والے بیڈ پر تصدق سویا کرتا تھا، انیلا کا اس بستر پر لیٹنے کو دل نہ چاہا۔ یہ کمرہ مکمل طور پر تصدق کی راج دھانی تھا۔ ہاتھ روم کے کبڈ میں بھی تصدق کی سوجھی ہوئی مسواکیں، ٹوٹھ پاؤڈر اور سرسوں کے تیل کی شیشیاں تھیں۔ وہ تو وہاں اجنبی تھی جو ہر لمحے فرار ہونے کو تیار تھی۔

ڈیڈی ویجی ٹیرین (سبزی خور) تھے۔ کار کا ایکسیڈنٹ، ریڑھ کی ہڈی اور دماغ کی جوٹ، کو ما سب پرانی بات ہو چکی تھی۔ تین سال میں نیا کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ سوائے اس کے کہ تین سال سے ان کی سانس چل رہی تھی، کبھی متوازن اور آہستہ آہستہ، کبھی پر شور اور تیز تیز، کبھی ہلکے ہلکے خراٹوں کی صورت، کبھی خوف ناک خرخراہٹ اور کبھی کراہوں کی طرح۔ ٹیوٹیں اور سرخیں ہی انہیں غذا پہنچاتی تھیں اور جسم سے لگتی تھیلیاں نکال کا کام دیتی تھیں۔ شاید ناک میں ڈلی ہوئی ٹیوٹیں انہیں تنگ کرتی ہوں یا شاید جسم میں گھسی ہوئی ٹیپ سے چپکانی گئی سوئیاں تکلیف دیتی ہوں۔ انیلا سے یہ منظر دیکھنا نہ جاتا۔ اس نے مشکل سے ایک دن اور ایک رات کی یہ ڈیڈی دی تھی۔ تصدق بہت کم چھٹی پر جاتا تھا۔ اس کے چھٹی پر جانے کی صورت میں عام طور پر انیلا کی امی یا بہن ڈیڈی دیتی تھی۔ اکلوتا بھائی نیو جرسی میں تھا، وہ ہر ہفتے فرمان برداری کے ساتھ فون کرتا تھا۔ ”ڈیڈی کیسے ہیں؟“ ”اسی طرح۔“

”اوہ“

کبھی کبھار وہ ہچکچاتے ہوئے بہن سے پوچھ لیتا۔

”ڈاکٹر کیا کہتے ہیں؟ How Long“

اب ایک ہی رات میں انیلا کو تصدق کی قدر و قیمت

دومسافر

ہنگلا ادب سے ایک عبرت نشان تحریر

دومسافروں کی کہانی

دونوں اپنے بیتے ہوئے روز و شب،

ماہ و سال ڈھونڈنے نکلے تھے

ڈیڈی کا جسم پھر کتا تھا۔ وہ انہیں نمونیا نہیں ہونے دیتا تھا۔ ان کی سونیوں اور ٹیوبوں پر شیر کی نظر رکھتا تھا۔ انیلا نے نہ چاہتے ہوئے بھی کمپنی سے سوچا کہ اس تصدق کو ڈیڈی سے کوئی محبت و جنت نہیں، دراصل غرض کا رشتہ ہے۔ ڈیڈی کی زندگی سے اس کی نوکری جو بڑی ہوئی ہے۔ کہاں کی محبت، کیسی محبت۔ اس کا کون سا رشتہ ہے، خواہ فرشتہ بنا ہوا ہے۔ دیہات کا ساتویں پاس لڑکا اور ڈھائی ہزار تنخواہ! کوئی غریب گھر کا لڑکا سوچ بھی سکتا ہے ایسی نوکری کا آفسر ز وارڈ کی فانیو اسٹار والی عیاشیاں، ٹرائیوں پر سچے سجائے کھانوں کی ٹرے، گرمیوں میں ایئر کنڈیشننگ سردیوں میں ہیٹنگ ۳۳ گھنٹے کی وی، ٹائلوں والا پتھر دم (گاؤں میں ہوتا تو کھیتوں میں مرتا کہیں)۔ نہ کام نہ کاج۔ سارا دن دوسرے کمروں کے انٹینڈنٹس سے گپ شپ۔ جو مریض ہوش میں ہیں نہ ہو، اس کے انٹینڈنٹ کو آرام ہی آرام نہ ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ ڈیڈی کو مرنے نہیں دے گا۔ یہ ڈیڈی کو واقعی مرنے نہیں دے گا۔

اُف کیا سوچنے لگی ہوں میں۔ کس طرح کی باتیں سوچ رہی ہوں۔ بیٹیوں کو تو ایسے سوچنا بھی نہیں چاہیے۔ ویری بیڈ۔ خود اپنا تو یہ حال ہے کہ ایک رات وہاں گزارنا حرام ہو گیا۔ بیمار ہونے لگی تھی میں ایک رات میں۔ اور وہ، وہ بے چارہ تین سال سے رات دن، دن رات۔ سب ٹھیک کہتے ہیں، تصدق فرشتہ ہے، سچ فرشتہ۔ سرخ کچھریل والی خوب صورت کوٹھی کے گیٹ میں گاڑی موڑ کر اس نے زور سے ہارن بجایا۔ اس کی بال بے چینی سے ڈرائیور وے میں ٹہل رہی تھیں، انیلا کو دیکھتے ہی وہ لپک کر گیٹ کھولنے کو بڑھیں۔ انیلا پورچ میں گاڑی کھڑی کر کے باہر نکلی تو اس کی امی سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ”تصدق آگیا؟“

”آگیا ہے۔“

”شکر ہے۔“ ان کے چہرے سے فکر کی ساری کھیر لی غائب ہو گئیں اور چہرہ اطمینان بھری مسکراہٹ سے یوں روشن ہو گیا جیسے ان کی دنیا میں سورج نکل آیا ہو۔

چل گئی۔ ”ہی ازوتھ، ہر ویٹ ان کولڈ۔“ اس نے واپسی پر ہی گھر کی طرف ڈرائیور کرتے ہوئے سوچا۔ اگر مجھے ایک رات بھی اور رکنا پڑ جاتا تو میں، تو میں، کیا حال ہوتا میرا، بیمار ہو جاتی شاید۔ پتا نہیں، کہاں سے خدا نے یہ فرشتہ تصدق بھیج دیا۔ تصدق واقعی فرشتہ ہے، کتنی محنت سے ڈیڈی کو زندہ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اسے سب پتا ہے۔ اسے پتا ہے، ڈیڈی کو کب کروٹ دلائی ہے تاکہ بید sore نہ ہو جائیں۔ کب ان کے اوپر کبل ڈالنا ہے، کب ان کے پیروں کے نیچے تکیہ رکھنا ہے، کب ان کا منہ گلیرین کے ساتھ صاف کرنا ہے، کب ان کے جسم کے ساتھ لگی ہوئی کوئی تھیلی خالی ہوگئی یا پھر گئی ہے۔ وہ ان کی دھندلی اور کھلی آنکھوں ہی سے ان کی ساری کیفیت سمجھ جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے، صاحب جی سب کچھ سنتے ہیں، بس بول نہیں سکتے۔ وہ ان کے ساتھ گفتگو کرتا تھا جو اس کے نزدیک یک طرفہ نہیں تھی۔ جب شام گھر والے وارڈ میں پہنچتے تو تصدق ان کے سر ہانے کے اوپر جھک کر اونچی آواز میں کہتا۔ ”صاحب جی! بیگ صاحب آئی ہیں۔“

باقی سب لوگوں کے لیے ڈیڈی انسانی سطح سے بہت کر ”چیز“ بن چکے ہیں لیکن تصدق یہ بات سمجھنے کو تیار ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے، صاحب جی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ وہ کہتا ہے، جب بھی کوئی ملنے آتا ہے، وہ پہچان لیتے ہیں، بس بتا نہیں سکتے۔ وہ کہتا ہے، وہ سب کی آوازیں سن لیتے ہیں، بس اپنی زبان نہیں بلا سکتے۔ وہ کہتا ہے..... لیکن اس کے کہنے کا کیا ہے۔ وہ کون سا ڈاکٹر ہے، گاؤں کا جاہل لڑکا۔

ڈیڈی بھی کبھی انسان ہوا کرتے تھے۔ شام کو ٹریک سوٹ پہن کر جو لنگ کرتے تھے اور گولف کھیلتے تھے۔ ان کے جان دار قہقہوں سے دیواریں بل جاتی تھیں۔ شیو کرنے پر پورا گھنٹہ لگتے تھے۔ اب تصدق شیو کر دیتا تھا، ناخن بھی کاٹ دیتا تھا۔ کتنی حیرت کی بات ہے کہ زندگی تو رک جائے، بال اور ناخن بڑھتے رہیں۔ کتنی بار تصدق نے ڈیڈی کی جان پچائی، جب ان کی انٹرمیڈیٹ سوئی غلط لگ گئی تھی اور ڈیڈی کا بازو، ہاٹ واٹر بوتل، کی طرح پھول گیا تھا۔ جب کسی دوائی کا ری ایکشن ہو گیا تھا، کیسے

کی دوپہر ڈھلنے لگی تھی اور آہر کے کھیت میں پڑتے ہوئے سائے آہستہ آہستہ لمبے ہوتے جا رہے تھے۔ اسی دھلتی دوپہر میں کشمیر ضلع بورڈ کی سڑک پر ایک مسافر کہیں جا رہا تھا۔ اس نے گہرے رنگ کا تہہ بند اور صدری پہن رکھی تھی۔ لمبوترے چہرے پر کھنی سفید داڑھی تھی اور ہاتھ میں اک تار تھا۔ وہ بہت تھکا ہوا لگ رہا تھا، اس کی نگاہیں راستے پر نہیں تھیں بلکہ راستے سے دور کہیں کھوئی ہوئی تھیں۔ گرمی کی تیز دھوپ میں ہر چیز جھلس کر رہ گئی تھی۔ اس جھلسے ہوئے رنگ کا حسن بیراکی کے دل کے رنگ سے مشابہ تھا شاید اسی لیے وہ اسے دیکھتا ہوا راستے طے کر رہا تھا۔ گاہے گاہے انجانے میں اس کی انگلی اک تارے کے تارے سے ٹکرا جاتی اور اس ننگ ننگ کی آواز دھوپ سے تپتی ہوئی فضا میں بکلی سی چیخ بن کر گونج اٹھتی مگر یہ گویا اس کی لاعلمی میں ہو رہا تھا کیونکہ مسافر کا دل تو اس وقت اک تارے کی موسیقی سے کہیں دور بھٹک رہا تھا، کسی دوسری دنیا کی سیر کر رہا تھا۔ راستے میں سایہ دار درخت بھی تھے لیکن مسافر ان درختوں کے سائے میں رکے بغیر چلا جا رہا تھا۔ وہاں سے تقریباً ۳ میل کی دوری پر ایک گاؤں تھا شاید وہی مسافر کی منزل تھی۔

پہلے مسافر کے پیچھے پیچھے ایک دوسرا مسافر بھی اسی راستے پر چل رہا تھا۔ اس کے قدم تیز تھڑ تھڑ رہے تھے۔ لگتا تھا، وہ آگے جاتے ہوئے مسافر کے قریب پہنچنا چاہتا ہے۔ پہلے مسافر کو آواز دے کر روکا جا سکتا تھا مگر دوسرا مسافر شاید آواز دینا نہیں چاہتا تھا۔ دوسرے مسافر کا چہرہ روکھا سوکھا سا تھا اور اس کی مونچھ اور اس کے دونوں بازوؤں کے بال سیاہ تھے۔ چہرہ چوڑا تھا اور آنکھیں گول تھیں۔ اسے دیکھنے سے ایسا لگتا تھا جیسے وہ حکم دینے کا عادی رہا ہو، حکم کی تعمیل کا نہیں۔ راستے کی تھکاوٹ دور کرنے کے لیے ہم سفر سے زیادہ بہتر کوئی چیز نہیں ہوتی شاید اسی لیے وہ تیز قدم اٹھا رہا تھا۔ تیز

چلنے کی وجہ سے اس کے چہرے پر تھکن کے آثار ابھر آئے تھے پھر بھی اس کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی، وہ تیز تیز چلتا رہا۔ ذرا قریب پہنچ کر دوسرے مسافر نے پہلے آواز دی۔ ”بھائی صاحب!“

پہلے نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوسرے مسافر کو دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر استقبالیہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”کیا آپ نے مجھے آواز دی ہے؟“

”جی ہاں۔“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

”السلام علیکم۔“ ”وعلیکم السلام۔“ پہلے مسافر نے جواب دیا۔

”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“ دوسرے مسافر نے پوچھا۔

”وہ سامنے آبادی نظر آ رہی ہے، وہیں جانا ہے مجھے۔“

”یہ تو بہت اچھی بات ہے۔“ دوسرے مسافر نے کہا۔

”میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔“

”چلے پھر ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔“ پہلے مسافر نے خوشی کا اظہار کیا۔

راہ میں ہم سفر مل جائے تو راستے کی طوالت کا خوف دل سے نکل جاتا ہے شاید یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگے۔ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے، مگر داڑھی والے مسافر کی نگاہیں دور غلامی میں کچھ دھونڈ رہی تھیں۔ مونچھوں والے مسافر کی نگاہیں بار بار اپنے ہم سفر کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ گرمی کے دنوں میں دور افت پر بہت تیز روشنی دکھائی دیتی ہے۔ افق کا یہ حال ہمیشہ نظر نہیں آتا۔ دوسرا مسافر بار بار اپنے ہم سفر کی طرف دیکھ کر اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کی نگاہوں میں جتو کیا ہے اور وہ افق پر نظریں جمائے کیا دیکھ رہا ہے۔ دوسرے مسافر نے کئی بار دور افت کی طرف دیکھا پھر پہلے مسافر کی نگاہوں کے تعاقب میں اپنی پہلا مسافر خاموشی سے آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہا تھا۔

دوسرے مسافر کو اس کی خاموشی اچھی نہیں لگی۔ آپس میں باتیں ہی نہ ہوں تو ہم سفر کیسی؟ اس نے خاموشی توڑنے کے لیے بلند آواز میں پہلے مسافر سے پوچھا۔

”بھائی صاحب! آپ گانا گاتے ہیں کیا؟“

پہلا مسافر محویت سے چونک اٹھا۔ ”آپ نے مجھ سے کچھ کہا بھائی صاحب؟“

”جی ہاں۔“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

پہلا مسافر دوسرے مسافر سے مخاطب ہو کر بولا۔

”کیہ؟“

”آپ گانا گاتے ہیں کیا؟“ اس نے دوبارہ پوچھا۔

”جی ہاں۔ گانا گاتا ہوں۔“

”تو پھر کوئی گانا سائیے نا؟“ دوسرا مسافر بولا۔ ”اگر آپ کو رحمت نہ ہو۔“

”رحمت کی کیا بات ہے؟“ پہلے مسافر نے کہا ”سننا چاہتے ہو تو سنئے۔“

گہرے لباس والے نے اک تار استہلال لیا اور گانے لگا دیں۔ دل کے دریا میں ایک عجب تماشا دیکھا

جسم کے اندر ایک گھر ہے
اس گھر میں چور گھس آیا ہے
۶ آدمیوں نے مل کر نقب لگائی ہے
ایک آدمی نے چوری کی ہے
جسم کے اندر ایک باغ ہے
اس میں مختلف اقسام کے پھول کھلے ہیں
پھولوں کی خوشبو سے ساری خلقت دیوانی ہو گئی ہے
لیکن لالن کا دل دیوانہ نہیں رہا
نغمے اور موسیقی کے آثار سے سنسان میدان نے ہونٹوں پر پانی بھر کر اپنی پیاس بجھائی۔ دھوپ کی حدت پائے ہٹ گئی اور سڑیوں کے اندر ساری دنیا ملغوف ہو گئی۔

گانا کب ختم ہوا، محسوس ہی نہیں ہوا۔

دوسرے مسافر نے اس سکوت میں اپنی آواز کا پتھر پھینکا۔ ”واہ وا، آپ تو بہت اچھا گاتے ہیں۔“

”جی!“ پہلے مسافر نے زخمت جواب دیا۔

”آپ کا نغمہ بھی خوب تھا۔“ دوسرے نے تعریف انداز میں کہا۔

”جی، بس یہی کچھ مجھے آتا ہے۔“

”نہیں، نہیں، سچ سچ آپ کی آواز میں بلا کو لوج اور درد ہے۔“ دوسرا مسافر بولا۔ ”میں نے ایسا نغمہ پہلے بھی نہیں سنا۔“

”بھی نہیں سنا؟“ پہلے مسافر نے حیرت سے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

”بہت خوب۔“ پہلا مسافر مسکرایا۔

دونوں کے درمیان مزید گفتگو نہیں ہوئی۔ وہ دونوں پھر تیز قدم بڑھانے لگے تاکہ جلد از جلد منزل پر پہنچ سکیں۔

میدانی علاقہ ختم ہو گیا اور دونوں آبادی کے قریب پہنچ گئے۔ چاروں طرف درختوں کی قطاریں تھیں اور درختوں کے درمیان مکانات کھڑے تھے۔ پختہ عمارتیں اور مین کے گھر دکھائی دے رہے تھے۔ کچھ لوگ گھروں سے نکل کر اپنے اپنے کام پر جا رہے تھے۔ یہ دونوں آگے بڑھنے لگے مگر کسی نے ان دونوں کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ ”چلو، اتنی دیر بعد کچھ آدمی تو نظر آئے۔“ پہلا مسافر بڑبڑایا۔

دونوں ایک دورا ہے پر جا کر رک گئے۔ راستے کے دونوں طرف دور تک زمین خالی تھی، اس کے بعد متول لوگوں کے مکانات اور تالاب تھے۔ ایک جگہ ایک ساتھ کئی عمارتیں تھیں اور پھلوں سے لدے ہوئے درختوں کا ایک بڑا سا باغ تھا۔

اس طرف نگاہ پڑتے ہی دوسرے مسافر نے اپنے بیراگی ہم سفر کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچے ہوئے کہا۔

”جلدی ادھر آئیے، وہ دیکھئے، وہ میرا گھر دکھائی دے رہا ہے، وہ میرا باغ ہے اور اس کے چاروں طرف جتنی زمینیں پھیلی ہوئی ہیں، وہ سب میری کاشت کی زمینیں ہیں۔ اس طرف آئیے۔ وہ جو ناریل کے پیڑوں کی لمبی قطار دکھائی دے رہی نا، آپ ان پیڑوں کے ایک ناریل کا پانی پی

لیں تو سات دن کی پیاس بجھ جائے۔“

پہلے مسافر کو کوئی جواب دینے کا موقع نہیں ملا۔ اس کا ہاتھ دوسرے مسافر کی مٹھی میں تھا اور وہ اسے کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ دونوں ایک پختہ کنارے والے تالاب کے پاس جا کر رک گئے۔ تالاب کے کنارے ناریل کے سیڑوں بیڑ تھے۔

دوسرے مسافر نے کہا۔ ”آپ اس بیڑ کے سائے میں بیٹھ جائیے۔ میں ناریل توڑنے کا انتظام کرتا ہوں۔ یہ سب کچھ میرا ہے۔ یہ تالاب، یہ باغ، یہ پختہ عمارت اور وہ جو حد نظر تک پھیلی ہوئی کاشت کی زمینیں ہیں، وہ سب میری ہیں اور گاؤں بھی میری ہی زمین پر آباد ہے اور وہ جو.....“

دوسرے مسافر کی بات ختم ہونے سے پہلے ہی بڑی بڑی مونچھوں والا ایک فربہ اندام شخص آکر ان دونوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ وہ تالاب کنارے دو موٹے موٹے بیڑوں کے پیچھے کھڑا ہوا دوسرے مسافر کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے ان دونوں کو سر سے پاؤں تک گھور کر دیکھا پھر دوسرے مسافر کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔ ”آپ کیا کہہ رہے تھے؟“

”میں کہہ رہا تھا کہ یہ باغ، یہ تالاب، یہ عمارت سبھی کچھ میرا ہے۔“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

”آپ کا اسم شریف؟“ اس آدمی نے پوچھا۔

”سبحان جواردار۔“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔ وہ شخص قہقہہ لگا کر ہنسا پھر اس نے رکھائی سے پوچھا۔ ”جواردار صاحب! آپ کو اپنے والد گرامی کا نام تو یاد ہوگا؟“

”کیوں نہیں؟“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

میرے والد کا نام غلام رحمان جواردار ہے۔“

وہ شخص پھر ہنسا پھر اچانک ہنسی روک کر برہمی سے بولا۔ ”آپ کا دماغ تو عجیب ہے؟“

دوسرا مسافر حیران ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیوں؟“

”مجھے تو ایسا نہیں لگتا کہ آپ کا دماغ صحیح ہے۔“ وہ شخص بولا۔ ”جواردار خاندان کا کوئی گدھا بھی اس گاؤں میں نہیں ہے، آدمی ہوتا تو دور کی بات ہے۔“

”تم جھوٹ کہتے ہو۔“ دوسرے مسافر کو غصہ آ گیا۔

”یہ سب کچھ میرا ہے، سبھی کچھ میرا ہے، تم کہو ہوں؟“ بات جب آپ سے تم تک جا پہنچی تو اس شخص کو بھی غصہ آ گیا۔ ”زبان سنہال کر شریفوں کی طرح بات کیجئے۔ میرا نام سلیمان ملک ہے۔ یہ ارارشی، یہ باغ، یہ تالاب، یہ عمارت اور والاں جو کچھ آپ دیکھ رہے ہیں، سب میرا ہے۔“

”خاموش! دغا باز کہیں کا؟“ وہ شخص غصہ میں غرایا۔

”کیا کہا؟“ دوسرا مسافر آپ سے باہر ہو گیا۔ ”میں اپنی چیز اپنی کہنے سے دغا باز ہو گیا؟“

”میں کہتا ہوں، یہاں سے چلے جاؤ۔“ وہ شخص بولا۔ ”اسی میں تمہاری بھلائی ہے ورنہ مار کھانی پڑے گی اور ہاتھوں میں پتھری بھی لگ سکتی ہے۔“

”تم کیوں کر رہے ہو۔“ دوسرے مسافر نے کہا۔ وہ شخص آگے بڑھ آیا، اس نے دوسرے مسافر کے گال پر ایک تھپڑ جڑ دیا پھر وہ دونوں ایک دوسرے سے ہاتھ پائی کرنے لگے۔ دونوں کو ایک دوسرے سے اچھٹے ہوئے دیکھ کر پہلا مسافر دونوں کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔ سلیمان ملک نے اس کا چہرہ دیکھ کر ہاتھ روک لیا۔

دوسرا مسافر چیخا۔ ”یہ تمام جائیداد میری ہے۔ یہ سبھی کچھ میرا ہے۔“

وہ شخص اسے طمانچہ مارنے کے لیے پھر آگے بڑھا مگر پہلا مسافر درمیان میں آ گیا۔

دونوں کی چیخ پکار سن کر کچھ لوگ ہاتھوں میں لاشیاں لیے آپہنچے۔ ایک آدمی نے آگے بڑھ کر اس شخص سے کہا۔ ”بڑے صاحب! میں آپ کی آواز سن کر بھاگتا ہوا آیا ہوں، کیا بات ہے؟“

سلیمان ملک نے دوسرے مسافر کی طرف انگلی سے

ساسوں کے جدید لطیفے

☆ میرے لیے یہ جاننا آسان ہے کہ ساس صاحبہ کب تشریف لائے والی ہیں..... تب گھر میں چوہے ازخود چوہے دان میں جا گھٹتے ہیں۔

☆ میں گزشتہ ۱۸ ماہ سے اپنی ساس سے نہیں بولی..... دراصل میں قطع کلاہی نہیں کرنا چاہتی۔

☆ میں ابھی ایک زبردست تفریحی دورے سے پلٹا ہوں..... وہ یوں کہ اپنی ساس کو اسٹیشن چھوڑ آیا۔

☆ ساس صاحبہ نے مجھے کہا ”ایک دن میں تمہاری قبر پر ناچوں گی۔“ میں نے جواب دیا ”بے شک ناچے گا، میری قبر تو سمندر میں بنے گی۔“

☆ ایک بلب تبدیل کرنے کے لیے کتنی ساسوں کی ضرورت ہوتی ہے؟

صرف ایک! وہ بلب اٹھا کر کھڑی ہوگی اور انتظار کرے گی کہ دنیا اس کے گرد گھومنے لگے۔

☆ میری ساس اور میں ۲۰ سال تک خوش و خرم رہے..... پھر ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی۔

”تو پھر بیٹھ جائیے۔“ سلیمان ملک نے کہا۔

”نہیں، مجھے کھڑے ہو کر گانا زیادہ اچھا لگتا ہے۔“

درویش گانے لگا۔

اے انسان! اے میرے بھائی! اپنی عقل سے کام لو

تمہیں حال ہی میں انمول چیزیں مل جائیں گی

جنت تو مرنے کے بعد ملے گی

یہ سن کر کسی کا دل خوش نہیں ہوتا

لالن کا کہنا ہے باقی کے لالچ میں

وہ کون ہے جس نے اس دنیا میں

نقد حاصل کرنا چھوڑ دیا ہے۔

گرمی کی اس دھلتی ہوئی دوپہر میں دھوپ کی حدت

نغمے کی آواز میں تحلیل ہو گئی اور اس کی تنگی لوگوں کے

دلوں میں لرزش پیدا کرنے لگی۔ بہت سارے لوگ جمع ہو

گئے۔ کتنے ہی لوگ سُرور کی تنگی سے مسحور ہو کر اپنے

کام دھندے چھوڑ کر وہاں آ گئے تھے اور سب نغمہ سن کر

مہبوت تھے۔

گانا ختم ہونے کے بعد سلیمان ملک نے پوچھا۔

”معاف کیجئے گا جناب! آپ کا نام؟“

”میرا نام لالن شاہ ہے۔“ پہلے مسافر نے جواب

اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”اس درویش کے پیچھے یہ جو ایک

آدمی کھڑا ہے، یہ جواردار نہ تو اردار، اس سالے کا یہاں

کسی نے نام نہیں سنا، کہتا ہے کہ یہ زمین جائیدا، باغ،

تالاب اور مکان اس کا ہے اس کی یہ ہمت؟“

”حکم دیجئے۔“ میں ابھی اس سالے کا سر دو ٹکڑے کر

دوں گا۔“ لکھ بند آدمی بولا۔

دوسرے مسافر نے حالات کی نزاکت سمجھتے ہوئے

خاموشی اختیار کر لی۔ پہلا مسافر آگے بڑھ آیا ”یہ میرے

ہم سفر ہیں۔ زمین، جائیدا کا جھگڑا تو عدالت کے ذریعے

ہی طے ہو سکتا ہے، اس طرح قضیہ کرنا مناسب نہیں۔ میں

انہیں اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں لیکن اس سے پہلے آپ

سب کو ایک گانا سنانا چاہتا ہوں۔“

سلیمان ملک کا غصہ فرو ہو گیا۔ اس نے کہا۔ ”جناب

درویش صاحب! آپ کو دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ آپ

بہت تھکے ہوئے ہیں۔ پہلے ناریل کا پانی پی لیجئے۔ پھر گانا

سنانے گا۔“

”نہیں بھائی میں بالکل تھکا ہوا نہیں ہوں۔“ پہلے

مسافر نے جواب دیا۔ ”مجھے بہت کم بھوک اور پیاس

لگتی ہے۔“

”آپ کا نام لالہ فقیر ہے؟“ ایک آدمی نے حیرت سے پوچھا۔

”کشمیا لالہ فقیر؟“ دوسرے نے تصدیق چاہی۔

”ہاں بھائی!“ پہلے مسافر نے جواب دیا۔

لالہ فقیر کا نام سن کر تمام لوگوں میں ہل چل سی مچ گئی۔ ایک آدمی چیختا ہوا گاؤں کی طرف دوڑنے لگا۔ ”بھائیو! سنو، لالہ فقیر واپس آگئے ہیں، لالہ فقیر واپس آگئے ہیں۔ لوگو! جلدی سے یہاں آ جاؤ۔ یہاں آ کر گانا سنو، آؤ، اپنی آنکھیں کھنڈی کرلو، آؤ، جلدی آؤ۔“

ایک آدمی لالہ کے قریب آ کر بولا۔ ”میں نے اپنے دادا سے آپ کا نام سنا تھا اور میرے دادا نے اپنے دادا سے آپ کا نام سنا تھا۔ ان سے میں نے آپ کا کلام بھی سنا تھا۔ اب ہم آپ کو یہاں سے نہیں جانے دیں گے۔ جہاں ہم کھڑے ہیں، یہاں جگہ بہت کم ہے۔ آپ گاؤں کے میدان میں چلیے۔ وہاں بہت زیادہ لوگ جمع ہو سکتے ہیں۔“

”چلیے۔“ پہلے مسافر نے کہا۔
لوگوں نے اسے کندھوں پر اٹھالیا۔ وہ منت سماجت کرتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات پر دھیان نہیں دیا۔ لوگ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا شاعر، ان کا مطرب پیدل چلے۔ چاروں طرف سے لوگ جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ لالہ شاہ نے کہا۔ ”آپ لوگ میرے ہم سفر کا خیال رکھیے گا، وہ کہیں اس بیٹھریں پس نہ جائے۔“

لوگوں نے دوسرے مسافر کی طرف دیکھا۔ وہ پہلے مسافر کے قریب ہی کھڑا تھا۔
ہزاروں آدمی دور دراز کی آبادیوں سے آتے رہے۔ سبھی مگن تھے اور بلند آواز میں اس امر پر خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ لالہ فقیر لوٹ آیا ہے۔
گائے کی محفل دیر تک جی رہی۔ لالہ فقیر گاتا رہا۔ لوگ جھومتے رہے۔ موسیقی فضا میں ابھرتی رہی۔ لوگ

خاموش ہو گئے۔ ہر طرف سکوت چھا گیا۔ موسیقی اور شراب میں فرق ہی کتنا ہے؟

محفل کے بعد دوسرے مسافر نے پہلے کو مخاطب کیا۔ ”شاعر بھائی!“

”کیا ہے جناب؟“

میں تو سمجھا تھا کہ یہاں آ کر تمہیں قیدی بننا پڑے گا۔ دوسرے مسافر نے کہا۔

”یہ ممکن نہیں ہے۔“ پہلا مسافر بولا۔ ”میں وہاں سے یہ کہہ کر آیا ہوں کہ یہاں ایک دن سے زیادہ نہیں رکوں گا۔ آج صبح ہی مجھے اپنے ٹھکانے پہنچنا ہے۔ ایک دن کے لیے باہر نکلا تھا۔ اب صبح کا ستارہ طلوع ہو گیا ہے۔ چلو، ہم دونوں ہواؤں میں تحلیل ہو جائیں۔“

”میں بھی ایک ہی دن کی چھٹی لے کر دنیا دیکھنے آیا تھا۔“ دوسرے مسافر نے کہا۔

”تم نے کیا دیکھا؟“

”مجھے یہاں کوئی بھی نہیں پہچانتا، کوئی میرا نام تک نہیں جانتا۔“ دوسرے مسافر نے جواب دیا۔

”اور کیا دیکھا؟“

”اور تو میں نے کچھ نہیں دیکھا۔“ دوسرے نے جواب دیا۔

”تم میں یہی سب سے بڑی خرابی ہے۔“

”کیا؟“ دوسرے مسافر نے پوچھا۔

”تم نے اور کچھ نہیں دیکھا؟“ پہلے مسافر نے سوال کیا۔

”کیا دیکھنے کی بات پوچھ رہے ہو؟“ دوسرا مسافر بولا۔

پہلے مسافر نے غور سے اس کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا تم نے یہ نہیں دیکھا کہ ایک دن دنیا میں تمہارے پاس کتنا کچھ تھا اور تمہارے برعکس میرے پاس کچھ نہیں تھا لیکن آج میرے پاس بہت کچھ ہے، تمہارے پاس کچھ بھی نہیں۔“

خدا کے کھیل ہوتے ہیں خدائے

بٹوے میں پڑا خط

ایک نوجوان کے تئیس سال سے بچھڑوں کو بڑے انوکھے انداز میں ملا دیا۔ یادگار سچا واقعہ

اس کے باوجود وہ اسے سدا چاہتی رہے گی۔ آخر میں حنا کے دستخط پڑے جاتے تھے۔

خط کی تحریر ریفریب اور دل چھو لینے والی تھی لیکن سوائے نام کے یہ جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا کہ اس اچھوتے سندھیے کا مالک کون ہے؟ چنانچہ میں نے یہ سوچ کر سرکاری شعبہ معلومات فون کیا کہ شاید وہاں سے کوئی مدد مل سکے۔

میں نے آپریٹر کو بتایا ”میری ایک غیر معمولی درخواست ہے۔ مجھے ایک بٹوہ ملا ہے۔ اس میں موجود خط میں ایک پتا درج ہے۔ کیا مجھے اس پتے سے وابستہ ٹیلی فون مل سکتا ہے؟“

تھوڑی دیر بعد آپریٹر نے مجھے اپنی خاتون سپروائزر سے ملا دیا۔ موصوفہ نہ بتایا: ”ہمیں اس پتے کا ٹیلی فون مل گیا ہے لیکن ہم آپ کو نمبر نہیں دے سکتے۔ البتہ میں اس نمبر پر فون کر کے انھیں صورت حال بتاتی ہوں۔ اگر پتے کے کسی رہائشی نے آپ سے گفتگو کرنا چاہی، تو میں رابطہ کر دوں گی۔“ میں نے ہامی بھری۔

یہ جنوری ۱۹۸۵ء کی بات ہے، میں ایک ٹھٹھری شام نیویارک کی گلیوں سے

گزرتا گھر کی طرف رواں دواں تھا۔ اچانک میرے قدموں تلے کوئی ابھری شے آ گئی۔ دیکھا تو ایک بٹوہ پایا۔ اس میں صرف تین ڈالر تھے اور ایک بوسیدہ سا خط بھی لگتا تھا کہ بٹوے والے نے کئی برس سے اسے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ بٹوے میں کسی قسم کی شافٹی نشانی موجود نہ تھی۔

میں نے خط دیکھا بھالا تو الفاظ تقریباً مٹ چکے تھے۔ بس خط میں واپسی کا پتا کچھ پڑھا جاتا تھا اور تاریخ بھی اسی سے افشا ہوا کہ یہ خط ۱۹۲۳ء میں لکھا گیا تھا۔ گویا اسے وجود میں آنے سے ۶۰ برس بیت چکے تھے۔ میں نے پھر اسے آلہ ملک کی مدد سے پڑھا تا کہ لکھنے والے کا کوئی سراغ ڈھونڈ سکوں۔ یوں میں تقریباً ساڑھا خط پڑھنے میں کامیاب ہو گیا۔ آغاز میں ”پیارے جان“ درج تھا۔ پھر خط لکھنے والی خاتون نے بڑے نفیس و نازک انداز میں جان نائیک کو مطلع کیا کہ ماں نے اسے منع کر دیا ہے کہ وہ اس سے نہ ملے۔

ایک منٹ بعد سپر وائزر دوبارہ فون پر آئی اور بتایا کہ ایک خاتون آپ سے بات کرنا چاہتی ہے۔

میں نے خاتون سے دریافت کیا کہ کیا وہ حناہ کو جانتی ہے؟ اس نے کہا ”ہاں جانتی ہوں۔ ہم نے حناہ خاندان ہی سے یہ گھر خریدا ہے۔“

میں نے پوچھا: ”آپ بتا سکتی ہیں کہ حناہ خاندان اب کہاں مقیم ہے؟“

”جی نہیں، میں نہیں جانتی البتہ کئی سال قبل حناہ نے نرسنگ ہوم میں اپنی ماں کو داخل کرایا تھا۔ ممکن ہے کہ ہوم والے آپ کو کچھ بتائیں۔“

خاتون نے پھر مجھے نرسنگ ہوم کا نام اور ٹیلی فون نمبر بتایا۔ وہاں رابطہ کرنے سے معلوم ہوا کہ حناہ کی والدہ چل بسی ہیں۔ ہوم استقبالیہ کلرک نے پھر مجھے ایک ٹیلی فون نمبر دیا جہاں اس کے خیال میں حناہ مل سکتی تھی۔

اب میں نے وہاں فون کیا۔ فون اٹھانے والی نے بتایا کہ اب حناہ خود ایک نرسنگ ہوم میں مقیم ہے۔ اس نے مجھے نرسنگ ہوم کا نمبر دے دیا۔ یہ نیا نمبر ملایا تو جواب ملا ”جی ہاں، حناہ اسی ہوم میں رہتی ہے۔“

رات کے ۹ بجے تھے لیکن میں نے خواہش ظاہر کی کہ کیا میں حناہ سے مل سکتا ہوں؟ معلوم ہوا ”وہ نوساڑھے نو بجے سو جاتی ہے۔ تاہم ممکن ہے کہ وہ ہال میں بیٹھی ٹی وی دیکھ رہی ہو۔ آپ دیکھ لیں۔“

میں نے کارڈنگی اور اپنے گھر کے قریب واقع نرسنگ ہوم پہنچ گیا۔ ہوم کا ایک ملازم مجھے لیے تیسری منزل پہنچا جہاں ایک کمرے میں حناہ رہتی تھی۔ معلوم ہوا کہ واقعی وہ تیسری منزل کے ہال میں بیٹھی ٹیلی ویژن دیکھ رہی ہے۔

اب مجھے ہال کا راستہ دکھایا گیا۔ حناہ سفید بالوں، دکش مسکراہٹ اور دوستانہ آنکھوں والی بوڑھی خاتون تھیں۔ میں نے اسے بٹوے کے متعلق بتایا اور پھر خط دکھایا۔ خط دیکھتے ہی حیرت کے مارے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اور ان میں نمی تیرنے لگی۔

حناہ نے پھر گہرا سانس لیا اور بھرائی آواز میں بولنے لگی

”جان کے نام یہ میرا آخری خط تھا۔ میں اسے بہت چاہتی اور اس سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ لیکن تب صرف ۱۶ برس کی تھی۔ چنانچہ میری ماں مجھے تھی کہ لڑکیاں نااہلی کی اس عمر میں صحیح فیصلہ نہیں کرتیں۔ یوں میں نے مجبورا جان سے ناتا توڑ دیا۔ اب تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ کتنا خوبصورت تھا! ادا کا رستین کو زری لگتا تھا۔“

اس بات پر ہم دونوں ہنس پڑے۔ حناہ نے پھر مزید بتایا: ”اس کا اصل نام مائیکل گولڈسٹین تھا۔ اگر وہ تمہیں مل جائے تو اسے بتانا کہ میں آج بھی اکثر اس کے متعلق سوچتی ہوں۔ میں نے اب تک شادی بھی نہیں کی۔“ یہ کہتے ہوئے خاتون کی آنکھوں میں آنسو جھلमानے لگے۔ وہ پھر بولی: ”شاید وجہ یہ ہے کہ جان کے علاوہ کوئی میرے من میں نہیں بس سکا۔“

میں نے حناہ کا شکریہ ادا کیا، خدا حافظ کہا اور لفٹ کی طرف بڑھ گیا۔ لفٹ میں اتفاقاً وہی ملازم مل گیا جو مجھے خاتون کے پاس لے گیا تھا۔ اسے پہلے میں مختصر ساری داستان سنا چکا تھا۔ لہذا مجھے دیکھتے ہی اس نے سوال کیا ”آپ کو مطلوبہ معلومات مل گئیں؟“

”نہیں، لیکن مجھے کم از کم خط لکھنے والے کا اصل نام ضرور معلوم ہو گیا۔ لیکن اب مجھ میں اس کا پیچھا کرنے کی ہمت نہیں۔ میں شام سے بٹوے کے مالک کی تلاش میں ہوں اور اب خاصا تھک چکا۔“

بات کرتے ہوئے میں نے جب سے سرخ بٹوہ نکالا اور ملازم کو دکھایا۔ بٹوے کے گرد سنہرا حاشیہ موجود تھا۔ ملازم نے بٹوہ الٹا پلٹا اور پھر بولا ”ارے، میں جانتا ہوں کہ یہ کس کا ہے۔ یہ مسٹر گولڈسٹین کا ہے۔ اس سے اکثر یہ کہو جاتا ہے۔“

”میں نے یہ سنا تو خوشی سے چلا اٹھا“ کیا؟ مسٹر گولڈسٹین؟ تم انہیں جانتے ہو؟“

”بھئی وہ بھی اسی نرسنگ ہوم کی آٹھویں منزل پر مقیم ہے۔ یہ یقیناً اسی کا بٹوہ ہے۔ وہ اکثر باہر جانے تو اسے کم کر بیٹھتا ہے۔“

اب میں نے ملازم سے کہا کہ وہ مجھے اس کے پاس

لے چلا۔ چنانچہ ہم آٹھویں منزل پہ پہنچے۔ میں دعا مانگتے لگا کہ وہ اچھی جاگ رہا ہو۔ وہاں موجود نرس نے بتایا کہ مسٹر گولڈسٹین ابھی ہال میں ہیں۔ دراصل سونے سے قبل اسے مطلع کرنا پڑا تھا۔ ہم ہال میں پہنچے، بوڑھا آدمی وہاں تنہا بیٹھا کسی کتاب میں کھویا ہوا تھا۔ ملازم نے اس سے دریافت کیا ”آپ کا بٹوہ کہاں ہے؟“

مسٹر گولڈسٹین نے نظر اٹھائی، پتلون کی پشت ٹٹولی اور پھر کہا ”افو، کم بخت پھر کہیں گر گیا۔“

اسی وقت موصوف کی نظر میرے ہاتھ میں پڑے بٹوے پر پڑی۔ وہ مسکرایا اور بولا ”شکر کہ یہ مل گیا۔ یقیناً یہ پھر کو یہ گر گیا ہو گا۔ اب میں تمہیں انعام دینا چاہتا ہوں۔“ یہ کہہ اس نے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

میں فوراً بول اٹھا ”نہیں نہیں، اس کی ضرورت نہیں بلکہ مجھے ایک ضروری بات بتانی ہے۔ میں نے بٹوے میں موجود خط پڑھ لیا ہے تاکہ مالک کی بابت کچھ جان سکوں۔“

مائیکل گولڈسٹین کے چہرے پر پچھلی مسکراہٹ کا فور ہو گئی۔ وہ مردہ آواز میں بولا ”اوہ! تو تم نے خط پڑھ لیا۔“

”خط ہی نہیں پڑھا، بلکہ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ حناہ کہاں ہے۔“

یہ سن کر وہ بھونچکا رہ گیا پھر بے تابی سے بولا ”حناہ؟ تم جانتے ہو کہ وہ کہاں ہے؟ وہ کسی ہے؟ کہاں رہتی ہے؟“ میں ہنچکیا۔

اس نے اصرار کیا ”بتاؤ، وہ کہاں ہے؟“

”وہ اچھی ہے اور اب بھی اس کی کشش ماند نہیں پڑی۔“

مسٹر گولڈسٹین نے میرا ہاتھ پکڑا اور التماس کرتے ہوئے بولا ”مجھے اس کا پتا دو، میں پہلی فرصت میں حناہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ شاید تم ہمارے ماضی سے واقف ہو چکے۔ جب اس کا خط ملا، تو میری دنیا اندھیر ہو گئی۔ میں آج تک اس کا منتظر ہوں۔ حناہ کے علاوہ کوئی اور لڑکی میرے دل میں بس نہ سکی۔“

میں نے یہ سنا تو حیران رہ گیا۔ جب حواس بحال ہوئے تو اسے کہا ”مائیکل، میرے ساتھ آؤ۔“

ہم تینوں بذریعہ لفٹ تیسری منزل پر پہنچے۔ پھر اس

کے ہال کی طرف ہو لیے۔ وہاں حناہ بیٹھی بدستور ٹی وی دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں دروازے پر کھڑے ہو گئے، ملازم پہلے اس کے پاس پہنچا۔

”حناہ! وہ نرم لہجے میں بولا: ”تم اس آدمی کو جانتی ہو؟“ ملازم نے دروازے کی سمت اشارہ کیا جہاں ہم دونوں استادہ تھے۔

خاتون نے عینک درست کی، پھر غور سے ہمیں دیکھنے لگی۔ ”حناہ! یہ میں ہوں مائیکل گولڈسٹین! تمہیں کچھ یاد آیا؟“

مائیکل! یہ تم ہو؟ تم مائیکل!.....“

وہ ہولے ہولے چلتا اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ چند لمحے وہ ایک دوسرے کو تنگے رہے پھر ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ تھوڑی دیر بعد وہ ہاتھوں میں ہاتھ دیے باتوں میں مصروف تھے۔ میں ملازم کے ساتھ خاموشی سے باہر نکل آیا۔

لفٹ کی طرف بڑھتے ہوئے میں گویا ہوا ”دیکھا خدا کیونکر اپنی کرشمہ سازی دکھاتا ہے۔ سچ ہے وہ جو چاہے اسے کرنے پر قادر ہے۔“

تین دن بعد جب نرسنگ ہوم کے ناظم کا فون آیا۔ کہنے لگا: ”کیا آپ اس اتوار شادی کی ایک تقریب میں شرکت کرنے آ سکتے ہیں؟“

وہ پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر بول اٹھا ”جی ہاں، مائیکل گولڈسٹین اور حناہ کا بیاہ ہو رہا ہے۔“

وہ بڑی سادہ مگر پر وقار تقریب تھی۔ پیارو محبت کی پھوار میں بی بی اس محفل میں نرسنگ ہوم کے کئی ملین شریک ہوئے۔ حناہ نے سفید جوڑا پہنا جس میں وہ پری لگتی تھی۔ مائیکل نیلا سوٹ زیب تن کر کے بڑا جہیز نظر آیا۔

شادی کے بعد وہ نرسنگ ہوم کے ایک کمرے میں بس گئے۔ اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ایک ۷۸ سالہ دولہا اور ۷۶ سالہ دلہن کیونکر نوجوان جوڑے کی طرح چہلیں کرتے ہیں تو انہیں دیکھ لیجیے۔

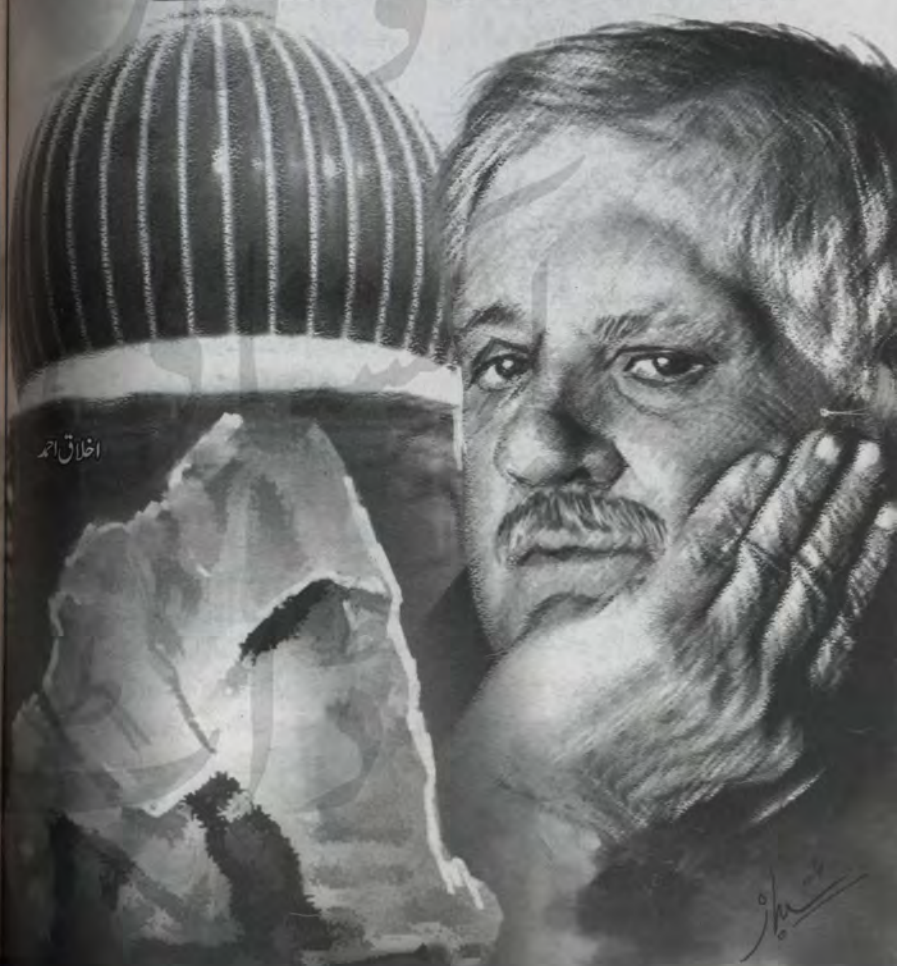
یہ اس عشق کا بہترین اختتام تھا جو تقریباً ۶۰ برس چلا

اور محبت کی نئی داستان رقم کر گیا۔

اردو کے ایک جدت طراز، شگفتہ بیان داستان گو کی تحریر

باؤ و وارث کی گمشدگی

اپنوں کی محبت میں گرفتار شخص کا قصہ
پیاروں کے رویوں نے اُس کو سب کچھ چھوڑنے پر مجبور کیا تھا



اخلاق احمد

حقیقاتی رپورٹ سے اقتباسات
باؤ و وارث ایک روز اچانک گم ہو گیا۔

ایک عام سے دن، وہ ایک عام سی زندگی گزارتے تھے۔ اچانک غائب ہو گیا۔ اس کی بیوی، اس کے بچے، اُس رات اُس کا انتظار کرتے رہے، اگلی شام تک اس کی راہ دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے مقامی پولیس اسٹیشن میں اُس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوا دی۔

دو چار روز گھر میں میلا سا لگا رہا۔ عزیز رشتے دار اوپر کے بعد آنا شروع ہو جاتے۔ رات گئے تک گھر خالی، خدشات اور امیدوں سے گونجتا رہتا۔ مہمان کی کڑبڑ بامے کے بعد روٹیاں اور نہاری منگوائی جاتی۔ دودھ دراز علاقوں سے آنے والے رات کو وہیں رک جاتے اور ناشتے کے وقت پاپے چائے میں ڈبو ڈبو کر کھاتے۔

پریشانی کے ابتدائی دنوں میں باؤ و وارث کی بیزی کی دکان بند رہی۔ چوتھے دن، باؤ و وارث کے بیٹے ایاس نے منہ اندھیرے بیزی منڈی کا سفر اختیار کیا۔ اپنے باپ کی طرح اس نے بیزی خریدی اور سوزوکی میں لدوا کر دکان جا پہنچا۔ صبح ساڑھے سات بجے وہ بیزی دھو کر، چھانٹ کر، اور گاہکوں کو خوش آمدید کہنے کے لیے تیار ہو چکا تھا۔

چھٹے دن اس کی بہن ریحانہ نے کالج جانا شروع کر دیا۔

آٹھویں دن باؤ و وارث کی بیوی نے کسی چھوٹی سی بات پر اپنی نند کو ایسی تنگی نکلی گالیاں دیں کہ گرم روٹیوں اور نہاری کی مختصر عورتیں اپنے بچے سمیٹ کر فرار ہونے لگیں۔

باؤ و وارث بدستور گرم رہا۔

کسی کے پاس کوئی سراغ نہ تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کہاں چلا گیا ہے۔ اس کا بیٹا ایدھی کے مُردہ خانہ میں ساری لاشیں دیکھ کر آیا۔ سارے اسپتال، سارے

تھانے، سارے دوستوں کے گھر چھان مارے گئے۔ گزشتہ ایک ماہ کے دوران باؤ و وارث کی ساری مصروفیات، اس کی سادہ سی زندگی کے سارے واقعات، ایک ایک تفصیل غور و فکر کے محذب عد سے دیکھ لی گئی۔

گمشدگی سے ایک ہفتہ قبل باؤ و وارث کے گھر ایک عجیب واقعہ ضرور ہوا تھا مگر وہ بھی غیر اہم سا تھا، گمشدگی سے اس واقع کا کیا تعلق ہو سکتا تھا۔

باؤ و وارث کے گھر ذہنی کی واردات ہوئی تھی۔ میں شاید غلط کہہ گیا، باؤ و وارث کے گھر ذہنی کی ایک ناکام واردات ہوئی تھی۔ دو نو عمر لڑکوں نے، جن کے پاس اسلحہ تھا، گھر میں گھس کر سب کو ریگال بنا کر ذہنی کی کوشش کی تھی۔ کراچی میں تو یہ روزمرہ کی بات ہے۔

اب یہ ان نو عمر ڈاکوؤں کی بد قسمتی تھی کہ اسی وقت باؤ و وارث کے ایک دوست، فوج کے ریٹائرڈ حوالدار فقیر محمد نے گھر کے دروازے پر دستک دی۔ کوئی جواب نہ ملا تو اس نے دروازہ دھڑ دھڑایا اور باؤ و وارث کو آواز دیں۔ دروازے پر موٹر سائیکل کھڑی تھی جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ گھر میں کوئی مہمان آیا ہے۔ گزرنے والے دو چار محلے داروں کو بھی تشویش ہوئی۔ ریٹائرڈ حوالدار فقیر محمد اپنی بندوق نکال لایا۔ کسی نے پولیس کو فون کر دیا۔ پانچ منٹ میں موبائل آگئی۔ پولیس والے دروازہ توڑ کر اندر گھسے اور دونوں لڑکوں کو گھونٹے اور تھنڈے مارتے ہوئے باہر لے آئے۔ ذرا سی دیر میں سارا کھیل ختم ہو گیا۔

محلے والوں نے باؤ و وارث کو گلے سے لگایا۔ باؤ و وارث کی بیوی نے شام کو میلا دشریف کرایا اور آگے پیچھے کی چاروں کلیوں کے ایک ایک گھر میں اپنے ہاتھوں سے قلاقند کے چھوٹے والے ڈبے تقسیم کر کے آئی۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ ایک ہفتے بعد باؤ و وارث کو گم ہو جاتا ہے۔

بعض جاسوس ٹائپ رشتے داروں نے جوہر

خاندان میں موجود ہوتے ہیں، باؤ وارث کی گمشدگی کے بعد طرح طرح کے نظریات پیش کیے۔ دوسری شادی کے لیے غائب ہو جانے کا نظریہ، کسی کاروباری پریشانی کے باعث قرض دینے والے کا سود خوروں کے خوف سے بھاگ جانے کا نظریہ، مگر باؤ وارث اتنا پیارا، اتنا سادہ، اتنا غیر اہم اور اتنا بے ضرر آدمی تھا کہ کسی کو ان باتوں پر یقین نہیں آیا۔

ڈھائی ماہ بعد مقامی تھانے کے اے ایس آئی ناصر خان نے باؤ وارث کی گمشدگی کے بارے میں اپنی تحقیقات پر مبنی پانچ صفحے کی رپورٹ داخل دفتر کی جس پر متعلقہ لوگوں کے حلفی بیانات کے علاوہ پولیس تحقیقات کے نتائج بھی شامل تھے۔ رپورٹ کی افسانوی زبان انچارج صاحب نے سخت ناپسند فرمائی اور اے ایس آئی ناصر خان کو زبانی تنبیہ کی جس نے پولیس کی نوکری حاصل کرنے کی خاطر خود کو ایم اے پاس نہیں بلکہ انٹر پاس ثابت کیا تھا۔

تحقیقاتی رپورٹ سے جستہ جستہ اقتباسات

اے ایس آئی ناصر خان کی تحقیقات پر مبنی ابتدائیہ میں علاقے کے متعدد افراد سے ملنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ باؤ وارث، جس کا پورا نام بابو محمد وارث تھا، ایک شریف، باکردار اور محنتی آدمی تھا۔ تیس پینتیس سال قبل وہ سرگودھا سے کراچی آیا تھا پھر بیہوش کا ہو کر رہ گیا۔ تقریباً پچیس برس قبل اس نے سبزی کا ٹھیلہ لگانا شروع کیا اور آخر سبزی کی ایک بڑی دکان بنائی۔ پورا محلہ اسی سے سبزی خریدتا تھا۔ باؤ وارث ایک بے حوصلہ آدمی تھا۔ اس کے گاہک اس کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ حلال کی روزی کمانے کے سلسلے میں اس کے اپنے نظریات تھے جن پر وہ ساری زندگی بے حد سختی سے کار بند رہا۔ پورے علاقے میں اس کی کسی سے دشمنی نہیں تھی، گمشدگی سے ایک ہفتہ قبل دو

لڑکوں نے اس کے گھر میں ذکیٹی کی ناکام کوشش کی جسے پولیس موبائل نمبر ۲۶۲ نے ناکام بنا دیا۔ وارث ڈاکو گرفتار کر لیے گئے۔ ان کا مقدمہ چل رہا ہے اور اس کے وارث ان کی ضمانت کرا چکے ہیں۔ باؤ وارث کی رحم دلی اور نیکی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے ڈاکوؤں کی گرفتاری کے وقت بھی پولیس والوں سے درخواست کی کہ انہیں مارا پیٹا نہ جائے بلکہ لاک آپ میں ڈال دیا جائے۔ باؤ وارث کے بھائی قریبی رشتہ دار اب بھی سرگودھا میں رہتے ہیں۔ گزشتہ تیس برسوں کے دوران اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں رہا۔ اس نے اپنے بیٹے اور بیٹی کی مشکلیں بھی علاقے ہی میں طے کی تھیں۔ باؤ وارث کو تلاش کرنے کے لیے میں خود پولیس پارٹی لے کر متعدد مقامات پر گیا لیکن اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔ نہ جانے اسے زمین لگئی یا آسمان نکل گیا۔ گمشدگی کے دن اس نے حسب معمول دکان کھولی اور دوپہر تک سبزی فروخت کرنے میں مصروف رہا۔ ظہر کی نماز کے وقت اس نے حسب معمولی دکان بند کی یعنی کھلے شرٹ پٹاٹ کا ایک پردہ لٹا دیا۔ اس نے مقامی مسجد میں نماز ادا کی۔ اس کے پرانے دوست ریٹائرڈ حوالدار فقیر محمد نے اسے ایک ٹکڑے کر چالیس منٹ تک دیکھا تھا۔ اس وقت وہ دکان کی طرف جا رہا تھا لیکن اس کے بعد کچھ پتا نہیں چلا کہ وہ کہاں گیا۔ دکان پر نہیں پہنچا، گھر بھی نہیں گیا۔ اسے بڑک پر کوئی رکشا نیکیس روکتے بھی نہیں دیکھا گیا۔ اس ضمن میں اس کے قریبی لوگوں سے میں نے تفصیلی بیانات لیے ہیں۔ کسی بیان سے اس کی گمشدگی کے متعلق کا کوئی پہلو ملتا ہوتا نظر نہیں آتا۔

ذیل میں بیانات حلفی کے اقتباسات ہیں جنہیں میں نے حتی الامکان اسی زبان میں تحریر کیا ہے جس میں ریٹائرڈ کرائے گئے تھے تاکہ اگر تحقیقات کا دائرہ وسیع ہو تو میرے بعد تحقیق کرنے والوں کو آسانی ہو۔

باؤ وارث کی بیوی سمات فرحانہ بیگم کا بیان حلفی

مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ پولیس تم ہو کہ سمات فرحانہ بیگم یہاں کچھ دیر دو پچا منہ پر رکھ رہی تھی (میں تو سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی ہوں۔ ہاتھ بھی چھوڑ کر نہیں گیا۔ وہ جہاں بھی جاتا تھا، بتا کر جاتا تھا۔ اتنا پیارا آدمی تھا انکسٹر صاحب! میں تمہیں کیا بتاؤں؟ ہر کسی سے پیار کرنا، ہر کسی کا خیال رکھنا، ہر کسی کی غیبتوں میں شریک ہونا۔ اتنی باتیں ہیں، میں دو مہینے بولے جا رہی ہوں اور اس کی باتیں ہیں کہ ختم ہی نہیں ہوئیں۔ ایک کے بعد دوسری بات یاد آتی جاتی ہے۔ باؤ میرے سامنے ہوتا تھا تو میں اسے یوں ہی سمجھتی تھی۔ اب سوچتی ہوں، میں نے اس کے پاؤں دھو دھو کر رکھیں نہیں دیے۔ مجھے فلمیں دیکھنے کا بڑا شوق تھا۔ کئی دن کئی سال پہلے وہ میرے لیے وی سی آخر پد کر دیا اور میرے سامنے رکھ کر بولا، تجھے پتا ہے، میں فلمی کلاؤں کے خلاف ہوں، نمازی آدمی ہوں، پر یہ میں نے شوق کے لیے خود لے کر آیا ہوں۔ تیرا بڑا حق ہے مجھ پر۔ جا، عیش کر، تیرے گناہ میں سنبھال لوں گا۔ یہاں سمات فرحانہ بیگم نے دوبارہ منہ پر دو پچا رکھ کر وہ شروع کیا اور دیر تک روتی رہی) کبھی کبھی میں اس سے لڑتی تھی۔ وہ جواب میں بھی اونچی آواز سے بھی نہیں بولتا تھا۔ محلے والوں نے بھی اس کی آواز نہیں سنی، سب میری ہی آواز سنتے تھے۔ میری پڑوتیں کہتی تھیں، ہائی قسمت والی ہے تو، مارنا تو ڈر کی بات ہے، وہ تجھے ڈانٹتے نہیں۔ انجی جس دن وہ ڈاکو ہمارے گھر میں گئے تھے، تمہیں پتا ہے نا ذکیٹی والی بات؟ ان لڑکوں نے پتھول دکھا دکھا کر نہیں بہت ڈرایا۔ بڑی بڑی بری کالیں دیں، ان کے ہاتھ میں پتھول نہ ہوتا تو میں اور میرا بیٹا انہیں چیر کے رکھ دیتے۔ میرے بیٹے الیاس کو اٹھا ہے تم نے۔ جوان خون تو ہوتا ہی گرم ہے۔ پر باؤ نے ہمیں قایم نہیں رکھا۔ وہ ان ڈاکوؤں کی مٹیں کرتا رہا، ان کے آگے ہاتھ جوڑتا رہا۔ گھر میں تین چار ہزار روپے تھے، تھوڑا سا زور تھا جو بیٹی کی شادی کے لیے بچا

کر رکھا ہوا تھا۔ باؤ ان سے کہتا رہا کہ بیٹا! ہمارے پاس کیا ہے، غریب لوگ ہیں، یہ تھوڑا بہت سامان ہے، یہ لے جاؤ، پر دیکھو، گولی نہ چلانا۔ اتنی عاجزی سے وہ گڑ گڑاتا رہا۔ بعد میں، میں بہت بگڑی بھی کہ ان حرام زادوں کی اتنی منت کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پر باؤ ایسا ہی تھا۔ وہ تو بھائی فقیر محمد دروازے پر آگئے اور انہیں شبہ ہو گیا کہ اندر کوئی نہ کوئی واردات ہو رہی ہے۔ اس کے بعد جو ہوا، وہ تو تم جانتے ہی ہو۔ میں بالکل نہیں جانتی کہ وہ کہاں جاسکتا ہے۔ باؤ کہیں جا ہی نہیں سکتا تھا۔ اتنا پیار کرتا تھا وہ اپنے گھر سے، اپنے بچوں سے، اپنے محلے سے، اس کا کوئی دشمن نہیں تھا جو اسے نقصان پہنچاتا اور کوئی دوست نہیں تھا جس کے پاس جا کر وہ اپنا گھر اٹتے دنوں کے لیے بھول سکتا۔ کوئی کہیں سے باؤ کی خبر لا دے تو میں یہ خوش خبری لانے والے کی نوکرائی بن کے رہوں گی۔ اسے اتنا پیسا دوں گی کہ وہ ساری زندگی بیٹھ کے کھائے گا۔ اللہ کے واسطے، رسول کے واسطے.....

باؤ وارث کے دوست ریٹائرڈ حوالدار فقیر محمد کا بیان حلفی:

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم لوگ کیا تحقیقات کرتے ہو، کس طرح کرتے ہو۔ ایک آدمی غائب ہو جاتا ہے اور تم لوگ بیانات ریکارڈ کرتے پھرتے ہو۔ ایکشن کرو ایکشن۔ ڈائریکٹ کارروائی۔ پولیس کی ٹریننگ فوج کی طرح نہ جانے کیوں نہیں کی جاتی۔ آج ڈیڑھ مہینہ ہونے کو آ رہا ہے، تم ایک گمشدہ آدمی ڈھونڈنے میں ناکام ہو۔ چالاک مجرموں کو کیا پکڑو گے۔ جس دن باؤ وارث کے گھر میں ذکیٹی ہوئی تھی، اگر اس دن میں تمہاری طرح بیانات ریکارڈ کرنے کھڑا ہو جاتا تو مجرم صاف پکڑ لیتے لیکن میں ذرا سی دیر میں سمجھ گیا کہ گھر کے سامنے موٹر سائیکل کھڑی ہوئی ہے اور دروازہ مسلسل کھٹکھٹانے پر کوئی جواب نہیں آ رہا ہے تو کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں نے چار بندے وہیں کھڑے کیے اور دو منٹ

کے اندر اندر اپنے گھر سے لوڈڈ (Loaded) بندوق نکال لایا۔ وہ تو فون کرنے پر تمھارے تمھانے کی موبائل وہاں پہنچ گئی ورنہ میں تو اس دن ان دونوں لونڈوں کو لٹا دیتا۔ یہ تم لوگوں کی دی ہوئی ڈھیل ہے جس کی وجہ سے ۱۸ سال کے چوڑے ہاتھ میں ٹی ٹی لے کر جہاں چاہتے ہیں، گھس جاتے ہیں۔ جو چاہتے ہیں، کوٹ لیتے ہیں۔ اس روز رات کو بھی میں بڑی دیر تک باؤ وارث کے ساتھ رہا۔ میرا ہاتھ وہ۔ بڑا افسردہ تھا اس روز باؤ وارث کہتا تھا، یار فقیر محمد! کیا شریف آدمی کو شرافت کے ساتھ زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے؟ بلکہ ایک تو بڑی عجیب بات پوچھی اس نے۔ کہنے لگا یار فقیر محمد! کیا شریف اور بزدل ہونا کوئی بہت بڑا گناہ ہے؟ میں نے کہا، باؤ وارث، دیکھ، ہم بچپن سے جس کی لالچی، اس کی بھیس سنتے آ رہے ہیں۔ اب کیا کریں، لالچی رکھنے کا زمانہ آ گیا ہے۔ میں تم لوگوں کو کیا بتا سکتا ہوں، وہ کتنا اچھا آدمی تھا۔ ہر دکھ درد میں کام آتا، آگے بڑھ کے کام سنبھالتا۔ میری بیٹی کی شادی میں کھانے کے وقت اس نے سب کو ہٹا کر بریانی کی دیگ پر جگہ سنبھال لی تھی۔ کہتا تھا، یار فقیر محمد! بریانی کی دیگ کو اوپر سے نیچے کاٹنا ہوتا ہے، ورنہ چاول اور مسالہ آپس میں ملتے نہیں ہیں۔ آدھے مہمان سوکھے چاول کھائیں گے اور آدھے تیز مسالے والے تو تجھ سے زیادہ میری بے عزتی ہوگی۔ کیا کیا بتاؤں اس کی باتیں۔ تم لوگوں کے لیے میرا مشورہ یہی ہے کہ بیانات کم ریکارڈ کرو اور کارروائی زیادہ کرو۔ مجھے اور کچھ نہیں کہنا۔

باؤ وارث کی پڑوسن مسماٹ سلمی خاتون کا بیان حلفی: دیکھ بیٹا! میں کوئی لمبی چوڑی بات نہیں کروں گی۔ اللہ جانتا ہے، میں نے باؤ وارث کو ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی کی طرح سمجھا اور اس نے بھی ہمیشہ بڑی بہن کی طرح میری عزت کی۔ وہ بڑا عزت کرنے والا آدمی تھا۔ شادی کے بعد سے یہ دونوں میاں بیوی ہمارے پڑوس میں رہتے ہیں۔ اس کی بیوی ذرا زبان کی تیز

ہے۔ پر بیٹا! پانچوں انگلیاں برابر تو نہیں ہوتیں۔ اس کی بیوی کو سمجھاتی بھی تھی کہ دیکھ، اپنے میاں کی عزت کیا کر۔ پر جوتاناں ہوتا ہے، وہ تو نادان ہی رہتا ہے۔ اللہ جانتا ہے، میں نے کبھی کسی کی غیبت نہیں کی۔ کسی کا برا نہیں چاہا۔ باؤ وارث کے گم ہونے پر، جان بیٹا! ہمارے گھر ایک عرصہ تک ٹی وی نہیں چلا۔ میاں اس کی اتنی عزت کرتا تھا۔ کبھی تمھارے گھر میں اونچے نیچے ہو جاتی، تو تو جانتا ہے بیٹا! کس گھر میں نہیں ہوتی۔ سارے ہی مرد اپنی زبانیں مارتے ہیں، اس میں شرم کی کیا بات ہے۔ تو جب وہ میں وہ مجھے مناتا تو میں اسے باؤ وارث کی مثال دیتی دیکھ، وہ اپنی بیوی کو کیسے پھول کی طرح رکھتا ہے۔ جان بیٹا! میرا میاں کہتا تھا، باؤ وارث تو فرشتے فرشتے۔ میرا فرشتوں سے مقابلہ مت کیا کر۔ اتنا بڑا آدمی تھا باؤ وارث۔ میں تو سوچتی رہتی ہوں کہ وہ کہاں سکتا ہے۔ مجھے تو لگتا ہے، اب اسے شہر مت دینا! بس ایسے ہی خیال آتا ہے مجھے، کہ کہیں وہ اپنی پہلی کی روز روز کی جھک جھک سے تنگ آ کر نہ چلا گیا ہو۔ یہ بات بھی دل کو ٹھکنی نہیں۔ بس ایسے ہی خیال آتا ہے کہ آخر مرد تھا، کیا پتا، کب صبر ختم ہو گیا ہو۔ مردوں کا صبر، تو جانتا ہے، بیٹا! کتنی جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ بدل لیتے ہیں، گھر بدل لیتے ہیں، بڑے بے رحم ہوتے ہیں۔ ایک خیال آتا ہے بیٹا کہ اس نے زندگی بدل لی ہو۔ پر وہ ایسا تھا نہیں۔ وہ مرد ہی دوسرے ہوتے ہیں۔ خیر، میں تو بس اسی کی واپسی کی دعا کرتی ہوں۔ اس کی بیوی جیسی بھی ہے، وہ سہاگہ تو نہ نا اس کا، اور بچوں کا باپ تھا۔ ایسی دیرانی ہے گھر میں جیسے کوئی چڑیل الٹے پاؤں پھر گئی ہو۔ اللہ معافی دے۔ بس میں کچھ زیادہ نہیں جانتی بیٹا!

باؤ وارث کے بیٹے الیس وارث کا بیان حلفی: انسپکٹر صاحب! میں تو اب تک سمجھ ہی نہیں پایا کہ کیا ہوا ہے؟ میرا دل مانتا ہی نہیں کہ باؤ جی نہیں جانتے

تھا۔ پہلے تو سچی بات یہ ہے جی کہ مجھے انخوا کا شبہ تھا۔ میرا خیال تھا کہ ابھی دو چار دن بعد کوئی ٹیلی فون آئے گا اور انخوا کرنے والے دو چار لاکھ روپے مانگیں گے۔ میں تو حساب لگائے بیٹھا تھا کہ شاید مکان بیچنا پڑے گا لیکن جب دو تین ہفتے گزر گئے تو انخوا والی بات میرے دل سے اتر گئی۔ اب دو ہی باتیں رہ جاتی ہیں۔ یا تو انہیں، اللہ نہ کرے، کوئی حادثہ پیش آ گیا یا وہ خود نہیں چلے گئے ہیں لیکن ہر جگہ ڈھونڈ چکا ہوں، یعنی جہاں جہاں وہ مل سکتے تھے۔ باؤ جی زیادہ جگہوں پر آنے جانے والے آدمی ہی نہیں تھے۔ صبح فجر کے بعد وہ منڈی جاتے پھر دکان پر رہتے یا مسجد جاتے۔ چاچا فقیر محمد ان کے اکھوتے دوست تھے۔ میرے علم میں تو کوئی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں انہیں ڈھونڈا جاسکے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ انہیں بہت اچھی طرح جانتا تھا، بس اتنا ہی جانتا تھا جتنا بیٹے باپوں کو جانتے ہیں۔ آپ سمجھ رہے ہیں نا انسپکٹر صاحب! ہمارے جیسے گھروں میں باپ سے دوستی تو نہیں ہوتی، بس ایک دور پرے کا سا تعلق ہوتا ہے لیکن وہ اتنے شریف آدمی تھے، پورا حملہ اس کی گواہی آپ کو دے گا کہ ان کے بارے میں بہت زیادہ جاننا ضروری بھی نہیں تھا۔ ان کی دنیا بس دکان تھی یا ہم لوگ تھے۔ جن دن ہمارے گھر میں ڈیکتی ہوئی، اس دن بھی باؤ جی نے ڈاکوؤں کی بڑی مٹیں کیں۔ وہ سالے ڈیرہ پللی کے لوہے دہشت پھیلانے کے لیے گالیاں دے رہے تھے اور ٹی ٹی لہرا رہے تھے۔ باؤ جی تو سیدھے سادے آدمی تھے لیکن میں جانتا تھا کہ یہ سب کچھ وہ ہمیں خوف زدہ کرنے کے لیے کر رہے ہیں تاکہ ہم جلد از جلد اپنی ساری جمع پونجی ان کے سامنے رکھ دیں اور وہ وقت ضائع کیے بغیر فرار ہو جائیں۔ آج کل ایسی باتیں سبھی جانتے ہیں۔ ایک موقع پر تو ایک ڈاکو نے ٹی ٹی کا رخ باؤ جی کی طرف کر دیا اور کچھ ہوا اس کرنے لگا۔ باؤ جی بڑی طرح ڈر گئے اور کاٹنے لگے۔ میں کچھ بولا تو اس نے ٹی ٹی کی نال میری طرف کر دی، باؤ جی اور ڈر

گئے۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں گڑ گڑانے لگے اور ہماری جانیں بخش دینے کی درخواستیں کرنے لگے۔ بعد میں جب پولیس دروازہ توڑ کر اندر آ گئی اور لوگوں نے ہتھیار زمین پر ڈال کر ہاتھ اٹھا لیے تو پولیس والوں کے ساتھ میں نے بھی ان سالوں کو خوب مارا۔ بعد میں، میں نے باؤ جی سے کہا کہ باؤ جی! یہ آپ کیا کر رہے تھے۔ اگر یہ قتل کرنے کے ارادے سے آئے ہوتے تو بھلا ہمارے گڑ گڑانے سے ہمیں معاف کر دیتے۔ یہ تو بس ہمیں دہشت زدہ کر رہے تھے۔ باؤ جی ایک دم چپ سے ہو گئے۔ اصل میں وہ آج کے زمانے کے آدمی نہیں تھے۔ کوئی شریف آدمی آج کے زمانے کا آدمی نہیں ہے۔ باؤ جی کے جانے کے بعد سے ہمارے گھر میں تو جیسے کچھ بھی نہیں رہا۔ میرے سر سے تو جیسے کسی نے چھت ہٹا لی ہے۔ ان کے ہوتے ہوئے لگتا تھا کہ کسی پرانے، گھنے بیڑ کے سائے میں بیٹھے ہیں۔ اب ان کے جانے کے بعد اس کا زیادہ احساس ہوتا ہے۔ دعا کریں جی اور کوشش کریں کہ وہ جلد از جلد مل جائیں۔

حلفی:

آپ نے خواہ مخواہ میرا نام تفتیش میں شامل کر لیا ہے۔ میں کسی گواہی کے چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ ویسے میرا بڑا داماد ڈی آئی جی صاحب کا ڈرائیور ہے، خاص آدمی ہے ان کا۔ میں کوئی بیان وغیرہ نہیں دینا چاہتا۔ باؤ وارث کو بس میں ایسے ہی جانتا تھا جیسے پورا حملہ جانتا ہے۔ شریف آدمی تھا۔ نیک، پرہیزگار، ایمان دار تھا۔ کیا کہوں میں۔ ایسے تو میں ہزاروں آدمیوں کو جانتا ہوں۔ اب یہ تو بڑی غلط بات ہوگی اگر مجھے ہر جانے والے کے گم ہونے پر بیان ریکارڈ کرانے کے لیے بلا لیا جائے۔ ہم حکومت کو فیکس اس لیے تو نہیں دیتے کہ پولیس ہمیں پریشان کرے۔ باؤ وارث جیسے نیک، شریف آدمی کو تلاش کرنے کے لیے تو شہر کی پوری پولیس کو نکل کھڑا ہونا چاہیے تھا۔ ساری زندگی وہ حق حلال کی

روزی کما تاربا، اپنے بیوی بچوں کے لیے محنت کرتا رہا۔ بیوی بچوں پر تو اس نے اپنی زندگی لگا دی۔ اب وہ گم ہو گیا ہے تو پولیس والے اسے ڈھونڈ کر لانے کے بجائے دو مہینے سے ہم جیسے شریف شہریوں کو پریشان کر رہے ہیں۔ یہ باتیں کوئی عام آدمی آپ سے نہیں کہہ سکتا۔ مگر میرا بڑا داماد ڈی آئی جی صاحب کا ڈرائیور ہے، ان کا خاص آدمی ہے اس لیے مجھ میں اتنی ہمت ہے کہ یہ کہہ سکوں۔ بس، مجھے اتنا ہی کہنا تھا، سامالیکم۔ پولیس موبائل نمبر ۲۶۲ کے سپاہی مختار محمد کا بیان

حلقی:

میں باؤ وارث کے گھر ڈکیتی کے وقت اطلاع ملنے پر وہاں پہنچا تھا۔ ہم نے فوری کارروائی کر کے ڈاکوؤں کو گرفتار کر لیا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ باؤ وارث اس وقت سکتے کی سی کیفیت میں تھا۔ وہ دیوار کے سہارے کھڑا ہوا تھا اور سامنے خلا میں گھور رہا تھا۔ میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اسے تسلی دی اور کہا، چاچا جی فکر نہ کرو، ان مجرموں کو ان کے کیے کی سزا ضرور ملے گی۔ اس نے سر ہلایا مگر مجھے یوں لگا جیسے اس نے میری بات سنی ہی نہ ہو۔ بس، میں یہی خاص بات ریکارڈ کرانا چاہتا تھا۔

اے ایس آئی ناصر خان کی رپورٹ۔ اختتامیہ ڈھائی ماہ کی سر توڑ کوشش کے باوجود باؤ وارث کی گمشدگی کا معاملہ نہیں کیا جاسکا۔ اس سلسلے میں تفتیش جاری رکھی جائے گی تاہم رپورٹ انچارج صاحب کی خدمت میں پیش کر کے داخل دفتر کی جاتی ہے۔

دستخط ناصر خان اے ایس آئی

یکم فروری ۱۹۹۸ء

۱۳ فروری ۱۹۹۸ء

اے ایس آئی ناصر خان کی ذاتی ڈائری کا ایک

ورق:

گذشتہ رات باؤ وارث سے میری ملاقات ہوئی۔ عبداللہ شاہ غازی کے مزار پر، پتھروں کی بنی ہوئی ایک

پرانی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا، چنایاؤں کھا رہا تھا۔ اس کے ارد گرد اسی کی طرح کے بہت سے لوگ تھے۔ بدحال، فاقہ مست، اپنی اپنی دنیاؤں میں گم۔ میری بات سن کر وہ خاموش بیٹھا مجھے دیکھتا رہا۔ گیس کی زرد روشنی میں اس کا چہرہ پتھر کا سا محسوس ہوتا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”تم یہاں تک کیسے پہنچے؟“

میں نے کہا۔ ”دل میں کوئی پھاس جیسی رہ جائے تو تکلیف دیتی رہتی ہے، بے چین رہتی ہے، پھر میں تو پولیس والا ہوں۔ ان باتوں میں نہ الجھو کہ میں یہاں تک کیسے پہنچا۔ بات بتاؤ۔“ میں وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ”کیسی بات؟“ اس نے چنے پلاؤ کی پلیٹ ایک طرف کھسکا دی۔

”یہ تفتیش نہیں ہے باؤ وارث!“ میں نے کہا۔ ”میں سوال لے کر آیا ہوں۔ صرف ایک سوال، سیدھا سا سوال۔“ باؤ وارث کچھ نہ بولا۔ ایک سنگی ٹھسے کی طرح مجھے دیکھتا رہا۔

میں نے کہا۔ ”ڈکیتی والے دن ایسی کیا بات ہوئی تھی جسے ایک ہفتے تک مسلسل سوچنے کے بعد تم نے وہ زندگی، وہ گھر، وہ بیوی، بچے..... سب کچھ چھوڑ دینے کا فیصلہ کیا؟“ یوں لگا جیسے اس کا پتھر بلا چہرہ جھٹکے لگا ہو جیسے نازک شیشہ ایک ضرب سے سیکڑوں، ہزاروں کرچیوں کی چھوڑ میں بدلنے لگا ہو۔

بہت دیر بعد اس نے کہا۔ ”تم ذہین آدمی ہو۔“ پاس بیٹھے ہوئے ۸، ۱۰ لوگ اچانک اٹھ کر بھاگے۔ ڈور سڑک کے پاس ایک پک اپ سے دیگ اتاری جا رہی تھی۔ دیکھتے دیکھتے پک اپ کے گرد نواز کی بریانی حاصل کرنے کے لیے بے تاب لوگوں کا جھم جمع ہو گیا جو ایک دوسرے کو دھکیل رہے تھے، لڑ رہے تھے، چیخ رہے تھے، گر رہے تھے۔

”خود غرضی ختم نہیں ہوتی۔“ باؤ وارث آہستہ سے بولا۔ ”آج جھموات ہے۔ ابھی بہت دیکیں آئیں گی“

کھا کھا کر ان کے پیٹ پھول جائیں گے مگر کسی کی خود غرضانہ بیوقوفی ختم نہیں ہوتی۔“ میں نے کہا۔ ”میں جواب کا منتظر ہوں باؤ وارث!“

وہ بولا ”میں جواب ہی دے رہا ہوں۔“

میں بھونچکا رہ گیا۔

دیر تک خاموش رہنے کے بعد وہ بولا۔ ”کبھی کوئی ایسا آلم ایجاد نہیں ہوا جو حساب لگا کر بتا سکے کہ آدمی نے زندگی بھر میں اپنی بیوی سے، اپنے بچوں سے کتنی محبت کی۔ اس دن..... ڈکیتی والے دن، میں نے یہی سوچا تھا کہ اچھا ہی ہوا، ایسا آلم ایجاد ہو جاتا تو آدمی کو شاید زیادہ دکھ ہوتا کہ اتنے نثر محبت ضائع کئی، اتنے ٹرک، اتنی پیٹیاں بھر محبت غارت گئی۔ خود غرضی سب کچھ کھا گئی۔“

لوگ پلاسٹک کی تھیلیوں میں بریانی بھر بھر کر لا رہے تھے، اپنی اپنی جگہوں پر بیٹھے جا رہے تھے، بڑے بڑے نوالے نکتے جا رہے تھے۔

باؤ وارث نے کہا۔ ”پستول کی وہ بھیا تک نال میرے طرف اٹھی تو میں نے موت سامنے کھڑی دیکھی۔ میں بری طرح خوف زدہ ہو گیا۔ میری ٹانگیں کانپنے لگیں، میری آواز اٹکنے لگی۔ میں ان چھوڑوں کے سامنے گڑ گڑایا، رویا، میں نے ہاتھ جوڑے، معافیاں مانگیں، اور وہ بھیا تک سیاہ نال میرے جوان بیٹے کی طرف، میری بیٹی، میری بیوی کی طرف اٹھی تو میں پھر گڑ گڑایا اور زار و قطار رویا۔ میں نے انہیں اللہ کے اور قرآن پاک کے اور نہ جانے کس کس کے واسطے دیے۔ وہ بھیا تک نال موت بن کر سامنے کھڑی گئی۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا کیوں کہ میں اپنے بیٹے کو ایک کامیاب انسان کے طور دیکھنے کے لیے، اسے ہر طرح کا سہارا دینے کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ میں اپنا بیٹی کو ۶ ماہ بعد رخصت کرنا چاہتا تھا۔ میں اپنی بیوی کو سر کے سامنے کے بغیر تنہا رہ جانے سے بچانے کے لیے زندہ رہنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ میری کل کائنات تھے۔ میں نہ ان سے محروم ہونا چاہتا تھا، نہ ان سے

الگ ہونا چاہتا تھا۔ اور جب ڈکیتی کا سارا کھیل ختم ہو گیا تو جانتے ہو، میرے بیٹے نے کیا کہا۔ اس نے کہا، باؤ جی! آدمی کو اتنا..... اور وہ ایک لمحے کو رک گیا۔ اس ایک لمحے میں اس نے سوچ کر کہا..... اتنا..... اتنا بزدل بھی نہیں ہونا چاہیے۔ میں سمجھ گیا کہ اگر میں اس کا باپ نہ ہوتا تو وہ جملہ ایک گالی سے پورا کرتا، اور میری بیوی نے کہا، یہ تم کیا بیچڑوں کی طرح ان کی منتیں کر رہے تھے۔ تمہیں مردوں کی طرح ان کا سامنا کرنا چاہیے تھا۔ میری بیٹی کچھ نہ بولی مگر اس کی آنکھوں میں بھی غصہ تھا۔ اپنے باپ کے لیے ناراضی تھی جو ضرورت سے زیادہ شریف تھا، ڈرپوک تھا اور جرات سے محروم تھا۔“

پاس بیٹھے ہوئے ایک آدمی نے ڈکار لی اور کہا۔ ”الحمد للہ۔ یا اللہ تیرا شکر ہے۔“

باؤ وارث نے آہستہ سے کہا۔ ”سب کچھ کتنا بے مقصد ہو جاتا ہے۔ بالکل اکارت۔ جیسے بے غرض محبت کے پودے میں خود غرض محبت کے کڑوے پھل نکل آئیں۔ اتنے مہینوں، اتنے برسوں کی اندھی محبت کے بعد انہوں نے مجھے نامرد، بزدل اور زخما کہہ دیا، میرے منہ پر کہہ دیا۔ شریف آدمی کو سب ڈرپوک سمجھتے ہیں۔ اپنے بیوی بچوں کو بچانے کی خاطر اور خود کو انہی کے لیے زندہ رکھنے کی خاطر گڑ گڑانے والے کو سب وہی گالی دیتے ہیں جو میرے بیٹے کے منہ پر آتے آتے رہ گئی۔ مگر.....“ باؤ وارث نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔ ”مگر کیا واقعی یہ سچ ہے؟ کیا واقعی ایسا ہی ہے؟“

میں خاموش رہا، میں نے نرمی سے اپنا ہاتھ چھڑایا اور کہا ”باؤ وارث! میں تمہارے سوال کا جواب دینے نہیں، اپنے سوال کا جواب لینے آیا تھا۔“ وہ مجھے دیکھتا رہا، اس کا چہرہ پتھر کا سا بن گیا۔ اس نے چنے پلاؤ کی پلیٹ دوبارہ اپنے سامنے کر لی۔ اب میرا وہاں کوئی کام نہیں رہ گیا تھا۔



محمت یا تگن

ایک نرگ دوست سے ۴۴ برسوں پر پھیلی محبت کا عجب ماجرا
وہ اپنی باتوں، عادتوں اور مسکراہٹوں سے دل موہ لینے کا گر جانتا تھا
حسن رزاق

میں

ڈائیو کی بس سے لاہور سے سکھر
کا سفر کر رہا تھا۔ موبائل فون کی
گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھالیا۔
دوسری طرف کسی لڑکی کی آواز آئی ”کیا یہ حسن رزاق
ہیں۔ کیا میں حسن رزاق سے بات کر سکتی ہوں۔“ گفتگو
انگریزی زبان میں ہو رہی تھی مگر لہجہ کینیڈا، برطانیہ کی طرح
کا نہ تھا کچھ یورپی لہجہ کی انگریزی تھی۔

”جی میں بات کر رہا ہوں۔“
”حسن الپا! میں اُزبک بات کر رہی ہوں۔
محمت یا تگن کی بیٹی۔“
اُزبک نرگ ہے۔ ترکی میں بچپن کو الپا کہتے ہیں۔ اُزبک
مجھے حسن الپا پکارتی ہے میں اس کو اُزبک بیٹی کہتا ہوں۔
”کیسی ہو اُزبک بیٹی۔ محمت کیسا ہے؟“ (ترکی میں ”د“
کو ”ت“ بولتے ہیں۔ اچھا خاصا احمد احمیت بن جاتا ہے)

”آپ کے لیے بُری خبر ہے۔ بابا کو پھر سے ہارٹ
ایک ہوا تھا۔ اب وہ نہیں ہیں۔“ بات پوری طرح واضح نہ
تھی میں نے تصدیق چاہی۔ ”کیا محمت ہسپتال میں ہے؟“
”آپ سمجھ نہیں حسن الپا! ہم بابا کو کھو چکے ہیں۔
رات میں ان کی تدفین ہے۔ میں نے آپ کو سب سے
پہلے بتانا ضروری سمجھا آپ بابا کے سب سے گہرے اور
اچھے دوست ہیں۔“
”اللہ تعالیٰ محمت کی مغفرت کرے۔ اللہ حافظ۔“
”اللہ حافظ۔“

یونیورسٹی آف برمنگھم کا نقشہ ایک دفعہ پھر میرے
ذہن میں ابھر آیا۔
ہماری کلاس کا پہلا دن تھا، استاد طالب علم سب کا
تعارف ہو چکا تھا۔ محمت میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ میرا نام
محمت یا تگن ہے، میں نرگ ہوں۔ آپ سے مل کر خوش ہوئی۔
اس کے بعد میری اور محمت کی گہری چھٹنے لگی۔ محمت
کے برمنگھم آنے کا مقصد خود اس کی زبانلی۔
”میرے اچھے دوست حسن! میرے اور تمہارے
درمیان ایک بہت اہم فرق ہے۔ تم زمیندار کے بیٹے ہو میں
کسان کا۔ میں نے زندگی میں نہ وہ آسائش دیکھی ہیں اور
نہ وہ آرام اٹھایا ہے جو تم نے اٹھایا ہے۔ میں اپنی زندگی کی ان
تمام محرومیوں کا ازالہ کرنے پر متحمس آیا ہوں، میں اگلے ایک
سال میں زندگی کا ہر وہ لطف اٹھاؤں گا جس سے میں محروم رہا
ہوں۔“ پڑھائی کے سوا ہدف واضح تھا۔ پورا بھی کیا گیا۔
جس وقت میں اپنا گزارا ۵۰ پاؤنڈ ماہانہ میں کرتا
تھا۔۔۔ جس میں چند کپڑے خریدنا، کتابیں اور اسپین میں
کرسمس کی چٹائیاں شامل تھیں۔۔۔ محمت کو اقوام متحدہ سے
۱۲۰ پاؤنڈ ماہانہ کی اسکا لرشپ ملتی تھی۔ فیس اور کتابوں کا
خرچہ اس کے علاوہ ملا تھا۔ محمت کو اپنی حسرتیں پوری کرنے
کے لیے اقوام متحدہ نے دل کھول کر پیسے مہیا کر دیے تھے
اور محمت اس کا پورا پورا فائدہ اٹھا رہا تھا۔
محمت کا قد درمیانہ شکل اوسط، موچیں زبردست۔ وہ

مردانہ وجاہت کا شاہکار نہ تھا مگر اس کا باتیں کرنے کا
انداز، اس کی انگریزی کے ترک لہجے نے اور اس کی دھیمی
دھیمی مسکراہٹ نے اس کی شخصیت میں ایسا سحر پیدا کر دیا
تھا کہ یونیورسٹی کے اندر بابا بارہو جس لڑکی سے تھوڑی دیر
بات کر لیتا وہ اس کی گرویدہ ہو جاتی۔
ایک رات یونیورسٹی کا فنکشن تھا۔ محمت میرے پاس
آیا۔ ”تمہیں سنتھیا کے ساتھ دو گھنٹے گزارنے ہیں۔
مارگریٹ کا بندوبست کر آیا ہوں وہ آر تھر کے ساتھ ہے۔“
سنتھیا، مارگریٹ کی روم میٹ تھی۔ دونوں ہاسٹل
کے ایک کمرے میں ساتھ ساتھ رہتی تھیں۔ محمت کی دوستی
مارگریٹ سے تھی۔ محمت نے مارگریٹ اور سنتھیا دونوں کو
فنکشن پر مدعو کر رکھا تھا۔
مارگریٹ محمت کی دیوانی تھی۔ اس حد تک دیوانی کہ
اس کو محمت سے ایک بیٹا چاہے تھا جو بالکل محمت کی طرح
ہو۔ مارگریٹ کو اس کی چنداں پرواہ نہ تھی کہ محمت غیر ملکی
ہے، شادی شدہ ہے اور اس کا ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہے۔
”جب مارگریٹ آر تھر کے ساتھ ہے تو تم سنتھیا کے
ساتھ وقت کیوں نہیں گزار سکتے۔“ میں نے محمت سے
پوچھا۔ جواب سیدھا سادا تھا ”میری آئرش دوست کمرے
میں میرا انتظار کر رہی ہے وہ ۱۵ منٹ بعد آئر لینڈ واپس
جارہی ہے۔ مجھے اس کو آئیشن چھوڑنے جانا ہے۔ جلدی
کر و میرے ساتھ سنتھیا کے پاس چلو ورنہ ٹرین نکل جائے
گی۔“ محمت کے علاوہ اور کون ہو سکتا تھا جو تین لڑکیوں کو
ایک ساتھ، ایک ہی جگہ، ایک ہی وقت میں مدعو کر سکتا ہو۔
وہ کبھی کبھی پڑھائی کی طرف متوجہ ہو جاتا تو مجھے اپنے
کمرے میں بلا لیتا، ہم دونوں ساتھ پڑھائی کرتے۔
استادی کے فرائض میرے ذمہ ہوتے۔ اس دوران مجھے
اندازہ ہوا کہ محمت بلا کا ذہن تھا۔ ایسے ایسے نکتے نکالتا کہ
میں لاجواب ہو جاتا۔ بظاہر جھانکنے لگتا جھنجھلا جاتا کہ
میرے پاس جواب نہیں ہے۔ اگلے دن میں ڈھونڈ
ڈھانڈھ کر اس کو جواب دیتا۔
محمت نے اگر بنجیدگی سے پڑھائی کی ہوتی تو وہ یقیناً

اول پوزیشن کا حقدار ہوتا۔ مگر ایم ایس سی محنت کا گوہر مقصود ہرگز نہ تھا۔ وہ صرف زندگی کے مزے لوٹنا چاہتا تھا۔

وقت گزرتا گیا، گرمیوں کی چٹیاں آگئیں۔ پڑھائی ختم ہو چکی تھی۔ اب صرف پروجیکٹ مکمل کر کے اس کی رپورٹ داخل کرنا تھا۔

محنت انگلستان کی زندگی کا بھرپور لطف اٹھا چکا تھا اب وہ اس میں لفظ کو بھی شامل کرنا چاہتا تھا۔ لفظ محنت کی بیوی تھی۔ بریٹنگم کی لڑکیوں سے محنت کو کوئی لگاؤ نہ تھا وہ صرف وقت گزاری تھی۔ ان محرمیوں کا رد عمل جو اس نے اپنی زندگی میں پائی تھیں۔ اس کی ساری محنت صرف لفظ کے لیے تھی۔ جس کو اس نے ڈویل میں حاصل کیا تھا۔ محنت کے علاوہ لفظ کے طلبگار اور بھی تھے۔ محنت نے ان کو ڈویل کے لیے پیلیج کر دیا۔ ”تم اپنا پتول لے کر فلاں وقت فلاں جگہ آ جانا جو زندہ بچے گا وہ لفظ کا حقدار ہوگا۔“ دوسرے طلبگار کو لفظ کی طلب تھی مگر اتنی زیادہ نہ تھی وہ دستبردار ہو گیا۔ لفظ محنت کی پہلی اور آخری محبت تھی۔

محنت کے ہوٹل میں زیادہ جگہ نہ تھی۔ میں جس اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ اس میں دو کمرے خالی ہونے والے تھے ایک بیڑا اور خوشامی کا اور ایک اور۔ محنت اور لفظ دو ہفتہ کے لیے وہاں آ گئے۔ یہ دونوں ٹھون پھرنے نکل جاتے۔ محنت نے گاڑی خرید رکھی تھی ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ کھانا پکانا لفظ کے ذمہ تھا۔ دو ہفتہ میں نے ترکی کے بہترین کھانے کھائے۔ کبھی کبھی ہم نزدیک کے باغ میں ٹہلنے نکل جاتے۔ ایک شام ہم لوگ باغ میں ٹہل رہے تھے کہ لفظ نے

ایک پھولوں کی کیاری کی طرف اشارہ کیا کہ کتنے خوشبودار پھول ہیں۔ لفظ نے اوگر میز بنی نہ آتی تھی۔ محنت ترجمان کے فرائض انجام دیتا۔ میں نے دور سے ہی زور سے سانس کھینچ کر کہا ”کہ میں نے سو گھ لی۔“ اس پر لفظ نے کچھ کہا۔ محنت نے ترجمہ کیا ”کہہ رہی ہے حسن کو پھولوں کو دور سے ہی سو گھنے کی عادت ہے۔“ یہ اس بات پر چوٹ تھی کہ میری کوئی گرل فرینڈ کیوں نہیں ہے۔ وہ بھی

انگلستان جیسے ملک میں۔ ترکی میں گرل فرینڈ کا روائی عام تھا۔ شادی سے پہلے لفظ محنت کی گرل فرینڈ تھی۔

برطانیہ میں ایک مردانے کپڑوں کا اسٹور ہے ”برٹن“۔ ان کی بریٹنگم والی دکان پرسل لگی ہوئی تھی۔ ہم تینوں وہاں پہنچ گئے۔ ۲۰ پاؤنڈ والا بلیزر (Blazer) ۵۰ پاؤنڈ میں بک رہا تھا۔ میں لینا چاہتا تھا مگر اس کے بٹن مجھے پسند نہ آئے۔ محنت نے کہا۔ ”لفظ کہہ رہی ہے کہ بلیزر لے لو بٹن دوسرے خرید لیڈ۔“ میں یہ بٹن نکال کر تمھاری پسند کے بٹن ٹانگ دوں گی۔ میں نے بلیزر اور اپنی پسند کے بٹن خرید لیے لفظ نے اپارٹمنٹ پہنچ کر وہ بٹن نکال کر اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ بٹن ٹانگ دیے۔ دو ہفتے بعد لفظ واپس ترکی چلی گئی۔

سال ختم ہو چکا تھا امتحان بھی ختم ہو چکے تھے میں اور محنت باتیں کر رہے تھے۔ ”میں اور تم ایک بریکٹ کی طرح ہیں۔“ محنت نے کہا۔ ”کیسے“ میں نے پوچھا۔ ”تم پہلی پوزیشن پر ہوا اور میں آخری“ محنت واحد امیدوار تھا جو امتحان پاس نہ کر سکا تھا۔

”محنت“ میں نے کہا ”یہ تمھاری ہی مہربانی ہے جو میں پہلی پوزیشن حاصل کر سکا۔ تم سے زیادہ ذہین ہماری کلاس میں اور کوئی نہیں۔“ اگر تم نے پڑھائی پر وہی توجہ دی ہوتی جو تم نے بریٹنگم کی نوانی آبادی پر دی ہے تو تم پڑھائی میں مجھ جیسے امیدوار کو میلوں پیچھے چھوڑ چکے ہوتے۔“ محنت نے کوئی جواب نہ دیا اس کے ہوتوں پر وہی مسکراہٹ تھی جس سے بچنا مشکل ہوتا تھا۔

میرے کینیڈا جانے کی تیاری ہو چکی تھی۔ ”میں تم کو چھوڑنے لندن تک چلوں گا۔“ محنت نے کہا۔ ”اتنی دور جانے کا فائدہ“ میں نے پوچھا۔ ”میری نظر ہمیشہ ہر چیز کے عملی پہلو پر رہتی ہے جذبات پر نہیں۔“ محنت کو اس کا اندازہ تھا وہ میرے ساتھ ایک سال گزار چکا تھا۔ ”یہ بات تمھاری سمجھ سے بالاتر ہے۔ یہ میری اور تمھاری دوستی کا تقاضا ہے۔ تم لندن میں ایک دن کے لیے میرے مہمان ہو گے۔ ہم ڈونز کباب کھائیں گے ساتھ لندن کے مزے لیں گے۔ خدا معلوم پھر زندگی میں ملیں یا نہ ملیں۔“ یہ صرف میری

اور محنت کی ہی نہیں بلکہ پاکستان اور ترکی کی دوستی تھی۔

ایسا ہی واقعہ میرے ساتھ دوبارہ اس وقت پیش آیا، جب میں سعودیہ چھوڑ کر واپس کراچی آ رہا تھا۔ غیث ڈلا بڑے دیرینہ دوست تھے۔ ہم لوگوں نے ڈی جے اور این ای ڈی کالج میں ساتھ پڑھا، پھر کینیڈا میں ساتھ رہے اور اب سعودیہ میں ساتھ کام کر رہے تھے۔ میں جدہ سے کراچی منتقل طور پر آنے لگا تو غیث کا اصرار تھا کہ وہ مجھے کراچی چھوڑنے آئیں گے۔ میں نے وہی بات دہرا دی جو محنت سے کہی تھی۔ ”کیا فائدہ کراچی جانے کا۔ یہیں سے اللہ حافظ کہہ دینا۔“ غیث کا جواب دو ٹوک تھا کہ ”اللہ تعالیٰ نے تمھارے اندر وہ حس ہی نہیں رکھی کہ تم ان چیزوں کو سمجھو۔ تم صرف اپنے کام سے کام رکھو۔“

اب محنت میں اور غیث میں ایک اور بات مشترکہ ہو چکی ہے۔ یہ دونوں جگہری دوست مجھے آدھے راستے میں چھوڑ کر مالک حقیقی سے جا ملے ہیں۔ ”اب صرف ان کی بختیں بازشت کرتی ہیں۔“

کینیڈا چند دن رہنے کے بعد میں ٹورانٹو سے کراچی آ گیا۔ محنت سے خط و کتابت جاری رہی۔ پھر میں کینیڈا دوبارہ واپس چلا گیا۔ مگر خط و کتابت کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ کینیڈا میں کئی سال گزارنے کے بعد میں سعودیہ ایئر لائنز میں کام کرنے لگا۔ ملک ملک گھومنے کا شوق مجھے استنبول لے گیا۔ میں اس شہر کی محنت میں گرفتار ہو گیا۔ کراچی اور ٹورانٹو میرا مسکن رہ چکے ہیں۔ ان کو چھوڑ کر مجھے دنیا کا کوئی شہر اتنا پسند نہیں ہے جتنا استنبول ہے۔ اگلے ۳ سال میں میں نے استنبول کے سات آٹھ چکر لگائے۔ میں وہاں کی تمام مشہور گاہیں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا۔ مسجد سلطان احمد، توپکاپی میوزیم، میل چائے یعنی بڑا بازار جو دنیا کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے، جس کے اوپر چھت ہے۔

استنبول میں انٹرکانٹ ہوٹل میں ٹھہرتا تھا۔ اس دفعہ جب میں استنبول ایئر پورٹ سے شہر جانے والی بس میں بیٹھا تو میری ملاقات ایک ترک نوجوان کینان سے ہو گئی۔ ”آپ! استنبول میں کہاں ٹھہریں گے؟“ کینان نے

پوچھا۔ انٹرکانٹ میں نے جواب دیا۔

اگر آپ چھوٹے ہوٹل میں ٹھہرنے سے گریزاں نہیں ہیں تو آپ میرے ساتھ تقسیم میدان کے ایک ہوٹل چلیے میں وہاں آپ کو آپ کے پاکستانی لوگوں سے بھی ملواؤں گا۔ بس تقسیم میدان پر ہی جا کر ٹھہریں تھی میں کینان کے ساتھ ہوا۔ ہوٹل بہت چھوٹا اور بے حد ستھ تھا مگر صاف ستھرا۔ ”آپ تازہ دم ہو جائیں پھر میں آپ کو پاکستانیوں سے ملواؤں گا۔“ کینان نے کہا۔

میں کینان کے ساتھ پاکستانیوں کے کمرے میں داخل ہوا۔ ”السلام علیکم“ کی آوازیں آئیں یہ میرے پاکستانی بھائی تھے جو کمپرسی کی حالت میں استنبول میں چپس گئے تھے۔ یہ سب غیر قانونی طور پر برطانیہ اور یورپ میں داخلہ کے امیدوار تھے۔ استنبول میں داخلہ دیتا آسان تھا۔ یہاں سے مناسب موقع پر یورپ میں داخلہ ہو سکتا تھا۔ کوئی نووارو تھا کوئی ڈیڑھ دو مہینے سے وہاں مقیم تھا ایجنٹ کے فون کے انتظار میں۔

پاکستانیوں کے ایک جھکٹے سے مجھے محنت نے بھی متعارف کروایا تھا۔ یہ واقعہ بریٹنگم کے زمانے کا ہے۔ ایک دن محنت نے کہا چلو میں تم کو ایسی جگہ لے چلوں جہاں تم اپنے ہم وطنوں سے مل لو گے۔ وہ مجھے بریٹنگم کے ایک محلے میں لے گیا جس کا نام ”بال سال بیتھ“ تھا۔ یہ جگہ گندگی اور افلاس کا منہ بولتا نمونہ تھی۔ جہاں صرف جنوبی ایشیاء کے باشندے رہتے تھے۔ ہندوستانی، پاکستانی، بنگلہ دیشی اور سری لنکن۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ انگلستان میں بھی اتنے گئے گزرے علاقے ہیں۔ اپنے بھائیوں کی حالت دیکھ کر سرشرم سے جھک گیا۔

اگلے روز کینان میرے کمرے میں آیا۔ ”ہم لوگ پکنک پر جا رہے ہیں آپ چلیں گے۔“ ”کون جا رہا ہے، کہاں جا رہے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں اور میرے دوست بیک آوا جا رہے ہیں۔ یہ ایک جزیہ ہے ہم وہاں وقت گزاریں گے، سمندر میں نہائیں گے پھر واپس آجائیں گے۔“

بیوک آوا ہم کو قیری سے جانا تھا جو لیمپو سینے سے چلتی تھی۔ پکنک کا سامان انتہائی سادہ، زیتون، سفید پیر اور روٹی۔ بیوک آوا میں گاڑیاں نہیں چلتیں صرف گھوڑا گاڑی میسر تھی۔ اسی پر گزرا تھا۔ پکنک اچھی رہی، سمندر میں نہا کر نکلنے کے بعد زیتون اور پیر کا جو مزہ آیا، آج تک یاد ہے۔

میں ترکی میں تھا اور محنت کا کوئی پتا نہیں، یہ چیز مجھے تنگ کر رہی تھی۔ جدہ واپس آیا تو میں نے محنت کو ایک خط لکھا، اس کے بارہ تیرہ سال پرانے پتا پر گوکہ محنت وہاں سے جا چکا تھا۔ لیکن چچی کسی نہ کسی طرح وہ خط کھومتے گھماتے تین مہینے بعد محنت کو مل گیا۔ محنت کا خوشبو سے بھرا جواب آیا۔ اگلے ہفتہ میں محنت سے ملنے استنبول روانہ ہو گیا۔ محنت استنبول میں نوکری کر رہا تھا۔

ایز پورٹ کی عمارت کے باہر گلے ملتے ہوئے ہم دونوں کی مسرت ناقابل بیان تھی۔ محنت استنبول میں آکیلا رہ رہا تھا نوکری کے سلسلے میں۔ نظلے اور سچا ادا میں تھے۔ شام میں محنت نے کہا ”ہم اپنے آپ کو کہیں مدعو کرواتے ہیں۔“ پھر مدعو کرانے کے لیے اپنے ایک دوست کو فون کیا۔ ہم مدعو ہو چکے تھے۔ رات کے کھانے کے لیے۔

اگلے دن محنت نے ان لوگوں کو ایک ہوٹل میں مدعو کیا جو باسفورس میں تھا، جہاں ایشیاء اور یورپ گلے ملتے ہیں۔ رات کا وقت، سمندر کا کنارہ۔ منظر بہت دلکش تھا۔

اس سے اگلی رات ہم نے کھانا ہوٹل شیرین میں کھایا۔ کھانے کے بعد ہم لاؤنج میں کافی پیئے آگئے۔ محنت کے چہرے پر بشارت تھی۔ کہنے لگا۔ ”ایک زمانہ وہ تھا کہ میں ایسے ہوٹلوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے سوچتا تھا کہ یا خدا وہ کیسے لوگ ہوتے ہوں گے جو ایسے بڑے بڑے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں، رہتے ہیں۔“ پھر اس کی آواز میں احسان مندی کا جذبہ آ گیا۔ آج میں بھی اس ہوٹل میں کھانا کھا رہا ہوں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے۔

میں استنبول سے واپس آ گیا۔ سعودیہ چھوڑ کر ابوظہبی، کویت چلا گیا محنت سے رابطہ ایک دفعہ پھر ٹوٹ گیا۔ میں دنیا گردی کر کے کراچی مستقل طور پر آ چکا تھا۔

انٹرنیٹ کی دنیا پورے زور شور سے دوڑ رہی تھی۔ ہر جانب گوگل اور فیس بک کا چرچا تھا۔

میں نے گوگل پر محنت یا ٹکن تلاش کیا۔ محنت یا ٹکن تو نہ ملا لیکن فیس بک پر ایک ازیلم یا ٹکن کا نام تھا۔ محنت کی بیٹی کا نام بھی ازیلم تھا۔ شاید یہ وہی ازیلم ہو۔ میں نے اس لڑکی کو فیس بک پر پیغام بھیجا۔ ”اگر تم محنت یا ٹکن کی بیٹی ہو جو ۱۹۷۳ء میں یونیورسٹی آف برمنگھم میں پڑھتے تھے تو اپنے ابا سے کہو مجھ سے رابطہ قائم کریں۔ اگر نہیں ہو تو میری معذرت قبول کرو۔“

اگلے روز ازیلم کا جواب آیا۔ ”حسن الہا! پھر اپنی تفصیل، ترکی میں باپ کے بھائی کو اپنا کہتے ہیں۔ بابا آپ کو بھائی کی طرح چاہتے ہیں۔ اس لیے میں نے آپ کو اپنا لکھا۔ آپ نے برا تو نہیں مانا۔“

اس کے بعد ازیلم نے لکھا تھا کہ بابا تو خوشی سے اچھل پڑے لیکن ماما کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آ گئے۔ ان کو آپ سے بہت محبت ہے۔ ماما اور بابا دونوں آپ کی باتیں اکثر کرتے ہیں۔ پھر ازیلم نے ایک واقعہ کی تفصیل لکھی۔

”ماما کے سوئی دان میں ایک بٹن کا سیٹ تھا۔ مجھے اچھے لگے میں نے ماما سے کہا یہ بٹن مجھے دے دیں تو انھوں نے انکار کیا کہ یہ بٹن ہمارے ایک بہت گہرے دوست کے ہیں یہ میرے پاس رہیں گے کسی کو دینے کے لیے نہیں ہیں۔“ حسن الہا یہ بٹن آپ کے تھے۔

مجھے وہ وقت یاد آ گیا جب میں نے برٹن سے ملیر خریدا تھا اور نظلے نے اس کے بٹن اتار کر نئے بٹن ٹانگے تھے۔ اور اتارے ہوئے بٹن اپنے پاس رکھ لیے تھے۔ ایک بٹن کے سیٹ کی کیا حقیقت ہے مگر نظلے نے یہ بٹن ایک نہیں دو نہیں پورے ۳۸ سال سے سنبھال رکھے تھے۔ اپنی بیٹی کو بھی دینے کو تیار نہ تھی۔

مجھے اپنی آنکھوں میں جلن محسوس ہونے لگی۔ اس سے زیادہ پر خلوص اور بے غرض محبت اور کہاں مل سکتی تھی۔ میں نے محنت کو فون کیا۔ ”مجھے ازیلم نے بتایا تھا کہ تم فون کرو گے۔“ محنت نے کہا۔ پھر ہم پرانی یادیں تازہ کرتے

رہے۔ ”تم کیسے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”کوئی خاص بات نہیں بس دو دفعہ ہارٹ ایک کرچا کیا ہوں اور گردے ٹھیک سے کام نہیں کرتے۔“ محنت کی شوشی ان تمام بیماریوں کے باوجود قائم تھی۔ ”سب مارگریٹ کی بد دعاؤں کا اثر ہے۔“ ”نہ اس کا دل توڑا تھا۔“ محنت کا قہقہہ فلک شکاف تھا۔ ”کھیں یاد ہے۔“ ”بھلا یہ بھی بھولنے والی چیز ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”ترکی کب آؤ گے۔ شکل کب دکھاؤ گے گوکہ اب تم بھی میری طرح بوڑھے ہو چکے ہو گے۔“ ہینڈم حسن نہیں رہے ہو گے۔“

محنت کو بھی پرانی بات یاد آ گئی۔ برمنگھم میں ہمارے ساتھ ۳۳ رانگریز بھی پڑھتے تھے۔ انھوں نے میرا نام ہینڈم حسن رکھ چھوڑا تھا۔ اگر گاؤں کی ہر لڑکی ”گوری“ کہلائی جا سکتی ہے۔ چاہے وہ کتنی ہی کالی کیوں نہ ہو تو ”ہینڈم“ کہلائے جانے کا اس سے زیادہ اور کون مستحق ہو گا۔ جس کے سر سے آدھے بال غائب ہوں۔ ناک چوڑی اور چپٹی ہو اور آنکھیں ایسی کہ حکومت چین کو اس کو چینی شہریت دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو۔

غیاث ڈلا بھی میری چینی آنکھوں کے مداح تھے۔ کہتے تھے کہ ”تم ہستے ہو تو تمھارے چہرے سے آنکھیں غائب ہو جاتی ہیں۔“ ”صوفیہ ناپڑتا ہے۔“ لیکن نہیں آتا کہ یہ دو کالی سفید لیکریں آنکھ بھی کہلا سکتی ہیں۔“ اب یہ کالی سفید لیکریں غیاث ڈلا کے لیے ترستی ہیں۔ ”اُنکھیاں اُڑیک دیاں.....“

لیکن اسی برمنگھم یونیورسٹی کی اسی ایم ایس کی کلاس میں میں اپنے ہم جماعت مسز Yee کی چینی آنکھوں میں اپنی چینی آنکھوں کے باوجود کوئی خاص مرتبہ نہ پاسکا۔ شاید میری آنکھوں کی حلاوت ہی کم ہو چکی تھی۔

(Yee کو اردو میں لکھنے کی میری کوشش ناکام ہو چکی ہے۔ اس لیے Yee ہی لکھنا پڑا.....)

مسز Yee شدید قسم کے احساس کمتری کا شکار تھے۔ ان کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ اپنے ہر جملہ کو ”وی برٹش

پپیل“ سے شروع کر کے اپنے آپ کو ایک دفعہ اور یہ یقین دلا لیں کہ وہ واقعی برٹش ہیں۔ ان کا چلنا پھرنا، اوڑھنا پھونپنا، کھانا پینا، دین دھرم ایمان۔ سب برٹش تھا۔ لیکن وہ ان چینی آنکھوں کا کیا کر تے مجتہد ان کو اپنی جڑوں کو نہیں بھولے دیتی تھیں۔ شاید اسی لیے میری چینی آنکھیں ان کو بالکل نہیں بھاتی تھیں۔

مسز Yee کا اپنی جڑوں سے گریز چونکا دینے والا تھا۔ خدا جانے اس کے پیچھے کیا کہانی تھی؟ بات ہینڈم سے چلی تھی۔

”محنت“ میں نے کہا۔ ”ہینڈم نہ میں جب تھا نہ اب ہوں مگر شکل ضرور دکھاؤں گا۔ ضرور آؤں گا۔“

اگلے چکر میں ترکی رکتا ہوا جاؤں گا۔ چند روز بعد ازیلم کی ای۔ میل آئی۔ ”بابا کو تیرا ایک ہوا تھا اب گھر پر ہیں آپ ان سے بات کر لیں۔ آپ کو بہت یاد کرتے ہیں۔“

میں نے محنت کو فون کیا۔ ہم کافی دیر بات کرتے رہے۔ وہی ”کب آؤ گے“ کا سوال تھا۔ میں نے بھی اپنا وہی پروگرام بتایا کہ ”گلگ دفعہ امریکا، کینیڈا جاتے ہوئے۔“ ”پھر ازیلم کی ای۔ میل ملی۔ بابا آپ سے بات کر کے اتنے خوش ہوئے کہ بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے۔“

آپ کا شکریہ کہ آپ نے کال کی۔“

پھر آج کا ازیلم کا ٹیلی فون آیا۔ بس سکھر شہر میں داخل ہو رہی تھی۔ ازیلم کے الفاظ میرے کانوں میں گردش کر رہے تھے۔

”آپ سمجھ نہیں حسن الہا! ہم بابا کو کھو چکے ہیں۔ رات میں ان کی تدفین ہے، میں نے آپ کو سب سے پہلے بتانا ضروری سمجھا۔ آپ بابا کے سب سے گہرے اور اچھے دوست ہیں۔“ میں بس میں نیک لگائے محسوس کر رہا ہوں کہ پوری بس شرمندگی سے بھری ہوئی ہے۔

”اگر میں واقعی اتنا اچھا اور گہرا دوست تھا تو امریکا، کینیڈا جانے کے انتظار میں ہی کیوں تھا؟ میں محنت کو دیکھنے اور ملنے صرف ترکی نہیں جاسکتا تھا؟



خدمت و ہمت کے لازوال جذبوں میں گندمی ایک پُراثر داستان

گلاب گاہ

نجیب عمر

وقت کا پہیہ مسلسل حرکت میں ہے لیکن ہم انھیں کیسے بھول سکتے ہیں جنھوں نے اپنا آج ہمارے کل کی خاطر قربان کر دیا

سناؤں گا۔

گل شیر خاموشی سے سنتا رہا۔ اس نے کہا ”میرا بھی لطیفہ سنو..... ۴/خواتین خاموش بیٹھی تھیں۔“ یہ کہہ کر گل شیر خاموش ہو گیا۔ سب نے پوچھا ”پھر کیا ہوا؟“ گل شیر نے بتایا ”لطیفہ ختم ہو گیا۔“ اس پر ٹرک سردی سے کپکپاتے قہقہے سے گونج اٹھا۔

گل شیر ایک پیشہ ور سپاہی تھا۔ والد بھی فوج کا حصہ تھے۔ دادا نے متحدہ ہندوستان کی فوج سے پاکستان تیار کر لیا تھا۔ گل شیر کے لیے موت کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی۔ اصل بات وہ مقصد ہے جس کے لیے موت کو گلے لگایا جائے۔ اس کا سینہ وطن کی محبت سے بھرا ہوا تھا۔

سانے ایک کیمپ کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ اب ان کے چہروں پر مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ دھیرے دھیرے ان کا ٹرک کیمپ کے قریب ہو رہا تھا۔ اس کی گہما گہمی دیکھ کر ان کے دلوں نے بھی جاگنے لگے۔ بیس کمانڈر نے استقبال

آہستہ خرام فوجی ٹرک پہاڑی راستوں پر رواں دواں تھا۔ بلندی کی جانب مائل راستے ایسے ہی پُر چچ ہوتے ہیں۔ چاروں طرف برف کی سفید چادر تھی ہوئی تھی۔ حدنگاہ ہر شے سفید تھی۔ فوجی باتیں کر رہے ہیں لیکن سردی کی شدت انہیں اکثر خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کر دیتی۔ ایک منچلے لیفٹیننٹ نے لطیفہ سنایا۔ ایک سکھ نے پوچھنے والے کو اپنی عمر وہی بتائی جو ۱۰ سال قبل بتائی تھی۔ دوست نے حیرت سے کہا ”۱۰ سال پہلے بھی تمہاری عمر یہی تھی؟“

جواب ملا ”۵۰ سال بعد بھی یہی رہے گی۔ میں سکھ ہوں اور میرا قول پکا، میں عمر تبدیل نہیں کرتا۔“ سب ہنس پڑے۔ لیفٹیننٹ نے مزید کہا ”کیا پتا بلندی پر کسی سکھ سے ملاقات ہو جائے، اسے بھی یہی لطیفہ

کہا اور چائے سے تواضع کی گئی۔ اس سردی میں چائے سے بڑی نعمت عظمیٰ ہو سکتی تھی۔ گل شیر کو یہ تو پتا تھا کہ یہ عارضی ٹھکانہ ہے اور اس کی پائین (6NLI North Light Infantry) اوپر گیارہ سیلٹر میں ہے۔ سیاحین کا یہ حصہ اسکودو میں ہے۔ اسے مع مائٹوں کے اس بلندی پر سخت سردی میں ڈیوٹی انجام دینے کی مکمل تربیت دی گئی تھی۔ اس نے بڑی توجہ سے قزاق باتوں کو ذہن نشین کر لیا۔ وہ جوش و جذبے سے بھرپور فوج پاکستان کا جوان تھا۔ اس کی زندگی کے دو ہی اصول تھے، حکم ماننا یا حکم دینا۔

وہ گزشتہ ۱۸ سال سے فوج کا حصہ تھا۔ اس کی فرائض تھی کہ وہ کوئی عظیم کارنامہ انجام دے لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ پروردگار یہ موقع خوش نصیبوں ہی کو عطا کرتا ہے۔ وہ کسی ایسے موقع کے لیے ہمیشہ دعا گو رہتا۔

اسے بار بار یاد دہانی کرائی جاتی کہ اوپر ہمارے دو دشمن ہیں: ایک جو بلندی پر بیٹھا ہے، جس نے ۱۹۸۴ء میں خفیہ ہم کے تحت بلند حصے پر قبضہ کر لیا اور اب سیاحین کے دو تہائی حصے پر قابض ہے۔ اسٹرٹیجک نکتہ نظر سے اُسے بہتر پوزیشن حاصل ہے۔ لیکن پاکستانی فوج بھی دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھی ہے اور اسے کھل کھیلنے کا موقع نہیں دیتی۔ دوسرا دشمن شدید سردی اور برف باری تھی۔

تیسرے روز گل شیر اور اس کے ساتھی ہیلی کاپٹر کے ذریعہ گیارہ سیلٹر پہنچے جہاں ان کا گرم جوشی سے استقبال ہوا۔ کئی جوان اور افسر خاک کی بجائے سفید وردی میں لہو لہاتے تھے جو شدید سردی سے بچانے کے لیے خاص طور پر تیار ہوئی تھی۔ لیکن گل شیر نے شخص کو کیا کہ سردی اس کے باوجود اپنا پتا دے رہی ہے۔

کھانے کے بعد جو صرف ڈبوں میں بند خوراک پر مشتمل تھا، تعارفی تقریب میں آمدہ جوانوں کو بتایا گیا کہ اس وقت ہم سیاحین کے ایک سیلٹر میں موجود ہیں۔ مقامی زبان میں ”سیا“ کے معنی گلاب کے ہیں اور ”چن“ کا مطلب مقام یا جگہ۔ یعنی ہم اسے گلاب گاہ یا شیر گلاب

کہہ سکتے ہیں۔ یہ قدرتی حسن کا شاہکار ہے۔ لیکن حسن کی اس تمازت سے لطف اندوز ہونے کے لیے شدید سردی جھیلنی پڑتی ہے۔ علاقے کا عام درجہ حرارت منفی ۵۰ سینٹی گریڈ (۵۰°C-) ہوتا ہے جبکہ برفانی اور تیز ہوائیں اسے منفی ۷۰ سینٹی گریڈ (۷۰°C-) تک پہنچا دیتی ہیں۔ گل شیر کو اپنے دادا کی بات یاد آئی۔ وہ جوانوں کو زیادہ گرم کپڑے پہنے دیکھتے تو اعتراض کرتے کہ جسم کو سردی کا عادی بناؤ تا کہ یہ تمہاری کمزوری نہیں، ہتھیار بن جائے۔ وہ دادا کی بات یاد کر کے ہنسنے لگا۔ اس کے دادا نے ایسی سردی کہاں دیکھی ہوگی جہاں ٹھانڈا جم کر یں بال سے زیادہ سخت بن جاتا ہے۔ جتنے آلو پر ہتھوڑے سے چھوٹا سا ڈینٹ بھی نہیں ڈالا جاسکتا۔

خطرناک بات یہ تھی کہ اگر مخصوص دستانے کے بغیر برہنہ انگلی سے رافٹل کے ٹریگر کو صرف ۱۵ سینکڈ کے لیے چھوا جائے تو انگلی ناخن سمیت کٹ کر گر جاتی ہے اور اس کا شکار ہونے والے کو خبر بھی نہیں ہوتی۔

بنالین کے ڈاکٹر لیفٹیننٹ صاحب نے انہیں الگ سے ہدایات دیں اور باور کرایا کہ دشمن کے خلاف مقابلے میں ہمیں سب سے اول خود کو کھت مند رکھنا ہے بھی ہم اُسے منہ توڑ جواب دے سکتے ہیں۔ اس شدید موسم میں صحت برقرار رکھنے کے لیے ہمیں خاصی جدوجہد کرنی پڑے گی۔ آپ اس وقت دنیا کے بلند ترین محاذ جنگ پر موجود ہیں، کیونکہ شمالی اور جنوبی قطب کے بعد اتنی بلندی پہ برف کی تہہ دنیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ فراسٹ بائٹ (Frost bite)، سنو بائٹ (Snow bite) اور چل بلین (Chill blain) جیسے سردی کے امراض سے آپ خود کو ہر حال میں محفوظ رکھیں۔ ورنہ یہ آپ کے اعضا گلا کر جسم سے الگ کر دیں گے اور آپ کو خبر بھی نہ ہوگی۔

سیاحین میں بھوک بہت کم لگتی ہے اور نظام ہضم بھی متاثر رہتا ہے۔ لیکن خوراک کی معین مقدار آپ نے ہر حال میں لینی ہے تاکہ صحت برقرار رہے۔ جوانو! یہ ایسی جنگ ہے جہاں ہر لمحہ آپ کو نبرد آزما رہنا ہے۔ اقبال نے

ایک عام بات کی تھی لیکن ہم جوانوں کے لیے کچھ زیادہ حسب حال ہے:

یہ شہادت گہرے الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلمان ہونا

اس کے علاوہ اگر احیاط نہ کی جائے تو
شدید سردی میں جنم لینے والی دو بیماریاں
HAPE (High altitude.....pulmonary edema) اور
HACE (High altitude Cerebral edema) جان لیوا
ثابت ہوتی ہیں۔

۱۹۸۲ء سے جب سے ہندوستان نے یہ محاذ کھولا
ہے، تب سے دونوں جانب تقریباً ۸۰۰۰ جانیں ضائع
ہو چکی۔ جوانوں کی اکثریت موسم کی شکار بنی، کسی گولی یا
بم سے انھوں نے جان نہیں گنوائی۔

☆.....☆

گل شیر چند ہفتوں کے اندر معمولات کا عادی ہو گیا
اور خود کو چاق و چوبند رکھنے کے لیے مسلسل محنت کرتا رہا۔
لیکن انتہائی بلندی پر اور شدید موسم میں انسانی کارکردگی
متاثر ہوتی ہے۔ ۵۰۰ قدم چل کر جوان اپنے لگتے۔ توڑی
سی محنت فوجیوں کو تھکا دیتی اور انہیں آرام کی سخت ضرورت
محسوس ہوتی۔ اکثر مسلسل برفباری ایک عذاب کی صورت
نازل ہو جاتی۔ اگر برف کھودنے کا عمل متواتر جاری نہ رکھا
جائے تو سارا کیمپ اسی میں دفن ہو جائے۔

گل شیر کے لیے سب سے بڑی رکاوٹ ہتھیاروں کو
کار آمد رکھنا تھا۔ شدید سردی ہتھیاروں کو ناکارہ بنا دیتی
ہے۔ انہیں قابل استعمال رکھنے کے لیے مسلسل گرم کرنا
پڑتا ہے۔ فوجیوں میں یہ مقولہ مشہور ہے کہ اپنی جان سے
زیادہ ہتھیاروں کی حفاظت کی جائے لیکن سیاچن پہ مفہوم
بل جاتا ہے، حفاظت سے زیادہ انہیں قابل استعمال
رکھنے کی خاطر گرم کرنا پڑتا۔

تیل سے نکلنے والے دھوئیں کے باعث ہر چیز پر
کا لک جم جاتی۔ حتیٰ کہ انسانی تھوک بھی منٹوں میں کالی
پڑ جاتی اور اسی فضا میں سانس بھی لینا ہوتا۔ اگرچہ آکسیجن

ماسک بہت زیادہ استعمال ہوتا لیکن کہاں تک؟ انسانی
فطرت ہے کہ وہ ماسک سے چھکارا چاہتی ہے لیکن وہاں
یہ ممکن نہیں تھا۔

ایک دن کیمپ کمانڈر، کرنل صاحب نے جوانوں کی
اسمبلی بلائی، پُر زور تقریر کی اور بتایا کہ ہماری ذمہ داریاں
کیا ہیں:

”ہم سب ایک بڑی قومی خدمت پر مامور ہیں۔ اس
کا تقاضا ہے کہ ہم امتحان میں پورے اتریں اور قوم کو
مایوس نہ کریں۔ دشمن بلندی پر ہے، ایک لحاظ سے یہ اس
کے حق میں جاتا ہے۔ لیکن بلندی پر سردی بھی شدید ہوتی
ہے جس کا اسے سامنا ہے۔ ہم مشرقی فراق رقم رینج میں
ہیں۔ ۱۳ ممالک کی سرحدیں یہاں قریب ہیں پاکستان
ہندوستان اور چین۔“

”ہماری حکومت سیاچن آپریشن جاری رکھنے کے
لیے روزانہ ڈیڑھ کروڑ روپے خرچ کرتی ہے جبکہ
ہندوستان کو روزانہ ۵ کروڑ روپے خرچے پڑتے ہیں۔
ہندوستان سیاچن کے دو تہائی حصے پر قابض ہے اور
ہمارے حصے میں صرف ایک تہائی آیا ہے۔ دشمن کے پاس
۲ درے ہیں جبکہ ہمارے پاس صرف گیاگ لاپاس
(GyongLa Pass) ہے جہاں شیوک اور نیراندی والی
وادئ کو کنٹرول کرنا ہمارا کام ہے۔“

”ہندوستان کا زمینی راستہ ان کے کیمپ کے ۸۰ کلومیٹر دور ہے جبکہ ہماری سرحدیں صرف ۲۰ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ اس لحاظ سے ہم تیز حرکت کر سکتے ہیں۔ ہمارے جوان جانتے ہیں کہ جنگ ہتھیاروں کے بجائے حوصلے اور دلوں سے لڑی جاتی ہے جس کی ہمارے پاس کوئی کمی نہیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارا دین ہمیں وہ قوت ایمانی عطا کرتا ہے جو کسی اور کو حاصل نہیں۔ شہادت وہ عظیم انعام ہے جس کے ہم سب متقی ہیں۔ زندہ رہے تو غازی اور ہماری جان اگر قوم و ملت کے کام آجائے تو شہادت سوچ ہمیں وہ طاقت عطا کرتی ہے جس کا مقابلہ ممکن نہیں۔“

”اس کی خوبصورتی کی بنا پر مقامی لوگوں نے اسے
گل شاہ (سیاچن) کا نام دیا۔ لیکن میں بتانا چاہتا ہوں
کہ ہمارے شہداء کہو نے اس گرگ وادی کو اور زیادہ
مقدس بنا دیا۔ ہم اپنا خون بہانے سے ہرگز دریغ نہیں
کریں گے۔“
تقریر ختم ہوئی تو فوجیوں نے واشگاف لغزہ تکبیر بلند
کی۔
کرنل صاحب نے گل شیر کو بلایا اور کہا ”تمہیں
خامد کے بہت سے اشعار یاد ہیں۔ آج ہمیں ”طارق کی
دعا“ سناؤ۔“
گل شیر نے کرنل صاحب کو سیلوٹ کیا اور ان کے
بارہ کھڑے ہو کر بڑے دلنشین انداز میں کلام اقبال سنانا
شروع کیا۔ شعر۔
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا
سمت کر پہاڑ ان کی ہیبت سے رائی
یہ ایک جوان نے بلند آواز سے کہا ”گل شیر کی آواز
میں تک جانی چاہیے۔“
جب گل شیر نے یہ شعر پڑھا۔
شہادت ہے مطلوب و مقصود موسم
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی
تو ایک جوان نے کہا ”اقبال نے ہماری تمناؤں کو
زبان دی، وہ ہمارے دلوں میں بستے ہیں۔“
☆.....☆

یہ سارا اپریل ۲۰۱۲ء کی صبح تھی، ہفتے کے دن کا آغاز۔
مقامی رات بھر سارا کیمپ جاگتا رہا۔ ایسے میں دن میں
خان باری باری نیند پوری کرتے ہیں جس کا دوران یہ مختصر
ہوتا ہے۔

اندھیرا اچھا گیا اور سب کو منوں بھاری برف نے ڈھانپ
لیا۔ گل شیر کے ساتھ ۷ جوان اور تھے۔ جب حواس قابو
میں آئے تو انہیں اپنے اطراف برف کی دیوار کھڑی دکھائی
دی۔..... چھت بھی برف بن چکی تھی۔ انہیں محسوس ہوا کہ وہ
محصور ہو چکے۔ صورت حال کافی تشویشناک تھی۔ گل شیر
نائیک تھا۔ اس کے ساتھ ۲ لانس نائیک، ایک حوالدار،
ایک کمپنی حوالدار میجر ۲ سپاہی اور ایک دھوبی مقیم تھے۔

کمپنی حوالدار عہدے میں سب سے بڑا تھا لہذا اس
نے فوراً اپنے آپ کو سنبھالا اور دیگر ساتھیوں کی ہمت
بندھانے لگا گل شیر اس کے ساتھ ساتھ رہا۔ حوالدار نے
ساتھیوں کو بتایا ”سب سے پہلے ہمیں یہ جاننے کی
ضرورت ہے کہ ہوا کیا ہے؟ جب تک ہمیں اس کا ادراک
نہیں ہوتا ہم کوئی قدم نہیں اٹھا سکتے۔ میں اپنے تجربے کی
بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ یہ بم دھماکا نہیں۔ اس لیے کہ اتنے
بڑے دھماکے کے بعد بارود کی بو بالکل محسوس نہیں ہوتی۔
لہذا میرا گمان ہے کہ یہ برفانی سلائیڈنگ ہے۔ یہ بہت
بڑا برفانی تودہ گرا ہے۔“

”ہمیں اندازہ نہیں کہ ہماری بائیلین کے کتنے جوان
اس سے متاثر ہیں اور کیا باقی لوگ خیریت سے ہیں؟
ہمارے ساتھی حوالدار کو کچھ سنل کا تجربہ ہے۔ وہ باری
باری تینوں ستوں میں ہتھوڑے کی ضرب سے سنل دینے
کی کوشش کرے..... شاید کوئی جواب مل جائے۔ انھوں
نے فوراً یہ کوشش کر دیکھی مگر آواز وہیں پختہ ٹینٹ میں ہی
دب کر رہ گئی۔ ٹینٹ میں لحد لحد ٹھن بڑھ رہی تھی۔
اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ انھوں نے
روشنی کے لیے لیپ ڈھونڈنے کی کوشش کی، وہ برف کی
تہہ میں دبا ہوا ملا۔ اس کا تیل بہہ چکا تھا۔ اس کوشش میں
چند ڈبے خوراک دستیاب ہو گئی۔

گل شیر اپنے ساتھیوں کی ہمت بندھانے کی غرض
سے بولا ”موت کا وقت معین ہے، اگر وہ آچکا تو ہم خوشی
خوشی اپنے رب سے ملنے کے متقی ہیں۔ ایک فوجی کی
زندگی جدوجہد سے عبارت ہوتی ہے۔ ہمیں سب سے پہلے

سب کو یقین تھا کہ زندگی روٹھ چکی ہے مگر وہ نہیں جانتے تھے
ایک آخری خواہش سانسوں میں کہیں اٹکی ہوئی ہے

آخری خواہش

Underwater Unconscious by Alexis Jetter

ایک ماں کی کہانی

جو خون منجمد کر دینے والے پانی کی تاریکی میں جا پھنسی تھی

ترجمہ: تور اکینت قاضی

چھت گھری ہوئی تھی۔

پچھلی سیٹ سے لڑکوں کے چیخنے چلانے کی آوازیں
بھی اسے مسلسل اذیت پہنچا رہی تھیں۔ لیکن وہ اس قابل
نہی کہ انھیں تسلی دے سکتی۔ ایک دو منٹ مزید گزر گئے۔
اس کے پیچھے اب آسجمن سے خالی ہو چکے تھے۔ وہ
جلدی تاریکیوں میں ڈوبتی چلی گئی۔

۲۶ نومبر ۲۰۰۲ء صبح امریکی شہر ٹریلفورڈ، ورمونٹ
میں انتہائی سرد اور دھندلی طالع ہوئی تھی۔ لیکن نیلی
پنٹنکٹن، کمپیوٹر کنسلٹنٹ کو اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ
نرم لب والہ لیکن انتہی عزم و ارادے کی عورت تھی۔ جو کسی
قسم کے حالات میں بھی اپنے کاموں کو ادھورے چھوڑنے
یا التوا میں ڈالنے کی عادی نہیں تھی۔ اس صبح بھی اس نے
عام صبحوں کی طرح اپنے شوہر فیلیا ہائن، دو بیٹوں ۷ اور ۱۱ سالہ

پل کے پہلو سے ٹکرائی اور قلابازی
کھاتی ہوئی ایک دھماکے کے ساتھ
نیچے دریا میں جا گری۔ اس کی ٹوٹی
ہوئی کھڑکیوں سے پانی تیزی سے
نہلنے لگا۔ نیلی پنٹنکٹن، اس کا بیٹا اور اس کا عزیز
ایک میٹر منجمد کر دینے والی پانی میں گھر کر رہ گئے۔

نیلی سانس روکے اپنے آپ کو سیٹ بیلٹ سے
ٹکرائی کو کوشش کرنے لگی۔ مگر وہاں مکمل تاریکی تھی اور
اس کے حواس مختل ہوئے جا رہے تھے۔ اس نے ٹی سیکنڈ
بیلٹ سے سراسر تلاش کرنے میں ضائع کیے۔ پھر اس
کے حواس سے باہر نکلنے کی کوشش شروع کر دی۔ لیکن کار
میں اٹھی ہوئی تھی اور اس کی ٹانگیں ڈیش بورڈ کے نیچے
میں اٹھی ہوئی تھیں اور اس کے سر کے چاروں طرف کار کی

کار

ہیں۔ اس نے کوشش کر کے جوانوں کو یاد دلایا کہ ہمارے
دروپوں میں دانیں بائیں ایک سرخ رنگی ہے۔ جب سرخ
نا قابل برداشت ہو جائے تو اسے استعمال کرنا ہے۔ اس نے
و جان کا رشتہ کچھ عرصے کے لیے مزید بحال ہو جائے گا۔
گل شیر نے سرخ نکالنے کی کوشش کی تو اسے لگا سانس بند
ہونے کو ہے۔ اس نے کوشش کر کے سرخ نکال لی اور اپنے
بازو میں لگانے کی کوشش کی، جب کئی ہفتوں بعد اس نے
تک امدادی ٹیمیں پہنچیں تو کھدائی کے بعد جو جوان
ملے۔ ان میں سے ایک سرخ کو اپنے بازو پر رکھے ہوئے
تھا اور اسی حالت میں جم گیا۔ ایک کے ہاتھ دعا کے لیے
اٹھے تھے، دودھ رہے ہوئے ملے۔ ان جتنے ہوئے انسانوں
کو اٹھاتے ہوئے کوئی نہیں جانتا تھا کہ ان کے آخری لحاظ
میں کون کیا سوچ رہا تھا۔ کیا مانگ رہا تھا۔

لینڈ سلائیڈنگ کے سانحے کو بیس سال ہو گیا۔ اب
میں قوم کو امید تھی کہ برف میں پھنسے ایک سوانا
لوگوں کو زندہ نکال لیا جائے گا جن میں ارشہری تھے اور
بقیہ فوجی! بلندی اور موسم کی شدت نے ایسی رکاوٹیں کھڑی
کر دیں کہ انہیں بچایا نہیں جا سکا اور کبھی نہ جانے شہادت
نوش کیا۔ تلاش کا کام مسلسل جاری رہا تاکہ ان شہداء کو
تمام تر قومی اعزاز کے ساتھ سپرد خاک کیا جائے۔

برف کی تہوں میں جتنے بہت کم جانباڑوں کے جسم کی
نکالے جاسکے۔

وقت کب تھا ہے؟ اس کا پھیپہ مسل اس کے آگے کی طرف
بڑھ رہا ہے۔ لیکن ہم انہیں کیسے بھول سکتے ہیں جنہوں
نے اپنا آج ہمارے کل کے لیے قربان کر دیا۔

آج بھی اس گاؤں میں سروس آگتی ہے۔ حد لگاؤ
تک پھیلے بڑے کے درمیان زرد پھول شعلہ کھلاتے ہیں۔
لیکن ان پر چھوٹے دالوں کے پار آسمانوں میں گلی شیر اور
اس کے سامنے جنت کے باغوں میں ہیں۔ وہ دیکھ رہے
ہیں کہ جوانوں کی نئی ٹوٹی دفاع کا مقدس فریضہ انجام دے
گلاب گاہ پہنچ چکی..... یوں فرض ادا کرنے کا سلسلہ
نہیں بلکہ جاری و ساری ہے۔

یہاں سے نکلنے کی صورت نکالنی ہوگی پھر ہی جان سکیں گے
کہ بٹالین کے باقی لوگ کہاں ہیں خصوصاً کرنل صاحب!“
حالات لمحہ تشویشناک ہو رہے تھے۔ ٹینٹ میں
آسجمن کم ہو رہی تھی۔ سانس لینے میں دقت پیش آرہی تھی
اور وہ آزادی سے اٹھ کر ادھر ادھر بھی نہیں جاسکتے تھے۔ نہ
روشنی، نہ ہوا کچھ بھی ان تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ وقت کا تعین
کرنا ایک مسئلہ تھا۔ عام گھڑیاں وہاں کارآمد نہیں ہوتیں،
صرف چینی حوالدار میجر کے پاس وہ مخصوص گھڑی تھی جو
جسم کی گرمی سے چلتی۔ اسے چالو رکھنے کے لیے جسم سے
چپکائے رکھنا پڑتا۔

گل شیر کو لگا یہ کوئی خواب ہے۔ ابھی آنکھ کھل جائے
گی اور ہر چیز معمول کے مطابق ہوگی۔ مگر کئی گھنٹے
گزرنے کے بعد بھی حالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو
تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔ کوئی بھی خوفزدہ نہیں تھا۔

حوالدار میجر نے باقی ساتھیوں کو یقین دلانے کی
کوشش کی کہ اگر ہم برف بٹا کر باہر نہ نکل سکیں تو بھی
امدادی کارکن جلد ہم تک پہنچ جائیں گے۔ اس برفباری
میں انہیں اندازہ ہوگا کہ تاخیر خطرناک ثابت ہو سکتی ہے۔

گل شیر تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی موضوع چھیڑ دیتا
اور سارے اس کے بیان کے سحر میں کھو جاتے۔ ایک بار
اس نے بتایا کہ میرے گاؤں میں جب سروس آگے، تو حد
نظر سبز دکھائی دیتا۔ ان کے درمیان زرد پھول دیکھ کر
لگتا ہے کہ شعلہ ”دھل“ رہے ہوں۔

حوالدار میجر کی آنکھیں بھی میچنے لگیں۔ اس نے بتایا
”میرا گاؤں پہاڑ پر بسا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں پر جا بجا
پھلدار درخت لگے ہیں جن کے درمیان پھیلے ہم بڑے
ہوئے۔ ایک سانس میں پہاڑ کی چوٹی تک جانا ہمارا معمول
تھا۔ میرے والد کہا کرتے تھے، ہم پہاڑوں کے بیٹے ہیں
اور ہمارے عزائم بلند ہونے چاہئیں۔ آج وہ زندہ ہوتے تو
خوش ہوتے کہ میں افواج پاکستان کا حصہ بن چکا۔“ گل
شیر نے نوٹ کیا کہ اسے سانس لینے میں بہت دقت ہو رہی
ہے۔ اس کے باقی ساتھیوں کی آوازیں بھی نہیں آرہی

کیل اور ۱۱ سالہ ایس کے ساتھ ناشتہ کیا۔ اس کے بعد وہ اپنے بیٹے ایس اور اس کے ہم عمر بڑی دوست رائیگل گیرین کو ان کے سکول جو تعینت فورڈ میں واقع تھا، پہنچانے کے لیے کار میں آ بیٹھی۔ پھر جب دونوں لڑکے پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے تو وہ برف سے ڈھکی ڈھلوان پہاڑی سڑک پر ہوئی۔

۸ بجے نیلی کی چار دروازوں والی کار گہرے سبز دریا امپوسا نو سک کے سائز برج پر پہنچی۔ یہ پل ۱۸۴۰ء میں تعمیر کردہ چوبیس تختوں والا چرانا ہوا بارہ میٹر طویل پل تھا جو آڑٹھوں، سیاہ بیر چنے والوں اور فٹنگ راڈ سے پھلکا شکار کرنے والوں کے لیے بہترین تفریحی مقام شمار ہوتا تھا۔

نیلی محتاط روی سے پل کی طرف بڑھتی رہی۔ اس پل پر دو ہفتے قبل کارنوں نے بڑی طرح سے ٹھس جانے والی چوبی سڑک پر دو بڑے بڑے لکڑی کے تختے لگا دیے۔ ان تختوں پر چڑھتے وقت ہر گاڑی کو ایک زوردار دھچکا لگتا تھا۔ وہ اچھل جاتی تھی اور ادھر ادھر مڑ جاتی تھی۔ اس لیے جلد ہی حکومت کو ڈرائیوروں کی طرف سے شکایت پہنچنا شروع ہو گئی تھیں۔ اب ہائی وے اتھارٹیز نے اگلے دن اس پل کا معائنہ کرنا تھا۔

جب نیلی کی کار ان تختوں سے ٹکرائی تو اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس کی کار کے دائیں طرف کے ٹائر تو تختوں پر آ گئے تھے لیک بائیں طرف کے ٹائر تختوں پر سے پھسل گئے تھے۔ اس نے کار کو سیدھا کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اسی حالت میں تیزی سے بائیں طرف دوڑتی چلی گئی۔

”میں اس وقت اگھر رہا تھا جب کار تختوں پر سے پھسلنا شروع ہوئی،“ ایس نے بعد میں بتایا تھا۔ ”پھر مجھے والدہ کے چیخنے یا ٹائروں کے چرچانے کی آواز سنائی دی۔ پھر ہمیں دیوار سے ٹکر لگی۔ ہم ایک سینڈ تک فضا میں معلق رہے۔ پھر نیچے گرتے چلے گئے۔“

کار نے ہوا میں آدھی قلابازی کھائی اور ۷۰ میٹر نیچے سطح آپ سے جا ٹکرائی۔ دریا کوئی ۱۲۰ میٹری میٹر گہرا تھا۔ کار اس میں اٹنی حالت میں جا گری اور ساکن ہو گئی۔ اگر

نیلی اور لڑکے سیٹ بیلت نہ باندھے ہوتے ہوتے تو شاید اس حادثے سے ان کا بچ نکلنا یقینی نہ ہوتا۔ کار کا اگلا حصہ دریا کی ریتلی تہ میں جھس گیا تھا اور پچھلا حصہ اوپر اٹھ گیا تھا۔ اس لیے لڑکوں کو سانس لینے کے لیے تھوڑی سی جھکی ہوا میسر تھی۔ رائیگل نے اپنی سیٹ بیلت سے نجات پائی اور ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر غوطہ کھا گیا اور با آواز بلند مارنے کے لیے پکارنے لگا۔

ایس اپنے جسم کو توڑ موڑ کر اپنی ناک اور منہ سے آب کے اوپر رکنے ہوئے تھا۔ اس کا سر سیٹ سے لگا ہوا تھا جو کار کے اٹنی حالت میں ہونے کے سبب اس کے سر کے اوپر آ گئی تھی۔ وہ سیٹ بیلت میں جکڑا ہوا تھا جس سے باوجود کوشش کے اسے نجات نہ مل رہی تھی۔ پھر وہ ہاتھوں نے پانی کے اندر ٹوٹنے ہوئے اس کی ٹھوڑی پکڑ لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے ایک آواز سنی۔ ”تم سانس لے سکتے ہو۔ ذرا اپنی سیٹ بیلت کا کھٹکا کھول دو۔“

وہ آواز ۴۰ سالہ ڈیوڈ سیلون کی تھی۔ جونہی کار کے دریا میں گرتے وقت اس کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔ اس نے حادثہ رونما ہوتے دیکھتے ہی فوراً پیچھ دریا کے کنارے کی طرف اپنی کار دوڑا دی اور اس کے پیچھے پیچھے چلے آئے والا ایک اور کار والا امداد حاصل کرنے پر تہمت کی طرف بھاگ اٹھا۔

سیلون کو چیخنے چلانے کی آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ وہ ایک مقامی یونیورسٹی کی طرف سے فنڈ ریزنگ کا کام کر رہا تھا اور اس وقت بھی اسی سلسلے میں کہیں جا رہا تھا۔ اس نے فوراً ہی اپنا اوور کوٹ، سپورٹس جیکٹ اور جو تے اتارے اور پانی میں چھلانگ لگا دی۔ اس نے اپنی عینک بدستور لگا رکھی تھی۔ پانی پینے تک اونچا اور انتہائی برفیلا تھا۔

”میرا خیال تھا شاید وہ مجھ مرچکا ہے اور میں اس کی جان بچانے سے قاصر رہ گیا ہوں۔“ اس نے بعد میں بتایا تھا۔ ”وہ اپنی سیٹ بیلت سے نجات حاصل نہ کر پا رہا تھا۔ میں پانی میں ہاتھ مارتے ہوئے اس کی سیٹ بیلت کا

دھک کر رہا۔ لیکن میرے ہاتھوں میں پانی ہی آتا رہا۔“ جب سیلون یوں پانی میں ہاتھ مارتا پھر ہاتھ تو ایس کے ہاتھ آئے۔ آخر اپنی سیٹ بیلت کا کھٹکا تلاش کر ہی لیا۔ اس کے ہاتھ سے آزاد ہوتے ہی سیلون نے جو ایک ایتھلیٹ رہا تھا اس کو کار سے نکالا اور دریا کے کنارے پر لاکر ڈال دیا۔ اس وقت وہ دونوں سخت تھکے ہوئے اور سردی سے کپکپا رہے تھے۔ وہاں جمع ہو جانے والے لوگوں نے فوراً رائیگل اور ایس کو ایک قریبی گھر میں پہنچا دیا۔

”میرا خیال تھا میرا کام ہو چکا ہے۔“ سیلون نے بعد میں بتایا تھا۔ لیکن اسی وقت ایک عورت چلائی تھی۔ ”ارے! ان کا ڈرائیور کہاں گیا؟“

سیلون سر اسیمہ سا ہو گیا۔ واقعی وہ کار بغیر ڈرائیور کے تو نہ ہو سکتی تھی۔ اس نے مڑ کر دریا میں اٹنی ہوئی کار کو دیکھا۔ وہ ڈرائیور اب کہاں زندہ رہا ہوگا؟ یہ ناممکن ہی لگتا دیتا تھا۔ لیکن ایک مہموں امید کے سہارے وہ اٹنی ہوئی کار کی طرف بڑھ گیا۔

ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ریت میں دھنسا ہوا اور جام تھا۔ اسی وقت ۶۱ سالہ سٹیفن پنہر جس نے ایمر جنسی کالج کی تھی، سیلون سے آن ملا۔ لیکن دونوں میں سے کوئی بھی دروازہ نہ کھول سکا۔ انھیں ہینڈل کے ساتھ شتی لڑتے کئی منٹ گزار گئے۔ پھر بالآخر انھوں نے پورا زور لگا کر دروازہ کھول ہی لیا۔ انھوں نے اندر جو پہلی چیز دیکھی وہ لمبے لمبے ٹھسے بال تھے جو سیٹ بیلت سے الجھے ہوئے تھے۔ تو اس نے فوراً ڈرائیور ایک عورت تھی جو ان لڑکوں کی ماں ہوگی۔ وہ پانی میں ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ وہ ایک مردہ عورت کی طرح تھیں۔ اس کا چہرہ اور ہونٹ پیلے پڑے ہوئے تھے۔ دونوں آدمیوں نے اسے کار سے باہر کھینچ نکالا۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک کرخت سی تحمانہ آواز سنی۔ ”اسے جلدی کرنا۔ اسے پالے جاؤ۔ ہم کار کو اٹھانے لگے ہیں!“ یہ ٹیم کے سربراہ تھے فورڈ کا سابق نائبیر فائر چیف۔

ٹیم مور اس وقت تھیں مورڈ وینچر سٹور کے عقب میں وقت پوسٹ آفس میں ڈاک جانچ پڑتال کر رہا تھا۔ جب

اس نے خریداروں کی کھڑکی پر کسی کو زور زور سے دستک دیتے اور چلا چلا کر کسی کار کے دریا میں گر جانے کی خبر دیتے سنا۔ مور انسانی جانیں بچانے کا ۳۰ سالہ تجربہ رکھتا تھا۔ وہ تعینت فورڈ ایسٹ سکواڈ میں کام کر چکا تھا۔ اس چھوٹے قصبے میں ہر کوئی ایک دوسرے کی مصروفیت سے آگاہ رہتا تھا۔ اس لیے بہت سے لوگوں کو معلوم تھا کہ مور اس وقت پوسٹ آفس میں ہی ہوگا۔

مور فوراً ہی اپنی ڈاک گاڑی میں سوار ہوا اور ایک ہی منٹ میں دریا پر جا پہنچا۔ وہاں سیلون اور سپرنٹنڈنٹ کو بازوؤں میں اٹھائے کھڑے تھے، تینوں آدمیوں نے مل کر اسے کار کے انڈر کیچ میں ڈالا اور اوندھے منہ ملتا دیا۔ اس کے منہ سے پانی نکلنے لگا۔ لیکن یہ تھوڑا سا ہی تھا۔ لیکن لوگ سانس کی نالی میں پانی چلے جانے کے باوجود بھی مر جایا کرتے ہیں۔ اسے ”خشک غرقابی“ کہتے ہیں اور ایسا تقریباً ۱۵ فیصد کیسوں میں ہوتا ہے۔ اس میں گردن کے عضلات سکڑ جاتے ہیں اور پیچھڑوں میں آکسیجن پہنچنے کا راستہ بند ہو جاتا ہے۔

ٹیم مور کو اپنی زندگی میں ایسے بے شمار حادثات دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ بلکہ اس نے کئی بیمار یوں کے مریضوں کو موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہوتے دیکھا تھا۔ جن میں سے صرف ایک ہی جانبر ہو سکا تھا۔ باقیوں کو قبریں ہی نصیب ہوئی تھیں۔ اس نے نیلی کی نبض ٹولی۔ وہ بہت سست تھی، مگر مضبوط تھی۔ پھر اس کے حلق سے خرخراہٹ جیسی آوازیں خارج ہونے لگیں۔ وہ سانس لے رہی تھی۔ ”جاگ جاؤ!“ سیلون چلا کر اس سے بولا۔ ”جاگ جاؤ! جاگ جاؤ!“

گرم پانی میں چلے جانے والے بالعموم فوراً ہی ڈوب جایا کرتے ہیں۔ انھیں مرنے یا کسی مستقل دماغی عارضے میں مبتلا ہو جانے میں چند ہی منٹ لگتے ہیں۔ لیکن سرد پانی میں غرق ہو کر مرنے میں کچھ زیادہ ہی دیر لگتی ہے۔ کیونکہ یہ جسم ٹھنڈا کر دیتا ہے۔ پتھر مایا غیر متوازن طور پر پست درجہ حرارت (۳۵ ڈگری سے نیچے) دل و دماغ

کو انتہائی مہلک طور پر نقصان پہنچاتا ہے۔ لیکن بعض حالات میں یہ اکثر فائدہ مند بھی ثابت ہو سکتا ہے کہ یہ دل کی دھڑکن اور عملِ نفس کو ست کرتا ہے اور بچا لیے جانے کے لیے وقت مہیا کرتا ہے۔

برفیلے نیم محمد پانی میں تقریباً غرق ہو جانے والے لوگ بغیر کسی جسمانی یا دماغی نقصان کے ایک گھنٹے تک اغراق کو جمیل سکتے ہیں۔ ایسے لوگ نیلے ہونٹوں، بندنٹس اور غیر محسوس نبض کے ساتھ پہلی نظر میں بچ نکلتے والے نہیں دکھائی دیتے۔ لیکن بچانے والے کارکنوں کے پاس کہنے کے لیے ایک جملہ ہوتا ہے۔ ”کوئی شخص مردہ نہیں ہوتا اگر وہ گرم اور مردہ نہ ہو۔“

نیلے کو اپنے بچانے والوں کی آوازیں لاکھوں میل دور سے آتی سنائی دے رہی تھیں۔ اس کے حواس آہستہ آہستہ بیدار ہو رہے تھے۔ اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے لاکھوں نیلی اور سفید روشنیاں تیزی سے خلا کو چیرتی ہوئی اس کے قریب سے گزر رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک اوچی سی ٹانائوس سی آواز سنی پھر وہ اپنے گرد و پیش سے بلند ہونے والی آوازوں کو سننے لگی۔ پھر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔

”کیا میں زندہ ہوں؟“

”ہاں ہاں تم بالکل زندہ سلامت ہو۔“ آدمیوں نے اسے تسلی دی۔ ”تمہارے لڑکے بالکل خیریت سے ہیں۔ وہ پانی سے نکال لیے گئے ہیں اور لوگ ان کی خبر گیری کر رہے ہیں۔“

نیلے مسکرائی ”میں بہت سرد ہو رہی ہوں۔“ اس نے کمزوری آواز میں کہا۔ اس کی یہ بات شاید وہاں موجود کسی عورت نے سن لی۔ اس نے فوراً ہی ایک سلپنگ بیگ اور کبل پل کے شکاف سے نیچے پھینک دیے۔

”کیا تمہیں یاد ہے کہ کیا ہوا تھا؟“ مور نے نیلی سے پوچھا۔

”ہاں.....“ نیلی نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ”میری کار پیل پر سے نیچے گر گئی تھی۔“

”اس کی حالت سنبھل رہی ہے۔“ سٹیشن سپرنٹرنے

جو ایک ہسپتال میں سرجن تھا کہا۔

اس مہم سے فارغ ہو کر مور گھر چلا گیا۔ اس نے لباس تبدیل کیا اور ترسیل ڈاک کا کام ختم کیا۔ اب وہ اس کام کو چھوڑ چکا ہے۔ لیکن اس سے پہلے اسے اس کی خدمات کے اعتراف میں اہل قصبہ کی طرف سے اعزازی اسناد سے نوازا گیا۔

”ایسا زندگی میں ایک ہی بار ہوتا ہے۔“ اس نے اس موقع پر کہا تھا۔ ”کسی کی زندگی بچانے کے مواقع بار بار نہیں آتے۔“

ڈیوڈ سیلون اس واقعہ کے کئی گھنٹوں بعد تک بھی کچھ رہا تھا۔ وہ اس حادثے کے بارے میں بہت کم بات کرتا ہے۔ وہ اب یونیورسٹی چھوڑ چکا ہے اور شاعری کی طرف مائل ہو چکا ہے۔

نیلے البتہ اکثر اس حادثے کو یاد کرتی رہتی ہے، جس نے تقریباً اس کی جان ہی لے لی تھی۔ لیکن وہ اس سے خوف زدہ نہیں معلوم ہوتی۔

نیلے کا وہ باقی دن ہسپتال میں گزرا۔ جہاں اسے گرمی پہنچانی گئی اور علاج معالجہ کیا گیا۔ اگلی شام اس کا شوہر نبٹ اسے کار میں دھکا کر گھر لے گیا۔ جہاں اس کے ہمسایوں نے اس کا پُر جوش استقبال کیا۔ اگلے دن اس کی سہیلیاں اس کے لیے پھولوں کے گلدستے لے کر آئیں۔ ان سب نے باری باری اسے لپٹایا اور حیات نو پر اسے پُر جوش مبارک باد دی۔ پھر ان کے کہنے پر اس نے اس حادثے کے بارے میں یوں اپنے تاثرات کا اظہار کیا:

”میرا آخری بقائی ہوش و حواس یہ خیال تھا کہ میں شاید اب مرنے لگی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میرے دل میں بڑی شدت کے ساتھ یہ خواہش پیدا ہوئی، آخری خواہش! کہ کاش مجھے اتنی مہلت مل جائے کہ میں اپنے شوہر اور بچوں کو یہ بتا سکوں کہ میں ان سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ شاید یہ جذبہ محبت کی کشش اور قوت ہی تھی جس نے مجھے زندہ رکھا.....“

بدلتے زمانے کی خبر دیتا اچھوتا افسانہ

اپیل

محمد عباس ثاقب

ایک مفلس قلم کار کی حیرت انگیز کہتا، اپنی بیٹی کا بیاہ رچانے کے واسطے بڑی عجیب راہ اختیار کرنی پڑی

”یہی تو اصل فساد کی جڑ ہے..... اور میں تو کہوں

امداد کی امید لے کر آئی تھیں۔“

یہاں ہزار روپے بھی مل گئے تو عزت سے بچی رخصت

نیوز پیکل سے۔ ویسے بھی فلم چلانا اور لیمرے کے سامنے سنسنی خیز نیوز پروگرام کرنا بالکل مختلف باتیں ہیں۔ نہ

میری شخصیت اس کے لیے موزوں ہے، اور نہ مجھ میں الزام اور ہبتان تراشی سے لوگوں کی عزت اتارنے کی جرات اور صلاحیت ہے۔“

”اور وہ جو آپ نے تین خاکے لکھ رکھے ہیں ڈراما سیریل کے۔؟“

”بھول جاؤ بی بی..... بڑے پروڈکشن ہاؤس صرف بڑے ناموں کے پیچھے بھاگتے ہیں، نئے ڈراما نگاروں سے سرنہیں کھاتے۔ اور کسی نئی پارٹی کو کھانی سادی تو سمجھو اسی وقت ان کی ہوگی۔“

”وہ تو ٹھیک ہے لیکن اس طرح کیسے گزارا ہوگا؟ مکان مالک ۴ ماہ سے کرایہ بڑھانے کا مطالبہ کر رہا ہے۔ ادھر پوری کوشش کے باوجود اس کے جینے کے نام پر ایک چار تنک نہیں خرید پائے۔ گھر کا خرچہ پورا ہو، بھی کچھ کروں ناں؟“

”میں ترجے وغیرہ کے کام کے لیے کوشش کر رہا ہوں۔ شاید اضافی آمدنی کا کوئی سلسلہ بن جائے۔“

”جو کچھ کرنا ہے جلدی سے کرو۔ ہمارے پاس زیادہ مہلت نہیں ہے۔“

”اللہ مالک ہے۔“

.....

”اجی کچھ سنا آپ نے؟“

”جلدی سے سنا دو کیا سنا ہے۔ مجھے نئے کالم پر کام شروع کرنا ہے۔“

”وہ میں یہ بتا رہی تھی کہ قمر بھائی کی مچھلی بیٹی اپنے شوہر سمیت ماں باپ سے ملنے آئی تھی۔“

”اوہ..... وہی جو بھاگ گئی تھی؟“

”ہاں، ان دونوں نے لاہور میں لڑکے کی خالہ کے گھر پہنچ کر شادی کر لی تھی اور کراچی واپس آگئے ہیں۔“

”اچھا؟..... پھر قمر بھائی اور باقی گھر والوں نے کیا حشر کیا بھگوانوں کا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ چھوڑ کر وہاں سے دو چار طمانچہ

مارے، ماں نے چٹیا پکڑ کے جھنجھوڑا، گالی گلوچ، لعنت ملامت کی۔ چھوڑ کر کا بھائی اچھل اچھل کے بہنوئی کا گلا دبوچنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن باپ نے اسے دل کی حسرت نکالنے کا موقع نہیں دیا کیوں کہ داماد آتے ہی سر کے پیروں میں گر گیا تھا۔“

”ظاہر ہے معاف کرنا پڑا ہوگا..... اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔“

”ہاں، پھر بیٹی نے ماں کو خوش خبری سنائی کہ وہ پیٹ سے ہے تو رہی سہی ناراضی بھی دور ہوگئی۔ قمر بھائی کے لیے یہ بھی خوشی کی بات ہے کہ لڑکا بینک میں ملازم ہے۔“

”چلو جو ہوا، اچھا ہی ہوا۔ نئے دور کی نئی روش ہے بی بی۔“

.....

”میں نے کالم میں رحمت خالہ کی پوتی کی شادی کے لیے مالی تعاون کی اپیل کی ہے۔ سنو گی؟“

”سنائے۔“

”دوستو! کیا ہم نے کبھی غور کیا ہے کہ موجودہ زمانے میں گناہ کمانا آسان سے آسان تر اور نیکی کمانا انتہائی مشکل ہوتا جا رہا ہے۔ لہذا ہمارے لیے از حد ضروری ہے کہ نیکی کمانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ میں آج یکم رمضان کے مبارک دن آپ کو ایک عظیم نیکی میں حصہ دار بننے کی دعوت دیتا ہوں۔ عید کے بعد ایک بچی کی شادی کرانے کے لیے آپ سب سے ہر ممکن مالی تعاون درکار ہے۔ بچی کے والدین اس فریضے کی ادائیگی کی قطعاً استطاعت نہیں رکھتے۔ آپ اپنے عطیات درج ذیل اکاؤنٹ میں جمع کر سکتے ہیں۔“

”آپ نے واقعی بہت دردمندانہ اپیل کی ہے۔ اللہ کرے یہ لوگوں کے دلوں پر پھر پورا اثر کرے۔“

”انشاء اللہ ضرور اثر ہوگا۔ میں اپنے فیس بک پیج پر بھی یہ اپیل کروں گا۔“

”خیریت تو ہے بی بی؟ کچھ فکر مند نظر آ رہی ہو۔“

”اس کی ہونے والی ساس عیدی دینے آئی تھی آج۔“

”اچھا؟..... اتوار کو ہم بھی چلیں گے شیراز بیٹا کا جوڑا لے کر۔ کیا کہہ رہی تھیں شینہ بہن؟“

”وہی باتوں باتوں میں جتاری تھیں کہ اب ان سے کام نہیں سنبھلتا۔ گھر بڑا ہونے سے کام بھی بڑھ گیا۔ شاید شیراز نے بھی شادی کے حوالے سے معاملات آگے بڑھانے کی فرمائش کی ہے۔“

”اگر وہ کھل کر کچھ کہیں تو صاف بتا دینا کہ ہمیں ان کے وعدے کے مطابق کم از کم ڈیڑھ سال کی مہلت درکار ہوگی۔“

”ہم بیٹی والے ہیں، یہ صاف صاف کہہ دینے والی بات ہمیں زیبائیں۔ ہاں عاجزی سے یہ بات کان میں ڈالی جاسکتی ہے۔“

”چلو ایسے ہی سہی۔ شیراز بہت اچھا لڑکا ہے، میں اسے سمجھاؤں گا تو ضرور میری بات مان لے گا۔“

.....

”سنو بی بی، رحمت خالہ کو بلاؤ۔“

”اچھا، کچھ رقم اکٹھی ہوئی کیا؟“

”ہاں، اللہ نے اپنے کچھ پیارے بندوں کے دلوں میں نیکی ڈالی ہے۔“

”خالہ رحمت تو بہت دعائیں دیں گی۔ ان کی توجہ نکلنی جاری ہے ہر گزرتے دن کے ساتھ۔ صرف ۱۵ دن بعد تو شادی ہے۔ کتنے جمع ہوئے؟“

”۳۰ ہزار۔“

”اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، اس نے ہمارا بھرم رکھا اور خالہ رحمت کا کام بھی ہو گیا۔ باسی عید کو تو شیراز اور اس کی امی آئیں گے۔ میں عید کے تیسرے دن بلا لیتی ہوں خالہ رحمت کو۔“

”ایسا کر تو تم خود جا کر دے آنا۔ اچھا نہیں لگتا انہیں

یہاں بلا کر دینا۔ احسان مندی کا اظہار کر کے خواہ مخواہ شرمندہ کریں گی۔“

.....

”اجی سنتے ہو، میرا تو دل ہول کھا رہا ہے۔ اب کیا بنے گا؟ شینہ بیگم نے تو تقریباً صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ انہیں بقرعید کے فوراً بعد کی شادی تاریخ چاہیے۔“

”معاملہ واقعی بہت سنگین صورت اختیار کر گیا۔ ان کا لہجہ دھمکی والا نہیں تھا لیکن سب باتوں کا مفہوم یہی نکلتا ہے۔ شیراز سے بات کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں۔ اگر یہ سب اس کی رضامندی کے بغیر ہو رہا ہوتا تو وہ ضرور مداخلت کرتا۔ سب سے بڑا مسئلہ وہی ہمارا نام نہاد بھرم ہے۔ یہ صاحب زادے اور موصوف کی والدہ یقین رکھتے ہیں کہ ان کے مشہور و معروف سر کے لیے چند دنوں کے نوٹس پر بیٹی کی شادی کرنا کوئی مسئلہ نہیں اور ہم نے اسی لیے پیٹنگنی تیاری کرنے کی زحمت نہیں کی۔“

”ہم انہیں کو بتا بھی تو نہیں سکتے کہ ہمارے پاس تو سرے سے وسائل ہی نہیں۔ پتا ہے، شیراز کا عید کا جوڑا لیتے ہوئے شینہ بھائی نے کیا کہا تھا؟“

”نہیں، تم بتاؤ۔“

”ان کی باتوں کا مطلب یہ تھا کہ شیراز کے بڑی کمپنی میں جانے اور دفتر کی طرف سے گاڑی ملنے کے بعد سے ان کی کروڑ پتی مند بار بار چکر لگانے لگی ہے۔ جب کہ نند نے شیراز کی بیروزگاری کے دور میں اپنی بیٹی کے لیے اس کا رشتہ ٹھکرا دیا تھا۔ شینہ بھائی نے جتایا کہ اس حوالے سے ان کی ساس بھی دباؤ ڈال رہی ہے۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ شینہ بھائی خود بھی ڈگ مگاری ہیں مگر اکلوتے بیٹے کی مرضی کے آگے مجبور ہیں۔“

”یہ تو بے حد تشویش ناک صورت حال ہے۔ ہم نے مزید مہلت مانگی تو انہیں منگنی توڑنے کا بہانہ مل جائے گا۔ ایسے میں شاید شیراز بھی مزاحمت نہ کر پائے۔“

”ہمیں فوراً شادی کا بندوبست کرنا پڑے گا چاہے

رانا فضل حسین
انتخاب: ابن قتیل جادید احمد صدیقی

سرخ پھول

دو بیٹوں کا ماجرا، وہ جان بچانے پر آمادہ نہ تھے، نہ بھاگنے پر تیار
تن پیر کی بلند چوٹی پر نئی قبروں کے کھدنے سے ذرا پہلے کی داستان
کبھی دشمنوں میں سے ہمدرد بھی مل جایا کرتے ہیں

ساگ تیار کروے۔ کھانا پک گیا۔ اس نے لڑکوں سے کہا ”مچھوڑو روٹی وال ساگ کو، تم دونوں بھاگ جاؤ، جان بچاؤ۔“ دونوں لڑکے کہنے لگے۔ ”ہم نہیں بھاگتے۔ فوجی ہمارے گرفتار آدھیوں کو مار ڈالیں گے۔“ دل محمد نے بہت سمجھا یا گمروہ نہ مانے۔ پھر کہا ”تم دونوں گرم گرم کھانا کھاؤ۔“ انھوں نے کھانے سے انکار کر دیا۔ اس نے سوچا ”ان کا آن پانی ختم ہو گیا ہے۔ ان کی بھوک اخیر ہوئی ہے۔ ان کی زندگیوں کا آفتاب غروب ہونے کو ہے۔“

دونوں لڑکے کھانا لے کر تن پیر والی فوجی پکٹ پر جا پہنچے۔ میجر بلونت سنگھ نے لڑکوں کو کھانا لے کر آتے دیکھا۔ وہ اپنے پہلو میں ہاتھ دبا کر پریشانی کے عالم میں ٹھیلے لگا۔ اس نے مقبول اور عزیز سے پوچھا ”اے گھر سے کھانا لائے ہو؟“ لڑکوں نے کہا ”نہیں ہمارے گھر آپ لوگوں نے جلا دیے ہیں۔“ میجر بلونت نے پوچھا ”تمہارے گھر یا خاندان کے باقی افراد کہاں گئے۔“ جواب ملا ”پرسوں جب ہمیں گرفتار کیا تو پتا نہیں ہمارے خاندان کے باقی

کی بلند گول چوٹی کی مشرقی جانب شام ڈھلے مشین کن کی فائرنگ ہوئی۔ آ رہا ہے کے اونچے پہاڑ گونج اٹھے۔ اکتوبر کی ۱۸ تاریخ تھی سن ۶۵ء کے اگست اور ستمبر کی ابتدا پر بادی کا نشان بن گیا۔ سورج غروب ہونے کو تھا۔ آسمان صاف تھا۔ کہیں بھی بادل نہیں تھے۔ نہ جانے کس جگہ کی فوجیوں نے مشین کن کیوں چلائی۔ خوفزدہ پرندے آسمان کی خانقاہ کے بڑے پرانے دختوں سے اڑ گئے۔ گیدڑ، گھوڑے اور جنگلی باڑے ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ پروردی گوجراں کے دیہاتوں کے لوگ سہم گئے۔ معلوم نہیں یہ فائرنگ کس جگہ کی فوجیوں کی تھی۔ فائرنگ کس پر ہوئی مگر بے بس تھی۔ شام سے پہلے ہی دل محمد کے گھر ۱۳/۱۳ سال کی عمر کے گھروہ کے آئے، کہنے لگے ”فوجیوں نے ۱۲ آدمیوں کا کھانا طلب کیا ہے۔“ دل محمد نے اپنی بیوی سے کہا ”اے جلدی کر روٹی بھات

تن پیر

”وہی ناں..... اتنی رقم کہاں سے میرے پاس آئی؟.....“

”شاید آپ نے قرض لیا ہے دفتر سے؟“

”اتنی بڑی رقم بھلا وہ کیوں قرض دیں گے مجھے؟“

”تو پھر؟“

”بس یوں سمجھو اللہ نے بندوبست کر دیا۔“

”اگر آپ بتانا نہیں چاہتے تو میں آپ پر زور نہیں ڈالوں گی۔“

”میں تم سے بھلا کیسے کوئی بات چھپا سکتا ہوں؟ یہ بھی بتا دیتا ہوں، خواہ زبان کھول کر تمہاری نظروں سے ہمیشہ کے لیے گر جاؤں۔“

”یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں ہرگز یقین نہیں کر سکتی کہ آپ نے کوئی ناجائز کام کر سکتے ہیں۔“

”مجبوری کے عالم میں مردار بھی جائز ہو جاتا ہے۔ اور یہ تو میری بیٹی کی زندگی کا سوال تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے رحمت خالہ کی پوتی کی شادی کے حوالے سے اپیل کی تھی.....“

”ہاں، ہاں..... آپ کے جمع کیے تیس ہزار روپوں سے اچھی طرح بچی کی شادی ہو گئی۔“

”اصل جمع شدہ رقم اس سے کئی گنا تھی..... میں نے عہد کیا تھا کہ یہ رقم کسی اور مستحق کو بیٹی کی شادی کے لیے عطیہ کر دوں گا۔ لیکن جب مجھے اپنی بیٹی کی شادی کے وقت کڑی آزمائش کا سامنا کرنا پڑا تو مجھے اپنے آپ سے زیادہ مستحق کوئی نظر نہ آیا۔“

”اوہ..... تو یہ سب انتظام آپ نے؟“

”ہاں..... میری اپیل کے الفاظ یاد کرو..... ایک ایسی بچی کی شادی کرانے کے لیے آپ سب کا ہر ممکن مالی تعاون درکار ہے جس کے والدین اپنے اس فریضے کی ادائیگی قطعاً استطاعت نہیں رکھتے۔ میں نے تم ازم کسی کو دھوکا تو نہیں دیا ناں!“

”ہمیں جان پھیلنا پڑے۔ یہ مٹنگی ٹوٹ گئی تو صرف ہمارا بھرم ہی ختم نہیں ہوگا، میری بیٹی کا مستقبل تباہ ہو جائے گا۔“

”ایک مسئلہ اور بھی ہے بی بی۔ بالفرض ہم اپنی خواہش کے مطابق ڈیڑھ سال کی مہلت حاصل کر لیں تب بھی کیا ضمانت ہے کہ ہمیں ایک بار پھر یہی صورت حال درپیش نہیں ہوگی؟“

”بات تو آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ ڈیڑھ سال میں کون سا ہمیں قارون کا خزانہ ملنے والا ہے۔ لیکن پھر کریں کیا؟“

”جب آگ میں کودنا ہی ہے تو پھر انتظار کیا؟ ہم یہ رشتہ ٹوٹنے کے تحمل نہیں ہو سکتے۔ ہم کس کس کو یقین دلائیں گے کہ یہ مٹنگی ہماری بیٹی کے کسی عیب کی وجہ سے نہیں ٹوٹی۔ شیراز جیسا رشتہ ملنا بھی محال ہے۔ اسامیہ بھی جذباتی اور نفسیاتی کرب میں مبتلا ہو جائے گی۔“

”تو پھر کیا کریں؟“

”شینہ بہن کو پیغام بھیج دو کہ پندرہ دن بعد اگر شادی کی تاریخ لے جائیں۔“

”لیکن ہم اتنی جلدی.....“

”یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔ اپنی بیٹی کو اچھی زندگی دینے کے لیے میں کسی بھی حد تک جا سکتا ہوں۔“

”مبارک ہو بی بی..... اللہ نے ہمارا بھرم قائم رکھا۔“

”آپ کو بھی مبارک ہو..... اللہ سب والدین کو اپنی بیٹیاں ایسے ہی عزت سے رخصت کرنے کے قابل بنائے۔“

”تمہارے لیے میں گرم جوش کچھ کہے.....“

”ایسی کوئی بات نہیں..... بس ایک بلی سی خلت ہے۔ آپ نے زندگی میں پہلی مرتبہ مجھے پوری طرح اعتماد میں نہیں لیا۔ اس سوال کا جواب ابھی تک آپ پر ادھر ہے۔“

افراد کہاں گئے۔" میجر نے پوچھا "تمہیں کوئی بھی اپنا رشتہ دار نہیں ملا۔" مقبول نے کہا "لوگ عزت اور جان بچانے کے لیے روپوش ہو گئے ہیں۔ پورا گاؤں ویران ہے۔ کسی جگہ ہونے مکان کے قریب کہیں کوئی بوڑھا یا معذور شخص جو بھاگ نہیں سکتا تھا بیٹھا حسرت سے دیکھ رہا تھا یا بھوکے پیاسے اداس کتے بیٹھے ہیں۔"

میجر بلونت کی پہلی ہمدردانہ کوشش تو کام ہوئی۔ اس نے پھر ان دونوں پیر بہنچال کے خوبصورت شہزادوں کو پانی لانے کے بہانے بھیج دیا۔ وہ چار تھا کر رہا تھا "یا اکل تخت کے واسے گورو جی، یہ دونوں تجیلے بھگرو کہیں بھاگ جائیں۔" اصل سے بھلا کوں بھاگ سکتا ہے۔ میجر بلونت کا خیال تھا شاید اجڑے ہوئے گاؤں کا کوئی سمجھدار شخص ان خوبصورت لائے کوں قد کاٹھ کے لڑکوں کو موت کے پیچھے سے نکال لے جائے۔ وہ اس نیکی کی جانب بار بار دیکھ رہا تھا جہاں سے یہ لڑکے پانی کی پاؤں کی جانب اوجھل ہوئے تھے۔ اس نے دیکھا کہ دونوں بچے پانی کی باٹی لیے آرہے ہیں۔ ان کو بچانے کی یہ کوشش بھی رائیگاں ہوئی۔ وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کا دل اچھل کر سینے سے باہر آ رہا ہے۔ مگر فوجی وردی کے مضبوط کپڑوں نے اس کے دھڑکتے دل کو اندر ہی روک لیا۔ دونوں گھرو پانی کی باٹی لے کر اس کے سامنے تھے۔ اس نے پھر بارے ہوئے ارمان کو نکلی دی اور ایک جتن اور کیا کہ بچے ملک الموت اور فوجی گولیوں سے بچ جائیں۔ اس نے پانی کی باٹی پر نظر ڈالی اور بچوں کو ڈانٹتے ہوئے کہا "یہ گندہ گدلا پانی کہاں سے لے آئے ہو تم۔" فوجی بوٹ کی ٹھوک مار کر پانی کی باٹی الٹ دی اور کہا "جاؤ کہیں دور سے اچھے چشمے کا صاف پانی بھر کر لاؤ۔"

مقبول اور عزیز باٹی اٹھا کر پھر پانی لینے چل پڑے۔ عزیز کا والد رسیوں سے جکڑا ہوا تھا۔ وہ میجر بلونت کی ہمدردی کو بھانپ گیا۔ اس نے انھیں پھاڑ پھاڑ کر بچوں کو دیکھا کہ اگر یہ دونوں اس سے نظر ملائیں تو انھیں بھاگ کر جائیں بچانے کا کوئی اشارہ دے۔ مگر ان لڑکوں نے پلٹ کر دیکھا ہی نہیں۔ زندگی روٹھ گئی تھی۔ ملک الموت بھی ان پر ترس کھار رہا تھا۔ مگر وہ اپنے کام اور ذمہ داری سے مجبور تھا۔ شاید اسے شداد کے بعد ان دو لڑکوں کی خوبصورتی پر رحم آیا ہوگا۔ میجر بلونت اور ملک الموت دعا کر رہے تھے کہ یہ دونوں بائیسے سندر لڑکے زندگی کے لیے بھاگ جائیں۔ ۱۲ افراد کے اس قیدی قافلے میں ۱۳ آدمی بالغ تھے۔ ایک عزیز کا باپ دوسرا مقبول کا باپ اور ایک ان کا چچا۔ اور ۹ نابالغ بچے تھے۔ دیکھتے دیکھتے مقبول

اور عزیز پھر پانی کی باٹی لیے واپس آ گئے۔ میجر بلونت کا چہرہ اتر گیا۔ مگر فوجی نوکری کے ہاتھوں مجبور تھا۔ تاسف کے ساتھ ہلا کر تم آخر پانی لے ہی آئے! افسوس۔"

سورج غروب ہو رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کی سرخی اس دن آسمان کے اطراف میں لہو بھونک کھیر رہی تھی۔ ۱۶ مئی کو بھی ڈوبتے سورج کی سرخی کچھ زیادہ ہی شوخ رنگ تھی۔ والی قطر میں کرپا لہو سورج، آنسو آنسو دھرتی آسمان اور سورج دوہے تھے۔ ان ۱۲ قیدیوں کے قافلے کو میجر بلونت سنگھ کی نگرانی میں دیا ہوا تھا۔ اس نے ۲ دنوں میں ان معصوم اور بے گناہ قیدیوں پر کوئی تشدد نہ ہونے دیا۔ میجر نے مقبول سے پوچھا "تم کتنے بھائی ہو؟" اس نے جواب دیا۔ اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہوں۔ ہم چچے کے ۳۰ بھائی ہیں۔" میجر نے ہنس کر کہا "پھر تو گھر کی پلاؤں ہوگی۔" مقبول نے کہا "خالاکوں اور چوہوں کے بیٹے ملا کر میرے بھائیوں کی تعداد سو سو کے لگ بھگ پوری ایک مہینی ہے۔" میجر بلونت نے پوچھا "تم پڑھتے ہو؟" ہاں میں پڑھتا ہوں۔ عزیز نے اور میں نے انی سال میٹرک کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا ہے اور کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔" میجر نے کہا "اس دور دراز پہاڑی چٹانی علاقے میں تعلیم کا شوق کیسے پیدا ہوا؟" مقبول نے کہا "میرا ایک چچا بہت پڑھا لکھا تھا۔ وہ شاعر، ادیب اور خطیب تھا، بڑا کاروبار تھا۔ اس نے لوگوں میں تعلیمی شعور بیدار کیا۔ لوگ اسے راجپوتی اور پیر بہنچال کا سرسید کہتے ہیں۔ اس کی وفات کے بعد میرے چچا افضل نے تعلیمی سہاٹی اور کاروباری ذمہ داریاں سنبھالی ہیں۔" میجر نے کہا "وہ باٹی فضل۔" جی ہاں وہی۔ آزادی کے لیے جہاد کرنا اگر بغاوت ہے تو سچ ہے۔" میجر بلونت تڑپ کر کہنے لگا "ارے ہونہار اور معصوم لڑکے تمہارے خاندان پر جو بیتے گی وہ تم نہیں جانتے۔" مقبول نے شہیدگی سے مسکراتے ہوئے کہا "میں سب کچھ جانتا ہوں۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مجھے اور عزیز کو بچانے کے لیے آپ نے بہت کچھ لگوائے۔ آپ خاتم ہومیر سے چچا کے اس ایک سال کے بچے کو بھی قیدی بنایا ہوا ہے۔ میں جانتا ہوں ہمیں قتل کر دیا جائے گا۔ ہم اس کے لیے خندہ پیشانی کے ساتھ تیار ہیں۔" میجر بلونت نے دلی لہجے میں کہا "جانتے ہو میں تمہارے ساتھ نرمی کیوں برت رہا ہوں؟" مقبول نے طنزاً ہنس کر کہا "نہ برتیں نرمی، سمجھ اور پھر نرمی کبھی بلونت نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے لرزتی آواز میں کہا "میرا بھی تمہاری طرح کا بیٹا ہے۔ تمہارے اور عزیز کے قد کاٹھ کا"

میں اسی سال میٹرک کر کے کالج میں داخل ہو گیا ہے۔ مجھے تمہارے بھائی پر ترس آ رہا ہے۔ میں تجھے اور عزیز کو چھوڑے دیتا ہوں لیکن سب قیدیوں کو، مگر ایک شرط ہے کہ اپنے باپ چچا کو گرفتار کرو۔" مقبول نے کہا کہ چچا کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں۔ اگر معلوم ہو جی تو گرفتار نہ کرواے۔ بے شک ہمیں سوبار شہید کیوں کر دیا جائے۔ میرے چچا کو تم بھی گرفتار نہ کر سکو گے۔ اس سے قوت نہ ملے گی برا کام لینا ہے۔"

بلونت نے موضوع بدلتے ہوئے کہا "تم یہ ۱۲ قیدی ہو، رب نے ہمیں بے گناہ مارنے کے لیے تو نہیں پیدا کیا تھا مگر میں بے گناہ ہوں مقبول! میرا کوئی چارہ نہیں چلتا۔" دفعہ ایک ہندو کرنل آگیا۔ اس نے فنی سے کہا "بلونت ان قیدیوں کے ساتھ نرمی؟ کیا ہو گیا ہے تجھے، ان کے جسم ابھی تک اجڑے نہیں گئے۔"

میجر بلونت نے کہا "سر یہ تین بڑے آدمی ملزم تو ہو سکتے ہیں۔ ان کو تباہ پانچ بچوں کا کیا قصور ہے۔ اگر ان چھوٹے تمام لڑکوں کو چھوڑ دیا جائے تو بے چارے کب دلی کا لال قلعہ فتح کر لیں گے۔" کرنل نے گرج کر کہا "کیوں؟"

میجر نے کہا "سر ان کو اگر چھوڑ دیا جائے تو یہ سیدھے اس ہاتھ کی طرف جائیں گے جہاں ان کا باغی بچا چھپا ہوا ہوگا۔ سر ہمارا خزانہ ان کے پیچھے جائے گا۔ اس طرح ہم اس باغی خاندان کے تمام افراد کو پکڑ لیں گے۔"

کرنل نے کہا "ارے بلونت تو تھیک ہی کہتا ہے۔ مگر درہال کیپ سے پہاڑی بریگیڈ کی ایک کمپنی ابھی تیجھنے والی ہے۔ ان کا کماندان قیدیوں کو مہماؤں کی طرح رکھنے پر تمہاری شامت نہ بن جائے۔ تو نے ان کے جسموں کی چوڑیاں اذیت دیا تھیں۔"

میجر بلونت نے کہا "سر اب پہاڑی بریگیڈ والے جائیں یا ان کے جاہلانہ کثوت..... میں تو ان معصوموں کے قتل عام سے لرز رہا ہوں۔"

کرنل نے ڈانٹتے ہوئے کہا "میجر تو فوجی افسر ہے اس نرمی اور ہمدردی کا مطلب کیا ہے؟"

میجر نے تڑپ کر کہا "مطلب یہ کہ ان دو لڑکوں کے قد کاٹھ اور اسی عمر کا میرا بھی ایک ہی بیٹا ہے۔ میں چاہتا تھا تمہیں بھی اپنے والدین کا اکلوتا بیٹا ہے۔ اس کی اور اس کے والدین زندگی بھر کی جینیں تو ان کی نسل ہی ختم ہو جائے گی۔"

دونوں افسر باتیں کر رہے تھے کہ درہال کیپ سے پہاڑی

بریگیڈ کے جلاوطن کا دست آگیا۔ شام ڈھل گئی مگر ڈوبے ہوئے آفتاب نے آج گہری لہو رنگ شفق آسمان کے کناروں میں پھیلا دی۔ ۱۲ آدمیوں کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیے۔ ایک سال کے باغی بچے کو باپ کے کاندھے پر کھڑ کر رسیوں سے جکڑ دیا گیا۔

۱۶ مئی کی شام غریباں کے بعد آج ایک چھوٹی سی شام غریباں اس کاروان نے روشنی ہوئی۔ کبھی تن پیر کی خانقاہ کے شرقی جانب لے جا کر پہاڑی بریگیڈ کے دستے نے یہ معصوم قیدی قطار میں کھڑے کئے اور مشین گن کا پورا پٹا داغ دیا۔ ہندے ہوئے معصوم ہاتھوں کو بے دردی سے قتل کرنے کی رپورٹ درہال فوجی کیپ میں جلدی پہنچائی تاکہ بہادر قاتلوں کو مہار پر چکر مل جائے۔ آسمان بالکل صاف تھا۔ اچانک بادل کا ایک سیاہ ٹکڑا فضا میں نمودار ہوا۔ قاتل پتلی روانہ ہوئی۔ ایک میل کے فاصلے پر پہنچی تھی کہ بجلی کی خوفناک کڑک کے ساتھ شدید ٹھالہ باری کا طوفان ٹوٹ پڑا۔ آسمان کی کشین گن کی فائرنگ سے قاتل فوجی درندے ڈٹی ہوئے گئے۔ بھاگ کر سید جہاں شاہ کے مکان میں پناہ لی۔ فوجی افسر پیر صاحب کے پاؤں پکڑ کر رونے لگا یا حیرت میں پانی ہیں۔ ۱۲ بے گناہوں کو قتل کرنے کی بھگوان اور آسمان سزا دینے کے ہیں یا حیرت دعا کریں آج ہم بچ جائیں۔

تن پیر ۱۲ بے گناہوں کو شہید کرنے کی تھوڑی سی سزا اٹھا۔ باری کے طوفان نے پر پا کی۔ آدھ آدھ پاؤں کے کولے ایسے برسے کہ درختوں کی شاخیں اور تھتے ڈھیر ہو گئے۔ درہال، تن پیر، چنال پیر، بیڑھی اور کنڈھی بدھل کے فوجی کیپوں میں اس ٹھالہ باری کے خوفناک طوفان سے گھبراہٹ اور ہیبت پھیل گئی۔ اسی خوف کے سبب قتل عام رکا۔ تن پیر سے فوجی کیپ اٹھا لیا گیا۔ گاؤں کے لوگ شہید گاہ پہنچے۔ گولیوں سے چھپائی لاشے اٹھائے گئے اور کنڈھان گلی میں اس خاندان کے باقی بابائیش کے مزار کے احاطے میں انھیں آسودہ خاک کیا گیا۔ جہاں ۱۲ شہیدوں کا خزانہ تھا وہاں بھی لوگوں نے چپوہرہ بنا دیا۔ ۱۲ شہیدوں کو جہاں دفن کیا گیا اسے شہید گنج کا نام دے دیا گیا۔ دونوں مقامات پر برہنہ لہو اڑے گئے۔ یہ دونوں جگہیں زیارت گاہ کی حیثیت اختیار کر گئیں جہاں شہیدوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا تھا۔ وہاں رات کے وقت تو س فوج کی شکل میں ہری لائٹ کی شعاعیں آسمان کی طرف پرواز کرتی ہیں۔ ارد گرد کے تمام دیہات کے لوگ اسے معصوم شہیدوں کی عظمت خیال کرتے ہیں۔ قطب الارشیت حضرت سائیں محل دین تعزیت کے لیے تشریف لائے۔ لوگوں

عطیہ فیضی سے نو سال بڑی تھیں۔ یہ بھی استنبول میں ۱۸۷۲ء کو پیدا ہوئیں۔ نازی بیگم نے ترکی کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں تعلیم حاصل کی۔ ان کو ترکی، انگریزی، عربی اور فارسی میں اچھی دستگاہ حاصل تھی۔ بعد میں انھوں نے گجراتی اور اردو زبان میں بھی مہارت پیدا کر لی۔

ابھی ۱۳ برس کی تھیں کہ ان کی شادی بمبئی کے قریب واقع ایک چھوٹی سی ریاست ججیرہ کے نواب سرسیدی احمد خاں سے کر دی گئی۔ سرسیدی احمد خاں کے اجداد حبشہ (اتھیوپیا) کے ساحل پر آباد تھے۔ وہاں سے نقل مکانی کر کے یہ بمبئی آئے اور ججیرہ کے جزیرے میں آباد ہو گئے۔ بعد میں وہ اس جزیرے کے حکمران بن گئے۔ یہ تحقیق نہیں ہو سکی کہ یہ خاندان ججیرہ میں کب آباد ہوا اور کب وہاں ان کی حکمرانی قائم ہوئی۔ سسرال میں نازی بیگم کو ریفیہ سلطان کا لقب دیا گیا اور وہ ہر بانی نس نازی ریفیہ سلطان آف ججیرہ کہلائیں۔ اپنے حسن عمل کی بدولت یہ جزیرے میں کافی ہر دل عزیز تھیں۔ ان کو علم و ادب سے گہرا لگاؤ تھا اور وہ ارباب علم کی بے حد قدر دان تھیں۔ مولانا شبلی نعمانی کی شہرہ آفاق تصنیف سیرت النبی ﷺ کی تیاری میں ان کی تحریک اور اعانت بھی شامل تھی۔ مولانا نے اس کا کافی حصہ ججیرہ کی پر سکون فضا میں رہ کر مکمل کیا۔

سفر یورپ کے دوران نازی بیگم کو علامہ اقبال اور

کئی دوسرے مشاہیر سے بھی ملاقات کا موقع ملا۔ علامہ اقبال ان کی علمی وجاہت سے بہت متاثر ہوئے اور یہ شعر ان کی نذر کیے:

اے کہ تیرے آستانے پر جہیں گستر قر
اور فیض آستان بوی سے گل بدر قر
روشنی لے کر تیری موج غبارِ راو سے
دیتا ہے ایلانے شب کو نور کی چادر قر

نازی بیگم نے شبلی نعمانی کی میزبانی کے علاوہ کئی بار علامہ اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی قائد اعظم محمد علی جناح، مسز سرجی نائیڈو اور ملک کے متعدد دوسرے نامور ارباب علم اور اہل سیاست کی میزبانی کا شرف بھی حاصل کیا۔ بقول نازی بیگم قائد اعظم ان سے فرمایا کرتے تھے کہ مجھے ججیرہ آ کر بہت آرام اور سکون ملتا ہے۔ وہ ججیرہ میں اپنا بیشتر وقت محل سے قریب باغ میں گزارا کرتے تھے۔

عطیہ فیضی نے بھی اپنی بہنوں کی طرح استنبول میں اعلیٰ تعلیم پائی اور ترکی، عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور گجراتی میں اچھی استعداد بہم پہنچائی۔ ان کی بڑی بہن نازی بیگم کی شادی ۱۸۸۵ء میں نواب ججیرہ (بمبئی) سے ہوئی تو یہ بھی ان کے ساتھ ججیرہ میں رہنے لگیں۔ عطیہ اپنے والدین کی بہت لاڈلی تھیں اور سب بہنوں میں زیادہ

برنس گارڈن کے عقب میں

۱۹۲۸ء میں میری ان سے ملاقات ہوئی یہ لوگ ان دنوں کراچی کینٹ اسٹیشن کے قریب کارلٹن ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ پھر برنس گارڈن میں جہاں اب آرٹ کونسل کی شان دار عمارت ہے۔ اس کے عقب میں عطیہ فیضی نے اپنے رہنے کے لیے خالص مشرقی طرز کا آرام دہ کشادہ مکان اور اس کے قریب چند قدم کے فاصلے پر آرٹ گیلری تعمیر کرائی۔ یہ لوگ کوئی ڈھائی یا تین سال اس مکان میں رہے ہوں گے کہ پھر پتا نہیں کیا ہوا کہ انھیں اس مکان سے اٹھ جانا پڑا۔ اس باغ میں وہ اپنا مکان حکومت کی اجازت کے بغیر تو نہیں بنا سکتے تھے۔ پھر وہ اس سے بے دخل کیوں کر دیے گئے، یہ معلوم نہیں ہو سکا۔ وہ دونوں عمارتیں اب تک خالی پڑی ہوئی ہیں۔ یہ ایک بڑا سانحہ تھا جو ان کے ساتھ پیش آیا قبل ازیں بمبئی کا 'ایوان رفعت' بھی بوجوہ بک چکا تھا۔ گھر سے بے گھر ہو جانے کے بعد یہ مختصر سا خاندان جس کا ہر فرد ضعیفی کی عمر کو پہنچ چکا تھا اور جسے کسی عزیز، رشتہ دار اور اولاد کا سہارا بھی میسر نہیں تھا، ہوٹلوں میں رہنے پر مجبور ہوا۔ جمع شدہ پونجی یا اندوختہ آخر کہاں تک ساتھ دیتا۔ کوئی روزگار کوئی کاروبار نہیں تھا.....

ہوئی۔ وہیں مصوری، افسانہ نگاری اور مضمون نویسی میں شہرت حاصل کی۔ وہاں سے اچانک ہندوستان آ گئے اور پھر بمبئی کے ہو رہے۔ قیام پاکستان کے بعد نازی بیگم اور عطیہ فیضی کے ساتھ یہ پاکستان آ گئے اور کراچی میں مستقل اقامت اختیار کی۔ کراچی میں ان کی زندگی کے آخری چند سال بڑی پریشانیوں میں گزرے اس کی کچھ تفصیل آگے آئے گی۔

بعض لوگوں نے اس شادی پر اعتراض کیا، شبلی نعمانی کو خبر ہوئی تو انھوں نے یہ شعر کہے:

عطیہ کی شادی پہ کسی نے نکتہ چینی کی
کہا میں نے جاہل ہے یا باحق ہے یا ناداں ہے
بتان ہند کافر کر لیا کرتے تھے مسلم کو
عطیہ کی بدولت آج اک کافر مسلمان ہے
مولانا شبلی نے ایک مرتبہ قیام ججیرہ کے دوران عطیہ کو مخاطب کر کے یہ اشعار کہے:

کسی کو یاں خدا کی جنت ہوگی تو کیوں ہوگی
خیال روزہ و فکر وضو ہوگی تو کیوں ہوگی
ہوئے روح پرور بھی یہاں کی نشہ آور ہے
یہاں فکر سے وجام و سبو ہوگی تو کیوں ہوگی

شوخی چنچل بھی اس کے ساتھ ہی وہ بڑی ذہین و فطین اور علم و ادب کی شیدائی بھی تھیں۔ ججیرہ ایک پر فضا جزیرہ تھا۔ نازی بیگم کی دعوت پر ملک کے بڑے بڑے اہل سیاست اور ارباب علم کی یہاں آمد آمد ہوئی ان میں مولانا شبلی نعمانی بھی شامل تھے۔ ان کو عطیہ کی ذہانت، علم و ادب سے شغف اور دوسرے اوصاف نے بے حد جکڑ لیا اور وہ ان کے مداح بن گئے۔ عطیہ بھی شبلی نعمانی کی بہت قدر دان تھیں۔ ان کے درمیان خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی۔ جس میں بے تکلفی کا ایک مخصوص رنگ پایا جاتا تھا۔ بالخصوص مولانا شبلی کے خطوں میں بعض اصحاب نے اسے بے تکلفی کو کوئی اور رنگ دینے کی کوشش کی ہے لیکن یہ بے تکلفی ہمیشہ ایک حد کے اندر رہی اور عطیہ ہمیشہ اس (شبلی کو) عزت کا ایک مقام دیتی رہیں۔

۱۹۰۳ء میں عطیہ کی شادی ایک عالمی شہرت یافتہ مسلمان رجمن (رحمین) سے ہوئی۔ وہ یہودی نژاد تھے لیکن مسلمان ہو گئے تھے۔ یہ ڈاکٹر فیضی رجمن کے نام سے مشہور تھے۔ ان کی بنائی ہوئی تصویریں دنیا کے مختلف عجائب گھروں اور آرٹ گیلریوں کی زینت رہیں۔ ہندوستان میں پیدا ہوئے لیکن تعلیم و تربیت یورپ میں

عطیہ فیضی ۱۸۸۱ء میں قسطنطنیہ (استنبول) میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد ترکی کے خلیفہ عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶ء تا ۱۹۰۹ء) کے مشیر خاص تھے۔ وہیں رہتے تھے تاہم تعلق بمبئی سے تھا۔

عطیہ فیضی اپنے عہد کی ایک باکمال خاتون تھیں۔ ایک معزز خاندان سے ان کا تعلق تھا برصغیر کی نہایت معزز اور نامور شخصیتوں سے ان کے مراسم رہے لیکن یہ اس ہمہ اس تمہید کا کوئی گوشہ، کوئی رخ اس طرز زندگی کے کسی پہلو سے ضرور بحث کرتا ہے جو طبقہ اشراف کو حاصل ہوئی ہے۔ خصوصاً جب ہم عطیہ فیضی کی زندگی کے آخری ایام پر غور کرتے ہیں تو بات کافی حد تک سمجھ میں آنے لگتی ہے۔

ماہر القادری ملک کے مشہور شاعر اور رسالہ 'فاران' کے ایڈیٹر تھے۔ انھیں عطیہ فیضی سے چند ملاقاتوں کا موقع ملا تھا، ان ملاقاتوں کا احوال انھوں نے اپنا نامہ 'فاران' میں مارچ ۱۹۶۷ء کی اشاعت میں شائع کیا تھا۔



گاندھی جی کی انگلی کا خون

مہاتما گاندھی جب پہلی گول میز کانفرنس کے بعد بحری جہاز سے ہندوستان واپس آ رہے تھے تو عطیہ فیضی بھی اسی جہاز میں تھیں۔ انھوں نے اصرار کر کے گاندھی جی کی انگلی میں پھین (پن) چھپوئی اور گاندھی جی نے اپنی انگلی کے خون کا نشان عطیہ فیضی کی آٹو گراف بک پر ثبت کر کے اپنے دستخط کیے۔ آل انڈیا کانگریس کی مجلس عاملہ کے جوارکان اس جہاز پر گاندھی جی کے ہمسفر تھے ان سے بھی اس صفحہ پر دستخط لیے گئے۔ اس قسم کی نادر و عجیب اور فن کاری کی باتیں عطیہ کو خوب سمجھتی تھیں۔ ان کی بڑی بہن نازی جی خاموش طبع اور سنجیدہ تھیں، عطیہ فیضی اتنی ہی شوخ اور تیز طرا تھیں۔

کی بلند مرتبہ شخصیتیں جمع تھیں۔ یہاں تک کہ لیڈی 'ناٹا' بھی موجود تھیں۔ میں نے اردو زبان کی اہمیت پر تقریر کی۔ اس کے بعد دیویوں غزلیں اور نظمیں سنائیں۔ اتنے اونچے درجے کے سامعین ہر شاعر اور مقرر کو کہاں میسر آتے ہیں۔

عطیہ کے والد کا سلطان ترکی خلیفہ عبدالحمید کا مشیر ہونا معمولی بات نہیں تھی۔ گویا ان کی تعلیم و پرورش امارت و خوشحالی کے ماحول میں ہوئی۔ یہ وہ دور تھا جب پورے ہندوستان میں تعلیم نسواں کے لیے کالج تو کیا کوئی ہائی سکول بھی نہ ہوگا۔ عطیہ فیضی نے اس زمانہ میں جو زیادہ سے زیادہ تعلیم مسلمان لڑکیوں کو میسر آسکتی تھی، حاصل کی اور پھر بڑے ہو کر ایڈورڈ ہفتم کے عہد شہنشاہی میں یورپ کا سفر کیا اور مغرب کے مشاہیر سے ملاقاتیں کیں۔ اس سفر نے نسوانی آزادی کے جذبہ کو اور زیادہ افروغ، رنگ بنا دیا۔ خاندان طیب جی میں پردہ پہلے ہی سے نہ تھا، یورپ کے سفر نے عطیہ فیضی کی بے تقابلی اور بے حجابی پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور سید جواز بلکہ تحسین و خوشنودی کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔

شبلی نعمانی کا سہمی کے اس تعلیم یافتہ (Advanced) گھرانے میں جب آتا جانا ہوا ہے تو عطیہ فیضی کی عمر اس وقت میں بائیس سال ہوگی۔ شبلی مولانا ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے اور شاعر کتنا ہی پارسا اور صاحب تقویٰ کیوں

نہی ہاشم یار جنگ کی صاحب زادی مسز زینت فتح علی اس علم دوست خاندان کے کی ادبی سرگرمیوں کی روح رواں تھیں۔ عطیہ فیضی سے تعارف کا ذریعہ شعر و ادب کے یہی اجتماع تھے۔

میں دو سال کے بعد پھر سہمی آیا تو عطیہ فیضی نے انجمن اسلامیہ کے ہال میں بڑے پیمانے پر تخریری آرٹس کرکٹ کی جانب سے بزم شعر و طرب کا اہتمام کیا۔ میں خصوصی مہمان تھا پھر ان سے سہمی میں بار بار ملنا ہوا۔ اس زمانہ میں عطیہ نے اپنی شاندار کوٹھی ایوان رفعت فروخت کر دی تھی اور 'والکیرس' کے مشہور بارغ (Hanging Garden) سے متصل ایک کرایہ کے بنگلہ

میں رہتی تھیں۔ ہر بدھ وار شام میں ان کے ہاں احباب جمع ہوتے۔ اسی زمانہ میں فلمی دنیا سے میرا تعلق ہو گیا۔ سب سے مشہور ڈائریکٹر محبوب مرحوم کی فلم 'نقدیر' کے گانے لکھے۔ اس سلسلہ میں ہفتوں سہمی میں ٹھہرنے کا اتفاق ہوتا۔ عطیہ فیضی اصرار کر کے اپنے ہاں کی پناہ بخشی نشست میں بلاتیں۔

ایک بار انھوں نے سہمی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ متحدہ ہندوستان کے سب سے شاندار اور مشہور ہوئے 'نماج' میں ان ٹاک فیضی کے لیے بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ دعوت میں مہمان ڈھائی سو کے قریب ہوں گے۔ ہر طبقہ

جھاؤں کا کھیل بھی کیا کھیل ہے۔ لکھتے ہیں:

”یہ قصہ نشاطیہ تو ہے ہی مگر کسی حد تک ایسے (ٹریچڈی) بھی ہے۔ شبلی نعمانی کے تذکرے میں عطیہ فیضی کا نام آتا ہے۔ مولانا شبلی نعمانی سے مجھے یہ انتہا محبت بھی ہے اور عقیدت بھی۔ اسی نسبت اور تعلق کے سبب عطیہ فیضی کے نام سے میں بہت دنوں سے واقف تھا۔ فنون لطیفہ سے عطیہ کو جو خاص شغف تھا اس کے تذکرے بھی لوگوں کی زبانی نہ تھے۔“

غالباً ۱۹۴۰ء کا ذکر ہے جب سہمی میں یوم اکبر (مغل شہنشاہ) منایا گیا اور اس سلسلے میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا۔ مشہور اہل قلم جناب ضیاء الدین احمد برنی اس مشاعرے کے داعی تھے۔ انہی کی دعوت پر میں حیدر آباد دکن سے سہمی پہنچا۔ کرافٹ مارکیٹ سے متصل شاہجہاں ہوٹل تھا وہاں مجھے ٹھہرایا گیا۔ بابو صدیق ہال میں بڑے دھوم کا مشاعرہ ہوا۔ مشاعرے کے بعد دوپہر میں اور ادبی نشستیں رہیں۔ سہمی کے مشہور خاندان طیب جی کی خواہش نے ایک ادبی انجمن قائم کی تھی۔ اس کا نام 'عقدہ ثریا' تھا۔ اس بزم میں مجھے بلایا گیا۔ چائے نوشی کے بعد شعر خوانی ہوئی۔ آصف فیضی جو مصر میں حکومت ہند کے سفیر رہے تھے، ان دنوں لاء کالج سہمی کے پرنسپل کے عہدے پر فائز تھے۔ ان سے بھی اسی انجمن میں تعارف ہوا۔

نواب ہاشم یار جنگ بہادر حکومت حیدر آباد دکن میں ہائی کورٹ کے جج تھے پھر وہ قانونی مشیر ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سر اکبر حیدری کا حیدر آباد میں طوطی بولنا تھا۔



کہاں یہ لطف، یہ سبزہ یہ منظر یہ بہارستان عطیہ تم کو یاد لکھو ہوگی تو کیوں ہوگی اور جب ان کو لکھو میں جیمہ کی یاد ستانی تو کہتے: یاد میں صحبت ہائے رنگیں جو جزیرے میں ہیں وہ جزیرے کی زمین بھی یا کوئی سے خانہ تھا

۱۹۰۶ء میں نازی بیگم اپنے شوہر اور دوسرے اہل خاندان کے ساتھ یورپ گئیں تو عطیہ بھی ان کے ساتھ تھیں۔ انگلستان میں ان کی علامہ اقبال سے خوب ملاقاتیں رہیں اور ابن عربی کے فلسفہ تصوف پر طویل مباحث ہوتے (علامہ اس وقت بسلسلہ تعلیم انگلستان میں تھے) علامہ اقبال عطیہ سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کو راز دار بنا لیا۔ اپنے ذاتی حالات اور ذہنی کیفیات تک سے ان کو آگاہ کرتے تھے اور اپنا کلام بھی انھیں بھیجتے تھے۔ اقبال کے خطوط عطیہ بیگم کے نام طبع ہو چکے ہیں۔ ان کو دیکھ کر دونوں کے باہمی روابط کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ عطیہ فیضی بڑی خوبیوں کی مالک تھیں لیکن فی الحقیقت ان کو ملک گیر شہرت مولانا شبلی کی شاعری اور علامہ اقبال کے قلم نے عطا کی اور وہ برصغیر کی نامور خواتین میں شمار ہوتیں۔

ماہر القادری نے عطیہ سے بعض ذاتی ملاقاتوں اور ان مجالس کا کچھ احوال بھی لکھا ہے جو عطیہ کے خصوصی ذوق اور خود ان کے رونق محفل ہونے کی وجہ سے منعقد ہوئیں اور ساتھ ہی ساتھ ان کے آخری ایام کی دھندلی سی ایک تصویر ہمیں دکھاتے ہیں جس سے پتا چلتا ہے کہ دھوپ

ان کی قربت نے شبلی نعمانی کے

دامن تقویٰ کو بہت رنگین بنا دیا

بھری محفل میں جھاڑ دیا

کوئی کتنا ہی بڑا آدمی کیوں نہ ہو اس پر طنز کرنے، ٹوکنے بلکہ بعض اوقات ڈانسنے ڈپننے سے بھی نہ چوکتیں۔ لہذا ان کے جاننے والے محفلوں اور پارٹیوں میں عطیہ فیضی کے قریب آنے سے کتراتے تھے۔ تاج محل ہوٹل میں عطیہ فیضی نے ایک بار ظہرانہ دیا۔ اس میں سر جتنی نائیڈ بھی تھیں۔ شاعروں میں ساغر نظامی اور راقم الحروف تھے۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے پروفیسر مراد نے انگریزی تقریر میں علی گڑھ کا ذکر چھیڑا، اس میں عطیہ فیضی کو کوئی بات خلاف محل محسوس ہوئی، عطیہ نے بھری محفل میں انھیں ٹوکا بلکہ جھاڑ دیا اور بے چارے خیف سے ہو کر رہ گئے۔ بعض اوقات اپنے شوہر کو بھی ڈانٹ دیتیں، مٹرسنن نیاز مند شوہر کی طرح ان کے پیچھے چھتری لیے ہوئے ہوتے۔ سیاسی مسلک اور علمی سرگرمیوں کے اعتبار سے نہ وہ کانگریسی تھیں اور نہ مسلم لیگی، وہ اپنی ذات میں خود ایک انجمن واقع ہوئی تھیں۔

نہ ہو، رنگین مزاج بھی ہوتا ہے۔ یہ تو یار لوگوں کی شوخی مزاج ہے کہ انھوں نے اس ربط اور تعلق پر حاشیہ آرائیاں کر کے بدگمانیوں کے دروازے کھول دیے مگر اتنا ضرور ہے کہ مولانا شبلی کی شاعری کو اس دلچسپی نے خاصی شوخی اور رنگینی عطا کی اور ایک خوب رو، تعلیم یافتہ جوان لڑکی کی قربت، دیدار اور ہم کلامی کے لطف نے مولانا شبلی کے دامن تقویٰ کو تھوڑا بہت رنگین بنا دیا:

یہ واقعہ بھی خوب ہے تہمت بھی خوب ہے
عطیہ کو فنون لطیفہ سے خاص شغف تھا۔ شاعری، مصوری اور قص و موسیقی یہ سب ان کے ذوق اور دلچسپی کی چیزیں تھیں۔ راگ راگینوں تک سے واقف تھیں۔ پاکستان آنے کے بجائے بھارت ہی میں رہتیں اور کوئی 'کلامندر' ان کو سو نہ دیا جاتا تو وہاں ان کے ذوق اور طبیعت کے جوہر کھلتے۔ انگریزی کا مطالعہ خاصا وسیع تھا۔ انگریزی میں رواں اور مختلف تقریر کرتیں اور ایک بار ایک پارٹی میں میرا

تعارف کراتے ہوئے انگریزی میں کہا:
”اگر یہ ماہر القادری ہیں تب یہ حیدر آباد سے ہیں اور اگر یہ ماہر القادری ہیں تب ان کا خلق یونی سے ہے۔“
وہ یہ تھی کہ حیدر آباد (دکن) کے لوگ 'ق' کو 'خ' کی آواز سے بولتے تھے۔

ایک بار مجھ سے دریافت فرمایا کہ 'ذالک الکتاب' میں 'ذالک' کس کی طرف اشارہ ہے۔ میں نے جواب دیا کہ 'الکتاب' یعنی قرآن کریم کی طرف۔ بولیں نہیں یہ بات نہیں۔ 'ذالک' تو دور کی چیز کے اشارے کے لیے عربی میں بولا جاتا ہے۔ پھر کچھ ایسا باتیں کہیں جس سے مجھے اندازہ ہو کہ ان کے معتقدات میں 'باطنیت' کی آمیزش ہے۔ ان کے شوہر فیضی رحمن بھی باطنیت زدہ تصوف سے متاثر تھے۔ دو تین بار ان سے گفتگو ہوئی تو ان کے خیالات میں عجیب الجھاؤ پایا۔ عطیہ فیضی کے پاس مشاہیر کے خطوط کا خاصا ذخیرہ



کہنے لگے بات کرتے ہوئے عطیہ فیضی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے

تھا۔ انھوں نے مجھے ایک خوبصورت سی بیاض دکھائی جس کا منہری حاشیہ تھا۔ اس پر نواب حامد علی خاں والی رامپور کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک شعر تھا۔ یہ بیاض نواب صاحب رامپور نے انھیں تحفہ میں دی تھی۔ عطیہ نے اسی انوگراف بک پر مجھ سے دستخط لیے۔ یہ اپنی نوعیت کی نادر اور بیش قیمت 'بیاض امضا' (Autograph Book) تھی۔ اس پر ہندوستان، انگلستان، ترکی اور بعض دوسرے ممالک کے مشاہیر کی تحریریں اور دستخط تھے۔

آخری ایام

مجھلی بہن زہرا بیگم کی عمر نے وفانہ کی اور وہ اپنی باقی دو بہنوں کی طویل العمری کے برعکس ۱۹۱۰ء میں یکا یک بیمار پڑیں اور فوت ہو گئیں۔ انھوں نے صرف ۳۰ سال عمر پائی۔ نازی بیگم اولاد کی نعمت سے محروم رہیں پھر کسی سبب یا شاید اسی سبب سے ان کی شوہر سے علیحدگی ہوئی اور وہ بہمنی آکر 'اولاد' نعمت میں رہنے لگیں۔ پھر ان کے شوہر (نواب آف خجندیہ) کا بھی انتقال ہو گیا اور ریاست سے برائے نام جو تعلق تھا وہ بھی ختم ہو گیا کیونکہ ان کی کوئی اولاد نہیں تھی۔

قیام پاکستان کے وقت یہ خاندان ولایت میں تھا وہاں سے ہندوستان (بہمنی) آیا تو معلوم ہوا کہ پیچھے جو کچھ تھا سب لٹ چکا ہے۔ بہر حال جو تھوڑا بہت باقی رہ گیا تھا اسے سمیٹ کر دونوں بہنیں اور مٹر رحمن کراچی آ گئے۔

صدر بازار میں قالینوں کی ایک بہت بڑی دکان ہے میں نے اس میں صوفوں، الماریوں اور میزوں کا دیدہ زیب، خوبصورت اور قیمتی نقشین میٹ دیکھا اور پہچان لیا کیونکہ یہ عطیہ بہمنی سے اپنے ساتھ لائی تھیں۔ لکڑی کا آنوی رنگ، اس پر پھول پتیوں کی انتہائی دیدہ زیب مثبت کا خوشنما ڈیزائن، یہ فریجیچر یادگار طور پر کسی میوزیم کی زینت بننے کے قابل تھا جو ظاہر ہے کہ ستے داموں

بک چکا تھا۔ جس نے اسے خریدا، خبر نہیں کتنا کمایا ہوگا۔ ابھی چند دن کی بات ہے ایک صاحب سے جو کراچی میں ایک فرم کے مالک ہیں اور تقسیم ہند سے قبل اپنے والد کے ساتھ بہمنی میں رہتے تھے، ملاقات ہوئی، دوران گفتگو عطیہ فیضی کا ذکر ہوا تو ہمیں لہجے میں بولے..... وہ ایک دن میرے دفتر میں تشریف لائیں اور مجھ سے ۵۰ روپے بطور قرض مانگے۔ وہ کہنے لگے کہ بات کرتے میں عطیہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ میں بھی آبدیدہ ہو گیا اور میں نے ۵۰ روپے جگہ سو روپے بطور ہدیہ ان کی خدمت میں پیش کر دیے۔“

یہاں کچھ چیزیں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں..... یہ آنسو کس کے تھے۔ عطیہ فیضی کے؟ وہ عطیہ فیضی جس کے دم قدم سے اشرافیہ کی ہائی کلاس محفلیں جیتی اور برپا ہوئی تھیں۔ ان میں عطیہ فیضی کی موجودگی یہ ثابت کرتی تھی کہ یہ کوئی ایریا غیر محفل نہیں ہے۔ لیکن یہ آنسو تار ہے تھے کہ اس کا رگہ محنت و سرمایہ میں، دو اور دو چار کی اس دنیا میں ابن عربی کا فلسفہ تصور کچھ کام نہیں دیتا۔ علم و دانش انسانی احتیاج کے آگے خس و خاشاک سے زیادہ کچھ نہیں، لیکن یہ دانش کس چیز کا نام ہے۔ وہ دانش آخر کس کام کی جس کا دامن دور اندیشی کے تصور سے خالی ہو.....

پھر یوں ہوا کہ اسی پریشان حالی اور رکت و افلاس کے عالم میں ان کے شوہر فیضی رحمن نے ۱۹۲۳ء میں وفات پائی، ۱۹۲۵ء کے وسط میں عطیہ فیضی گر پڑیں اور ہڈیاں ٹوٹ جانے کی وجہ سے معذور ہو گئیں۔ نازی بیگم نے ضعیف العمری کے باوجود ان کی نگہداشت کی۔ بالآخر عطیہ پر فالج کا حملہ ہوا اور پانچ دن بے ہوش رہنے کے بعد ۱۹۲۷ء میں اس دار فانی سے عالم جاودانی کو رخصت ہو گئیں۔ ۱۹۶۸ء میں نازی بیگم نے بھی اس عالم ناپائیدار سے رخصت سفر باندھ لیا یوں یہ قصہ نگار شہر تمام ہوا:

یہ چھپ چھاپ کاحیل سے یاں خزاں بہادری کی گھٹات میں ہے
جو نصیب صبح عروج ہو تو ظہر میں شام زوال رکنا

آنکھوں دیکھی کانوں سنی

بلھے شاہ کہہ گئے

”راتیں جاگن کتے تیتھوں اتے“

تین انسانوں نے ایک حیوان
کے لیے جان دے دی

خالد سعید اختر

کسی

گاؤں میں بالانا می مرانی رہتا تھا۔ وہ ڈھول کی تھاپ پر رقص کا بڑا دلدادہ تھا۔ کسی بھی شادی پر ڈھول بجاتا تو وہاں پہنچ جاتا۔ اس کی اپنی بیٹی کی بارات آتی تو لوگوں نے اسے سمجھایا کہ اب بھگڑا نہ ڈالنا۔ اس نے بھی حامی بھر لی۔ مگر جب ڈھول پر تھاپ پڑی تو اس کا دل مچلنے لگا۔ چند لمحے تو اس نے توقف کیا مگر آخر کار اس کی قوت برداشت جواب دے گئی۔ چپل اتار کر دوڑ پھینکی اور یہ کہہ کر کہ ”ہن بالانئیں ڈکیندا“ (اب بالانئیں رک سکتا) ناچنا شروع کر دیا۔

”وہاں ہون کا انوکھا لاڈلا“ پڑھا تو دل نے کہا، ”ہن بالانئیں ڈکیندا“۔ ورنہ کتے تو نہایت شریف مخلوق ہیں اور بلا وجہ کسی کو نہیں کاٹتے تا آنکہ کوئی ان پر پتھر نہ

پھینکے! جہاں تک ان کے بھونکنے کا سوال ہے وہ تو ان کے ”فرائض منصبی“ میں شامل ہے۔ ادنیٰ فرض پر تو برا بھلا کہنا نہیں چاہیے۔ ہماری ناچیز رائے میں کتے سے زیادہ وفادار اور انسان دوست اور کوئی جانور نہیں۔ بابا بھٹے شاہ بھی فرما گئے

”راتیں جاگن کتے..... تیتھوں اتے“

مالک کا داور مول نہ چھڑ دے..... بھانویں وجہن سو سو

علماء سے سنا ہے کہ رکھوالی اور شکار کے لیے کتا پالنا جائز ہے اور شکاری کتے کے لعاب و ہن سے شکار ناپاک بھی نہیں ہوتا اور اصحاب کہف کے کتے کے بارے میں تو کئی باتیں مشہور ہیں۔ ماضی کی مشہور گرمیوں فون ریکارڈنگ کمپنی ”ہزما سٹرز واکس“ کے گراموں فون ریکارڈ

پر گھومتا ہوا کتا ہمیں بچپن میں بڑا پیارا لگتا تھا۔ مشہور ہے کہ وہ کتا کپتئی کے مالک کا تھا اور اسے بے حد عزیز تھا۔ وہ مر گیا تو مالک کو اس کی موت کا بڑا صدمہ پہنچا۔ اس نے اس کی تصویر کو اپنی کپتئی کا مونو گرام بنا لیا۔ اس کتے کے بارے میں کسی نے نہایت خوبصورت تبصرہ کیا تھا کہ ”وہ کتا، جو امر ہو گیا!“

اب ہم کتوں کی وفا داری کے چند سچے واقعات قارئین کرام کی دلچسپی کے لیے پیش کرتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں ایک شخص کو پولیس نے گرفتار کر لیا۔ وہ سات دن تک حوالات میں بند رہا۔ اس کا کتا سات دن تک بھوکا پیاسا حوالات کے دروازے پر بیٹھا رہا۔

ایک جاننے والے ریٹائرڈ کرنل صاحب کا کتا چوری ہو گیا تقریباً دو سال بعد کرنل صاحب نے ایک جگہ اپنا کتا پہچان لیا۔ مگر نئے مالک صاحب کسی طور پر بھی پروں پر پانی پڑنے نہیں دے رہے تھے۔ جھگڑا بڑھ گیا تو لوگ اٹھتے ہو گئے۔ فیصلہ ہوا کہ خاں صاحب کتا کھلا چھوڑ دیں اور کرنل صاحب اپنی جیب میں جا کر بیٹھ جائیں۔ کتا از خود جس کے پیچھے چلا جائے تو اس کا کتا۔ جب کتے کو کھلا چھوڑا گیا تو وہ کرنل صاحب کے آگے آگے چل کر ان سے پہلے ان کی جیب میں جا بیٹھا۔

کئی سال قبل خانیوال شہر میں ایک واقعہ میں ایک نئی گھر کے سات افراد قتل ہو گئے تھے۔ وہ حفاظت کے لیے سایہ پال سے کسی دوست سے ایک رشمن شہپرڈ ”ہنچہ“ نامی کتیا مانگ کر لے گئے۔ مالک نے صرف اتنا کہا ”ہنچہ گو“، تو وہ ان کی جیب میں سوار ہو کر ان کے ساتھ چلی گئی۔ وہاں وہ ان سے کھل مل گئی اور ہر طرح ان کی فرماں برداری کرتی۔ مگر جب اس کا اصل مالک سال، چھ ماہ بعد آتا تو وہ ہر وقت اس کے قدموں میں لپکتی رہتی اور اہل خانہ کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتی۔

ہمیں خود بھی اس ہنچہ کو دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ابھی گزشتہ دنوں خبر آئی ہے کہ ایک کتا اپنے مالک کی وفات کا صدمہ نہ سہہ سکا اور مالک کی وفات کے تیسرے روز مر گیا۔ آخر میں ہم ایک میجر العقول اور منفرد قسم کا واقعہ بیان کرتے ہیں کہ جنوبی افریقہ میں مقیم انگریز میاں بیوی اور ان کی بارہ سالہ بیٹی نے چوروں کے ہاتھوں اپنا سیاہ رنگ کا ”لیبرے ڈار“ مارے جانے کے تیسرے روز پہاڑ سے کود کر خودکشی کر لی کہ کتے کی موت کے بعد انھیں جینے کی تمنا باقی نہیں رہی۔ شاید انسانی تاریخ کا یہ پہلا واقعہ ہو گا کہ تین انسانوں نے ایک حیوان کی محبت میں اپنی جان دے دی۔



کہانی میری رگوں میں خون بن کر
دوڑتی ہے، مجھے بھی دوڑاتی ہے

قلم اور موقلم کے نواب

محی الدین نواب

کہتے ہیں

”زندگی اک جھولا ہے..... جو ہمیں جھلاتا ہے،
کبھی خوشی کی طرف تو کبھی غمی کی طرف“

ملاقات: حامد شہود



- ★ بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ میں داستان گو ہی نہیں شاعر اور مصور بھی ہوں۔
- ★ میرا ناول ”اندھیر نگری“ بڑے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔
- ★ بھارت فلم کی آڑ میں اپنے نظریات پھیلاتا ہے۔
- ★ میں ”یوگی“ رہا ہوں..... یوگا سے اب بھی سانس کو کچھ سہارا مل جاتا ہے۔
- ★ کرشن چندر کو میں کئی ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں پر فوقیت دیتا ہوں۔

مالی آسودگی
سے حسین حادثات
رو نما ہوئے۔

بنگالی جادو بنگالی
لڑکیوں اور عورتوں
میں ہے۔

ایک کہانی لکھتے
ہوئے میں دوسری کو
چھوٹا بھی نہیں۔

مقبولیت بہت سے دلوں کا ارمان ہوتا ہے۔ اُردو کہانی میں جوشہرت اور مقبولیت محی الدین نواب کے حصے میں آئی، وہ ان کے ارمان سے کہیں زیادہ ہے۔ وہ گزشتہ ۶۲ سال سے ایک ناگ پر کھڑے سے بچانے اور بڑھانے کی جگہ دو میں لگے ہیں۔

پاکستان میں قسط وار کہانی لکھنے والوں میں سب سے زیادہ پسند کیے جانے والے محی الدین نواب ہی سب سے زیادہ معاوضہ پانے والے شاعریے جاتے ہیں۔ ان کی ایک اچھوتی کہانی ”دیوتا“ جو دور حاضر کی الف لیلی کہلائی ہے، مسلسل ۳۳ برس تک شائع ہوتی رہی ہے۔

محی الدین نواب گزشتہ ۳۴ سال سے کوئی لفظ لکھے بنا کہانی کہہ رہے ہیں، رات کے اندھیرے میں جب سب سو جاتے ہیں تو وہ اپنی کہانی ریکارڈ کراتے ہیں۔ اسی لیے ان کی زندگی نئے نئے ریکارڈز قائم کرنے سے عبارت ہے۔ ان کی ایک کہانی دنیا کی سب سے طویل کہانی قرار پائی۔ ایک جاپانی کہانی کار نے یہ اعزاز پانا چاہا مگر جلد ہی اس کا قلم ہانپنے لگا۔

اسی محی الدین نواب سے ملیے۔ یہ کسی ڈائجسٹ، رسالے کے لیے ان کا پہلا انٹرویو ہے۔ آئیے ملیے آج کی کہانی کے نواب محی الدین نواب سے۔ (مدیر)

س: اپنی اولین زندگی کے بارے کچھ بتائیے؟
ج: میں ۴ ستمبر ۱۹۳۰ء کو بنگال کے شہر کھڑک پور میں پیدا ہوا۔ نسلی طور پر ہم بنگالی ہیں، مگر اُردو بولنے والے بنگالی۔ میرے دادا منصور تھے اور والد ریلوے میں انسپریٹر ڈیکوریٹر۔ وہ بھی کمال کے فن کار تھے۔ ریل میں جب کسی راجا، مہاراجا، وائسرائے گورنر یا اور بڑی شخصیت وغیرہ نے سفر کرنا ہوتا تو انھیں مامور کر دیا جاتا۔ وہ ریل کا ایک ڈبا جاتے اور اُسے متعدد ایسی سفری سہولیات سے مزین کرتے جو ریل میں میسر نہ ہوتیں۔

میرے والد نے ایک بار ریل کا نام ”انڈین ریلوے“ دو شفاف شیشوں کے اندر نقش کر کے انھیں آپس میں یوں جوڑا کہ ایک ہی شیشہ بن گیا۔ یہ شیشہ پھر ایک اسے کلاس ڈبے کی کھڑکی میں جوڑا گیا۔ اس شیشے کا بڑا ڈنکا بجا بجا کر کوشش کے باوجود میں کوئی اور ایسا شیشہ تیار نہ کر سکا۔

س: گویا مصوری اور ہنرمندی آپ کو میراث میں ملی، ایسی میراث کے حامل انسان کا بچپن کیسا رہا؟

ج: معصوم رہا۔ تعلیم حاصل کرنا، کھیلنا کودنا، کھانا پینا اور پھر لمبی تان کے سو جانا۔ میں شرارتی ہرگز نہیں تھا بلکہ دوسرے بچوں کی شرارتوں کا نشانہ بنتا۔ وہ بڑا سنہرا دور تھا، نہ جانے کہاں جا چھپا؟ تب ہم چھوٹی چھوٹی باتوں میں بڑی بڑی خوشیاں پاتے تھے۔ ایک بار میں شام کو کھڑپ تھا کہ میرے سگی ساتھی مجھے کھیل کے لیے بلائے آئے۔ انھوں نے آواز دی ”نواب!“ میری والدہ ناراض ہوئی، انھوں نے بچوں سے کہا کہ آپ اسے ”نواب صاحب“ کہہ کر کیوں نہیں پکارتے؟

س: لڑکپن میں تو سنا ہے کہ آپ کیونٹ پارٹی میں شامل ہو گئے تھے؟

ج: روس میں انقلاب برپا ہو چکا تھا اور کمیونزم برصغیر میں سخت یلغار کر رہا تھا۔ میں بھی کیونٹ پارٹی میں شامل ہو گیا کہ وسائل کی مساوی تقسیم اور سرمایہ داری کی ختم کنی ہی میں انسان کی بقا ہے۔ تاہم میری والدہ جلد ہی گئی کہ میری تعلیمات میں دین اسلام بہت راسخ ہے۔

اسلام نے جب آج اور اجیر، مالک اور ملازم کے رشتوں کے حقوق و فرائض بیان کیے تو صاف ظاہر ہے کہ وسائل کی نامواری بھی سماجی بقا کا حصہ ہے۔
س: آپ کے دوستوں میں دیگر مذاہب کے لوگ شامل تھے؟

ج: بالکل تھے۔ وہاں مسلم، ہندو، عیسائی اور بدھ مت کی کچھڑی پکی ہوئی تھی۔ غیر مسلم ہمارے ساتھ نماز عید ادا کرتے۔ میں ان کے مندروں، گرجا گھروں میں جاتا رہا۔ فرق صرف یہ تھا کہ وہ ہمارے ساتھ رکوع و سجود کرتے تھے مگر میں ان کی عبادت گاہ میں خاموش کھڑا ہو کر لوٹ آتا۔

پھر میں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا۔ تب تقسیم ہند ہو گئی اور بنگال کا وہ حصہ جس میں ہم مقیم تھے، بھارت کے حصے میں آیا۔ سو ہمیں وہاں سے بے سروسامانی کے عالم میں نکلنا پڑا۔ ہم آگ اور خون کے دریا میں تیر کر مشرقی پاکستان چلے گئے۔ میں ۲۰ سال کا تھا کہ میری پیاری والدہ انتقال کر گئیں۔ میری شادی بھی جلد ہو گئی تھی۔ اب تو اکثر نو جوان ۳۰ سال یا اس سے زیادہ عمر میں بیاہے جاتے ہیں۔ میرے وہ چھری پار اسی بنگال میں کھو گئے، مجھے ان کے بارے کچھ معلوم نہیں۔

س: قلم کب اور کیوں کر سنہلا؟
ج: قلم سنہلانے کی وجہ ایک تو بنگالی خون تھا۔ بنگال برفاں پر علاقہ ہے۔ بنگالی نسل بڑی ذہین اور آرٹ کی عاشق ہے۔
دوسری وجہ ہمارے آباء میں فن ایک میراث تھا۔

تیسری وجہ ادب سے میری دل چسپی تھی۔ میں کئی زبانیں جانتا ہوں۔ اردو میں سے گھر سے سیکھی، فارسی اور عربی مسجد سے، پھر سکول گیا تو ہندی اور انگریزی سے آشنا ہوا۔ تقسیم ہند کے بعد خاص بنگالی علاقے میں جا کر بنگلا بھاشا بھی سیکھی۔ یوں میں بھارت بھارت کا ادب پڑھتا رہا۔ کرشن چندر، منٹو، پریم چند اور آگاتھا کرستی پھر..... نیگور، قاسمی، اقبال اور غالب..... تب عمر خیام، ایچ جی ویلز اور اوہنری۔ ادب نے مجھے لکھنے کی طرف راغب کیا۔

س: پہلی تحریر کا معاوضہ کتنا ملا تھا اور اب کتنا ہے؟
ج: کراچی کے بڑے رسالے ”رومان“ میں چھپنے والی پہلی تحریر تھی: ”ایک دیوار، ایک شگاف“۔ افسوس یہ میرے پاس موجود نہیں۔ اگر کسی کے پاس ہو تو میں معاوضہ دے کر بھی خریدنے کو تیار ہوں۔ اس کا معاوضہ ۶۰ روپے تھا۔ اس دور میں بکرے کا اچھا گوشت چار آنے کھو تھا۔ اب بکرے کا اچھا گوشت ۶۰۰ روپے کلو ہے۔ گویا آج کے ۲۰ ہزار روپے ادا کیے گئے تھے۔ اس وقت میں ۲۳ برس کا تھا۔ اب میں ناول کا فی قسط معاوضہ ۴۰ ہزار روپے اور داستان کا ۵۰ ہزار روپے وصول کرتا ہوں۔ پھر یہ کتابی شکل میں چھپتے ہیں تو ناشر سے ۱۰ سالہ معاہدہ مزید کرتا ہوں۔

س: آپ نے کرشن چندر کو بہت پڑھا؟
ج: کرشن چندر کے فن میں گہرائی بہت ہے۔ زنگاؤں کی رانی، بھکت، کالو بھنگی، جوتا، کارا سورج، اُلٹا درخت..... کرشن کو میں کئی ناول اور افسانہ نگاروں پر فوقیت دیتا ہوں۔ نمبرون اور ٹو والا معاملہ فلمی لڑکیوں جیسا ہے،

اسے چھوڑ دیں۔
س: بنگال میں اپنی سرگرمیوں کے متعلق کچھ بتائیں۔ کیا کیا؟

ج: میں وہاں لکھتا بھی رہا اور فلمی صنعت میں ملازم بھی رہا۔ یوں مجھے لکھنے اور فلم ڈائریکشن سیکھنے کا موقع ملا۔ میں نے وہاں دو فلمیں لکھی تھیں: ”جہنم کی پیاسی“ اور ”بادن پتے“۔ بنگال میں حالات بگڑ رہے تھے وہاں، اردو جرم بن رہی تھی۔ میں نے آخر کار لاہور آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں ۱۹۷۰ء میں فلم شار دیا کی مدد سے، ہوائی جہاز میں ڈھاکے سے لاہور آ گیا۔ وہاں اس وقت ۱۹۴۷ء سے بھی بدتر حالات تھے۔ دیکھنے مجھے بہت دلاسا دیا۔ میں دیبا خانم کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری داسے، درے قدمے، سنے، بہت مدد کی۔

۱۹۷۱ء میں سقوط بنگال کے وقت میں اپنے اہل خانہ کے لیے بہت پریشان تھا۔ میں لاہور میں تھا اور وہ بنگال میں تھے، میں روزگاری وجہ سے مجبور تھا۔ اہل خانہ بھی آخر کار لاہور آ گئے۔ میں نے بڑا کڑا وقت گزارا۔ بڑے رسالے نئے ادیب کو کس طرح قبول کرتے ہیں، سب لوگ جانتے ہیں۔ تب میں نے ”دیبا خانم“ کے نام سے بہت سے ناول لکھے اور بہت مقبول ہوئے۔ ابن صفی کے کرداروں پر ”عمران بنا عمران“ بھی لکھا جو اچھا رہا۔

س: ۱۹۷۱ء کے سانحے پر آپ نے ایک شاہ کار ناول ”جرم وفا“ لکھا اور ایک ناول ”مجھے حیا آتی ہے“ بھی تحریر کیا۔ سقوط بنگال پر کچھ کہیں گے؟
ج: بالکل نہیں..... یہ دونوں قلم پارے میں نے رورو کر لکھے ہیں، تمام وجوہ ان میں درج ہیں۔

س: پھر آپ کراچی کیسے پہنچے؟
ج: کراچی کے ایک مشہور ناشر نے میری تحریر پڑھی۔ وہ جہاز میں بیٹھ کر اخبار مارکیٹ لاہور آئے جہاں اس رسالے کا سول ڈسٹری بیوٹر موجود تھا، جس میں میری تحریر شائع ہوتی تھی۔ وہ مارکیٹ سے اردو بازار پہنچے پھر میرے گھر آئے۔ انھوں نے مجھے کہا کہ اپنا سامان باندھ لیں، کراچی چلتے ہیں، پہلی پرواز سے۔ شرما کر میں نے کہا ”میں ریل میں آ جاتا ہوں“۔ انھوں نے مجھے اہل خانہ سمیت اسی دن جہاز میں بٹھایا اور کراچی لے گئے۔ میں پھر وہیں کا ہو رہا۔

س: آپ پر الزام ہے کہ آپ کمرشل ادیب ہیں؟
ج: کمرشل ادب اور کلاسیکل، یہ بحث موجود رہنے دیں مگر ادب کو آگے بڑھنے دیں، اس ادب کو جو زندگی کا غماز ہے۔ ادب پر درجات کا پہرا نہ بٹھائیں۔ میرا کمرشل ادب ہزاروں کے کلاسیکل ادب سے کہیں بڑھ کر کلاسیکل ادب ہوتا ہے الحمد للہ! ورنہ ایک قسط کے ۵۰ ہزار روپے کون ادا کرتا؟

میرا ناول ”اندھیر مگنی“ بڑے لوگوں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ مجھے اس پر روکا گیا۔ اس کمرشل کا ہی کارنامہ تھا کہ لوگ محی الدین نواب سے زیادہ فرہادی تیور سے آشنا ہو گئے۔ میں نے یہ داستان اٹھا کر روٹی بنا ڈالی تھی۔ لوگ روٹی کے ساتھ ساتھ اسے بھی مانگتے تھے۔ ہزاروں افراد نے ہر سال خطوط لکھے کہ فرہاد کا پتا بتاؤ۔ فون آتے تھے کہ فرہاد دفتر کب آتا ہے؟ اسے رشتے بھی آتے تھے۔

س: آپ کے قلم میں اتنی کاٹ کہاں سے آئی؟

یہ تجربات سو فیصد ناکام رہے۔ ایسا کبھی نہ کریں
یہ تین شادیاں میری سوانح عمری میں حائل ہیں
میں نے دیبا خانم کے فرضی نام سے بہت ناول لکھے



اس دور میں بکرے کا گوشت چار آنے کھو تھا
گویا پہلا معاوضہ ۶۰ روپے آج کے ۲۰ ہزار روپے تو ہوئے

ج: میں دوبار آگ اور خون کے دریا میں سے گزرا ہوں۔ ۳۰ برس میں نے کوچہ گردی میں پتائے۔ بڑے بڑے قلم کاروں کو پڑھا اور سر جھکا کر سوچا، تب میرا اسلوب پختہ سے پختہ تر ہوتا چلا گیا۔ میں نے ۳۳ برس تک ایک ہی داستان بڑھا کر دورِ حاضر کی اچھوتی الف لیلی لکھی ہے۔ آج ۸۲ برس کی عمر میں بھی رات بھر لکھتا ہوں۔

میں بہت سوچ سوچ کر لکھتا اور ۳۶۱ رواں زاویہ تلاش کرتا ہوں اور وہی قارئین کو بھاتا ہے۔ ایک کہانی لکھتے ہوئے میں دوسری کو چھوٹا بھی نہیں۔ باقی وقت اور حالات کے ساتھ ساتھ کہانی کے تقاضے بھی بدل جاتے ہیں، انھیں اپنانا چاہیے۔

س: کہانی ”لکھنا“ تو آپ محاورہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں ناں!

ج: بالکل، میں کوئی ۳۳ برس سے کہانی ریکارڈ کر رہا ہوں۔ میں رات کے اندھیرے میں، جب سب دنیا سو جاتی ہے، کہانی ٹیپ ریکارڈ میں سوچ سوچ کر ریکارڈ کرتا ہوں۔ خیال کی روٹھ جاتی ہے تو ریکارڈ راز بند کرتا ہوں پھر مزید کام کرتا ہوں۔

س: آپ کی تین بیویاں اور تین گھر ہیں، یہ تین حادثات کیسے رونما ہوئے؟

ج: کراچی جا کر مالی آسودگی سے یہ حسین حادثات رونما ہوئے۔

س: یہ تجربات کامیاب رہے؟

ج: سو فی صد ناکام ایسا کبھی نہ کریں۔ یہ شادیاں ہی میری سوانح عمری ”نواب بیٹی“ میں سدِ راہ

ہیں کہ تمام بچے اپنی اپنی نانی دادی کا تذکرہ شامل حال نہیں کرانا چاہتے۔

س: آپ کی تحریریں بتاتی ہیں کہ آپ بیرون ملک بہت جاتے ہیں؟

ج: یہ صرف میری عقل جاتی ہے۔ سقوطِ بنگال کے بعد میں صرف ایک بار بنگلہ دیش گیا اور ایک بار بھارت۔ اب ان ممالک میں بھی نہیں جاؤں گا کہ میرے وہ عزیز بوڑھے ہو کر دنیا چھوڑ چکے جو وہاں مقیم تھے۔

میرا طریقہ یہ ہے کہ میں کسی دستاویزی فلم میں یورپ کے کسی محلے میں موجود ایک وسیع گلی کا نام اگر دیکھتا ہوں تو فوری طور پر اس کا نام جیسے ”ہارڈ جیمبر لین“ لکھ لیتا ہوں۔ پھر کہانی میں اس گلی کا یوں تذکرہ کرتا ہوں کہ لوگ کئی ممالک سے خطوط لکھتے ہیں میں فلاں علاقے میں رہتا ہوں، آپ یہاں کب آئے تھے؟ پھر کب آنا ہے؟ مجھ سے مل کر اور کھانا کھا کر جائیں۔

س: عمدہ کہانی لکھنے کا طریقہ بتا دیں؟

ج: جہاں تک ہو سکے اپنی روش کو طریق عام سے ملنے نہ دینا کہانی کی اسی میں آبرو ہے

اسے انجام سے ملنے نہ دینا

س: اگر آپ کہانی کار نہ بننے تو کیا ہوتے؟

ج: میں پھر بھی کہانی کار ہی ہوتا۔ کہانی میری رگوں میں خون بن کر دوڑتی ہے، مجھے بھی دوڑانی ہے۔

س: کہانی کے علاوہ آپ اور کس فن سے وابستہ ہیں؟

ج: زیادہ لوگ مجھے صرف کہانی کار ہی گردانتے ہیں۔ بہت ہی کم لوگ جانتے ہیں کہ میں داستان گو، شاعر

مصور ہوں۔ میں نے سونے کی ہڈی چبانے والوں پر اپنی شاعری کی ہے کہ وہ ہڈی ان کے گلے میں کیسے پھنسی ہے۔ بنگال میں میرا ذریعہ معاش مصوری بھی رہا۔ میں کہیں کے پوسٹر بھی بناتا رہا۔ میں دیگر فنونِ لطیفہ پر بھی کچھ کام چھوڑا ہوں، موسیقی، رقص لطیف اور مجسمہ سازی۔

س: آپ نے زندگی کیسے گزاری، عملی یا خیالی؟

ج: خیالی! عملی گزارتا تو آج اس ڈائجسٹ یا میگزین کا مالک ہوتا جو ہر ماہ ایک لاکھ کی تعداد میں پچھتا ہے۔ بڑے کردار اور کہانیاں میرے ارد گرد رہے۔ عرصہ ہوا کہ اپنی دنیا کے خوف سے گاڑی نہیں چلا سکتا۔ ایک دفعہ میں اپنے خواب و خیال میں گاڑی کہیں لے جا رہا تھا۔ یکدم نے اس دن گھر جاتے ہی مجھ سے گاڑی کی چابی لے لی کہ آپ ایک سیڈنٹ کر دیں گے۔

س: آج کل عورتوں کے ناول بکتے ہیں، پھر ان کے راز سے بھتے ہیں۔

ج: میں نے بھی عورتوں کے ناول لکھے ہیں مگر میں سستا پیارہ نالائق انتظار اور ہزار مربع گز کے بنگلے سے فائین کو پاگل نہیں کرتا۔ میں ان کے مسائل پر لکھتا ہوں، مسائل پیدا نہیں کرتا۔ گھیا رومانوی ناول پڑھ کر میں نے لڑکیوں کو گھروں سے بھاگتے اور گولی کا نشانہ بننے دیکھا ہے۔

میں ناشرین اور قارئین کو اپنے اسلوب سے مناتا ہوں۔ میں دوسروں پر تنقید کرنے والا شخص نہیں کہ لڑکیاں کوئی محنت کے سستے جذبات پر مبنی ناول طلب کریں تو میں

لکھوں اور انھیں خود کشی پر اکساؤں۔ میں نے عورتوں، لڑکیوں کے لیے بھی صحت مند محبت کا تصور پیش کیا۔ اگرچہ یہ آج کل نہیں لکھا جا رہا۔ اگر ہے تو بہت ہی کم۔

بانی رہی ڈرامے کی بات تو میں کب کا خود اس کا پیچھا نہیں کرتا۔ آج کسی بڑے ادارے میں جاؤں تو ۵۲ اقساط کا ڈراما لے کر انھوں مگر میر تقی میر کی بات کہ

کیوں کریں کسو کے سامنے دسب طبع دراز وہ ہاتھ سو گیا ہے سر ہانے دھرے دھرے والا معاملہ ہے۔ میری کہانیاں چوری کر کے کچھ توڑ پھوڑ کے ساتھ ڈراموں میں آتی رہتی ہیں۔

س: آپ نے انتقال روح پر کہانیاں لکھیں جو اجسام بدلتی ہیں۔ آپ نے آسیب زدہ لڑکیوں کے ناول لکھے جو جنات سے لیس ہیں۔ آپ انھیں سچ تسلیم کرتے ہیں؟

ج: تھیرا پوتول واقعات دینا ہی ہوتے ہیں مگر میرے سامنے بھی نہیں ہوئے۔ اگرچہ میری عمر ۸۶ برس ہے اور میں نے جان بچانے کے لیے مرگھٹ، قبرستان اور مندر میں راتیں گزاری ہیں۔ میں کبھی خالص ادب بھی لکھتا ہوں۔ ”انتقال روح“ اور ”آسیب زدہ لڑکی“، یہ فکشن ورک ہے۔

س: اس وقت تک آپ کی کل کتنی کتب آچکی ہیں؟

ج: قریباً ۲۲ سو۔

س: آپ موت سے خائف ہیں؟

ج: میں موت سے بالکل خائف نہیں، کراچی کے ہنگامے میں گولی نے میری ٹانگ چھیل ڈالی تھی اور میں بال بال بچا۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے تو خوف کا ہے کا؟

شعب منصور کہانی میں سنسنی اور موثر پیدا کرنا جانتا ہے

بہت سوچ کر لکھتا ہوں ۳۶۱ رواں زاویہ تلاش کرتا ہوں



س: زندگی کی تعریف کریں؟
ج: زندگی ایک جھولا ہے جو ہمیں جھلاتا ہے، کبھی خوش کی طرف تو کبھی غمی کی طرف۔
س: کیا مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کبھی پھر متحد ہو سکیں گے؟

ج: سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ مغربی پاکستان کی غلطیوں سے تو یہ بات بڑھی۔ ہماری قیادت کی فاش غلطیاں ہی ہیں۔ زبان کا مسئلہ، بنگلہ بھاشا کی حمایت والوں پر فائرنگ، جانب داری، وسائل کی غیر منصفانہ تقسیم۔ بنگلہ دیش ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو اپنا یوم آزادی کہتا ہے، اس سے زیادہ کیا بتاؤں۔ وہاں کا ماحول آب و ہوا، مزاج سب مختلف ہے۔

بنگلہ پانی سے بھرا ہوا ہے، اسی لیے وہاں مچھلی بہت سستی اور عام ہے۔ وہاں سانپ بھی پانی کی وجہ سے عام پائے جاتے ہیں۔ دھان بھی پانی کا ہی دوست ہوتا ہے۔ بارش وہاں دوسرے تیسرے دن ہوتی رہتی ہے۔ دریا ہر ۳۰، ۳۰ میل کے فاصلے پر ملتا ہے۔ اب آپ کو بنگال کا تصور سمجھ آیا ہوگا۔ مٹی باہنی نے دریاؤں کے پل جو کشتیاں جوڑ کر بنائے گئے تھے، ہٹا دیے۔ انھوں نے لیے درخت کاٹ کر سڑکوں پر گرا دیے۔ یوں مغربی پاکستان کی فوج نہ نقل و حرکت کر سکی نہ اس طرح کی کارروائی کا توڑ کر سکی۔

س: بنگالی جادو میں کیوں بہت مشہور ہیں؟
ج: کالا جادو تو ہر ملک میں کیا جاتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگالی جادو بنگال کی لڑکیوں، عورتوں میں ہے کہ وہ اپنے میاں کو باندھے رکھتی ہیں۔ یہ ان کی وفا اور محبت ہے، جادو تو محاورہ بن گیا۔ بنگالی لڑکیاں اور عورتیں سانولی

اور دہلی پتلی ہوتی ہیں۔ سیاہ آنکھیں اور گھٹنا بھری لمبی لمبی زلفیں۔ آپ ان کی وفا اور محبت کا اندازہ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ وہاں میاں اکثر دوسری شادی نہیں کر سکتا۔
س: پاکستان میں آپ فلم کے میڈیم کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟

ج: فلم ہمارے ہاں اپنی موت آپ مر چکی ہے۔ شک فلم بہت بڑا میڈیا ہے مگر ہمارے ہاں یہ اس وقت تک زندہ نہیں ہوگی جب تک ”گجر اور بد معاش“ جیسی فلموں پر سرکاری قدغن نہ عائد کی جائے۔ دنیا نے فلم سے بہت فائدہ اٹھایا، اسے تفریحی، معلوماتی اور تعلیمی مقاصد کے علاوہ سماجی تہذیب کے لیے استعمال کیا مگر ہم اسے کھو چکے۔ ”مینیج“ پوری دنیا میں دیکھی گئی اور اس کے زارم ہوئے۔ بھارت فلمی تفریح کی آڑ میں اپنے نظریات پھیلاتا ہے۔ وہاں فلم باقاعدہ انڈسٹری ہے، اس کے تخصص شاک ایکس چینج میں سکتے ہیں۔ ہم ابھی وہی گنڈاسا، خون اور چیخ و پکار کے نمائندے بنے بیٹھے ہیں۔ ہماری فلم دنیا سے ۷۰ سال پیچھے ہے۔ وہی زمانہ جس کی کہانیاں اور موضوعات۔

ہالی وڈ فلم کا دامن بہت وسیع ہے۔ زہریلے کتے، خلائی مخلوق، زلزلہ، محبت، نفرت، بیچ فکسنگ، جینا لوہی، سائنس اور ناول افسانے..... ہالی وڈ نے ہر موضوع پر فلم بنا ڈالی۔ ہمارا فلم میکرو فارمولا کے فریب میں جتنا ہے، وہ یہ نہیں جانتے کہ فلم ٹریڈ سوسائٹی کیا جاتا ہے۔

مانخی میں پاکستان نے فلم پر کام کیا اور کامیاب رہا۔ نذر الاسلام بہت بڑا ادیب تھا، کار تھا، انتہا درجے کا ذہین۔ حسن طارق اور فضلی کے علاوہ ایس ایم یوسف نے بہت اچھی فلمیں دیں۔ ریاض شاہد انقلابی کہانی کا اور فلم

فرہاد۔ اب ہم شعیب منصور کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ کبھی کبھانی میں موڑ اور سنسنی پیدا کرنا جانتا ہے۔ اس نے بچپن میں بڑی فلمیں بنا ڈالیں۔ میں اس کی کہانی کی طرف کرتا ہوں۔

بھارت میں سارے مسلمان پٹھان فلوں پر راج کرتے ہیں۔ ان کے بغیر بھارتی فلم کی کہانی رہ جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح ہم بھی اچھی فلمیں بنا سکتے ہیں۔ گجر ہاش، وحشی ڈوگر اور ضدی راجپوت گھٹیا موضوعات ہیں۔ یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے ہیں، فاشی پھیلاتے مگر دنیا اور تفریح نہیں دے پاتے۔ میں نے خود برصغیر کے ہر فلم ڈائریکٹر کے ساتھ فلم سکرپٹ لکھے۔ پاکستان کی بھاری فلمیں ہلاک بسر رہیں۔ اب بھی میں فلم لکھ سکتا ہوں مگر معاوضہ اڑھائی لاکھ روپے لوں گا۔ جس بندے کو ملے گا کھڑاک، لکھنے والے ۲۰ ہزار روپے میں مل جائیں، وہ میرے پاس کیا لینے آئے گا؟ بالکل اسی طرح کہانی وی ڈراما کے لیے بھی ایک منٹ کے ایک ہزار روپے وصول کرتا ہوں۔ پھر میرے سکرپٹ پر کوئی کہیں لکھ کر رکھ پاتا۔ ارفع و اعلیٰ کے لیے دام تو خرچ کرنا پڑتا ہے۔

س: کبھی آپ کی کہانی کہیں انک جائے، پھر کیا سنے ہیں؟

ج: ایسا ہوتا ہے مگر میں گھبراتا نہیں۔ ہر انسان شش دانہ آگے پیچھے، اوپر نیچے، دائیں بائیں، چھ پہلو سے ایک ایک پہلو اٹھا لیں اور کہانی بڑھا دیں۔ کہانی ایک نئے نئے مشکل فن ہے، یہ بھی موسیقی کی طرح روزانہ کی

ریاضت مانگتی ہے۔
س: کہانی طویل ہو تو کئی ادبا کا فن جھول کھا جاتا ہے؟

ج: میرے ساتھ ایسا نہیں ہوتا، طوالت کو میں کہانی کی اٹھان بناتا ہوں۔ کہانی کی بنیاد ہمیشہ کشادہ رکھتا ہوں، اس پر پتھر جوڑتے جانا میرا کام ہے۔ چار صفحات کی تمہید، چار صفحات کا تعارفی حصہ پھر کہانی چلتی جاتی ہے۔ کہانی میں آپ جب چاہیں نیا موڑ پیدا کر دیں۔
س: آپ نے اپنے بیٹے کے نام ایک انتساب لکھا ہے؟

ج: اس وقت میری حالت بہت خراب تھی۔ میں جنازے کو بمشکل چند قدم تک کھدھادے پایا کہ کسی نے پکڑ کر مجھے پرے کر دیا۔ جمیل ۲۵ برس کا کڑیل جوان تھا۔ اس باصلاحیت جوان کی کچھ دن بعد شادی ہونا تھی کہ پاکستان سٹیل ملز کے پاس ایک آئل ٹینکر نے اس کی گاڑی کو ٹکرا دے ماری۔ اس سانحے سے میں بہت عرصہ رنجیدہ رہا۔ ۱۹۸۰ء میں میری ایک کتاب کا انتساب یوں تھا:
”اپنے جوان مرگ بیٹے جمیل الدین نواب کے نام!“

بیٹے!
تمھاری ماں اپنی مردہ کوکھ کے کتے سے سر ٹیکے ابھی تک رو رہی ہے۔ وہ تخلیق کے کرب کو نہیں بھولے گی، روتے روتے ایک دن مر جائے گی۔ مگر میرے پاس آنسوؤں کے لیے زیادہ جگہ نہیں۔ میں تمھارے بعد بھی زندہ رہوں گا۔ اس بڑھاپے میں ان سے لڑنا رہوگا جو تمھاری چھوٹی ہوئی دنیا کی خوب صورتی کو مٹاتا



قراۃ العین حیدر ذہین اور پڑھی لکھی تھی
جنتی حسین تھی، انداز تحریر بھی اتنا ہی جاذب تھا

میرے پاس آنسوؤں کے لیے زیادہ جگہ نہیں
۲۵ سالہ بیٹے جمیل کی شادی ہونے والی تھی۔ جب آئل ٹینکر نے اس کی گاڑی کو اڑا دیا

چاہتے ہیں۔“

س: کراچی اردو کتاب کا بڑا پلیٹ فارم ہے یا لاہور؟
ج: کراچی صرف اردو رسائل کا بڑا پلیٹ فارم ہے۔
لاہور کتاب کا پلیٹ فارم ہے۔ اردو بازار لاہور کی نمبر ون
اردو بک مارکیٹ ہے۔ بھارت ہم سے کئی گنا بڑا ہے مگر
دلی کا اردو بازار لاہور کے مقابلے میں محض بچہ ہے۔

س: علی سفیان آفاقی نے کہانی، خط دار ناول اور فلم
لکھنے میں بڑا نام پایا۔ آپ کے تو ہم عصر ہیں۔ ان کا
اسلوب کیا ہے؟

ج: بہت اچھا ہے، اب آفاقی کا تعلق فلم سے سونی
صدکٹ چکا، صرف قلم کتاب سے رابطہ ہے۔ کوئی سوچ
بھی نہیں سکتا کہ اتنا دھان پان سا شخص اتنا سختی قلم کار
بھی ہے۔

س: ”آگ کا دریا“ ایک اچھا ناول ہے؟
ج: قمرۃ العین حیدر بہت ذہین اور پڑھی لکھی تھی۔
میں اس سے مل چکا ہوں۔ وہ جتنی حسین تھی، اس کا انداز
تحریر بھی اتنا ہی جاذب نظر ہے۔ وہ عوام کی رائے نہیں، عقل
و فہم اس کی تحریر کے ساتھ ساتھ بروئے کار لائی جائے تو
بائی کلاس ناول سمجھ آتا ہے۔

س: یہ قمرۃ العین کے حسن کا خصوصی تذکرہ آپ نے
کیوں کیا ہے؟

ج: یہ نعمت اسے خدا نے دی تھی۔ وہ اگر مقابلہ حسن
میں حصہ لیتی تو عالمی سطح پر اول درجہ پاتی۔

س: کیا یوگا سے آپ کے فن پر مثبت اثرات مرتب
ہوئے؟

ج: میں یوگی رہا ہوں..... اب سانس کمزور ہو چکا،
اکھر بھی جاتا ہے۔ یوگا سے اب بھی سانس کو سہارا مل جاتا
ہے۔ یوگا نے مجھے بہت لمبے عرصے تک شاداب رکھا۔
یوگا جسمانی، نفسیاتی اور ذہنی طاقت کا ایک موثر سرچشمہ
ہے۔ ظاہر ہے جسم اور ذہن ساتھ دیں گے تو بڑھیا کہانی
جتم لے گی۔

س: پاک سرزمین نہ ملے تو دو گز زمیں بھی نہ ملے؟

یہ آپ کے ایک ناول کا مکالمہ ہے۔

ج: ہاں یہ بہت اذیت ناک صورت حال ہے۔
کراچی، بلوچستان اور خیبر پختونخواہ..... ہر جگہ آگ لگ رہی
رہی ہے۔ ہمیں اپنی نفرتیں مٹا کر ایک پُر امن معاشرہ
تشکیل دینا ہوگا۔ گوادر پر اب تک اربوں روپے خرچ
ہوئے مگر بد امنی اور غلط پالیسیوں کے باعث وہ امنی
کر رہ گیا۔

غلامی، اچھی تعلیم کی کمی، گندی غلیظ سیاست،
حب الوطنی سے دوری اور مذہب سے روگردانی! ہماری
سیاست اور قوم، دونوں اسلام سے بہت دور جا چکا۔ ہماری
اقتصادی، سماجی اور حکومتی نظام اسلام کے برعکس ہے۔ ہم
نسل در نسل ذہنی غلام ہیں، ان دیکھی زنجیروں میں جکڑے
ہوئے ہیں۔

غریب صرف اپنے بچے کو قرآن پڑھوا سکتا ہے باپ
سرکاری سکولوں میں اردو پڑھوا لے گا۔ امیر اپنے بچے کو
تھرو آؤٹ انگلش میڈیم سکولنگ کے بعد کیمبرج بھیجے گا۔
پھر وہی بچے غربا پر راج کریں گے۔ تعلیم یہاں کتنی ہے،
لوگ اپنی اپنی بساط کے مطابق خرید لیتے ہیں۔

اعراض سے بھری سیاست کے نتائج کراچی نے
۳۰ سال بھگتے۔ اب خیبر، بلوچستان میں بھی روزانہ دس
دس افراد اوسطاً مارے جاتے ہیں۔ یہ غلط سیاسی حکمت
عملی کا شاخسانہ ہے۔

ہم حب الوطنی سے دور ہیں۔ اڑھائی ہندو مل
بٹھتے ہی اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنا لیتے ہیں۔
رنگ، نسل، قوم، ذات، زبان اور فرقہ..... دنیا کے کئی
ممالک متعدد اقوام، نسلوں، رنگوں، ذاتوں، زبانوں
اور فرقوں کے علاوہ مذاہب کے فرق کو اپنے اندر سمو کر
بڑے زبردست انداز میں چل رہے ہیں۔ ہم سے یہ
بھی نہیں ہوتا۔

لکھنے والے لکھتے اور کہنے والے کہتے رہیں گے شاید
کبھی کسی دل پر خیراترے اور پاکستان میں وہ سب کچھ
ہونے لگے جس کی ہمیں آرزو ہے۔

میں وہ شخص ہوں، تنہا ہند کے بعد لاہور نے جسے اپنے سینے سے لگایا۔ وہ کہ جن کے وجود کا میں ایک حصہ ہوں، اُن
میں سے کئی ایک کو اس شہر نے اپنا بنایا، ابدی نیند سلا کر اپنے دامن میں چھپا لیا۔ اسی لاہور کی یادوں کا قرض حسنہ مجھ پر
ادب ہے، سوادا کر رہا ہوں۔

”تسَنیم“ میں کام کرنے کا معاوضہ 35 روپے ملتا

ادِ ماضی ”شاد“ ہے یادرب!



ناآسودہ معاشرے کے ستارے ایک بے حال
مہاجر جڑ کے کی عزم و ہمت سے بھری داستان

ڈاکٹر اسد اریب

سال ۵۸ء، ۵۹ء، ۶۰ء کا زمانہ تھا۔ روزنامہ تسنیم
کا دفتر شاہ عالم بازار کی ایک نئی تعمیر شدہ عمارت میں
کام کر رہا تھا۔ اگر ہمارا رخ رنگ محل کی طرف ہو تو
اُلٹے ہاتھ کی طرف ایک فوارہ لگا تھا۔ اس کے ساتھ
(شدِ حالیہ) آئیو ویدک، دواؤں کی ایک بڑی ایجنسی
تھی۔ اس سے چند قدم آگے یہ عمارت واقع تھی۔ جس
میں ہمارا دفتر تھا۔ ایشیا، تسنیم اور اردو ڈائجسٹ کا سارا
عملہ آباد شاہ پوری صاحب سمیت وہیں دھونی بھاتا۔ یہ
جگہ ”تسنیم“ کے اس دفتر سے کہیں زیادہ روشن، باوقار
اور دیکھنے دکھانے کے لائق تھی جب وہ گولانڈی
تھانے کے پڑوس والی خستہ حال بالائی منزل میں واقع
تھا۔ یہ اور بات کہ تب روزنامہ تسنیم کی انتظامی باگ
دوڑ مولانا کوثر نیازی کے ہاتھوں میں تھی۔ انھوں نے
اپنی گرمی تحریر سے روزنامے کی تعداد اشاعت خاصی
بڑھادی تھی۔ میں جب ”تسنیم“ میں پہنچا، ادارے کے
مالی حالات کچھ اچھے نہ تھے۔ ہماری خواہیں، بجائے
روزنامے کے ہفت روزہ ایشیا کے کھاتے سے ادا ہوتیں
اور وہ بھی بالاقساط۔

خوب زمانہ تھا! رات کی شفٹ میں
مقبول جہانگیر، ”تسنیم“ کی ادارت
کرتا۔ خوب مذاق، خلیق اور انسان
تھے۔ شاید بہت زیادہ عُمرت نے اسے آسودہ
نفاذی دولت سے مالا مال کر رکھا تھا۔ اقتدار اور اشفاق
اور زمانے کی نوک پلک سنوارا کرتے۔ میں انگریزی
اور اردو ترجمہ کر کے، خبروں کا مقبول جہانگیر کے آگے
پیش کرتا۔ وہ میری بنائی ہوئی خبر غور سے پڑھتا اور
میں کرکھتا ”بھیا خیال کرنا، ایک ایک حرف کی باز
ملک صاحب مجھ سے کریں گے۔ تم سے نہیں، وہ کیا
کے؟ تم کون ہو؟“

واقعی میں ملک صاحب کو نہ جانتا تھا۔ مجھے تو روزنامہ
”تسنیم“ میں مقبول جہانگیر لے کر گیا تھا اور کہا ”تمہارے
کا کام ہے۔ کہیں لکھیں گی، چائے چلے گی، دو تین گھنٹے
میں ہی لگے کام کے ۳۰، ۴۰ روپے باقاعدگی سے مل
سکتے ہیں۔“ لیکن جب یہ ۳۰، ۴۰ روپے بھی
میں ملنے لگے تو ہمیں پتا چلا یہ ملک صاحب کون
ہیں؟

ایک دن کیا ہوا؟ مقبول جہانگیر نے میری ترجمہ کی ہوئی کچھ سلیں میرے آگے رکھیں، ہنسا کہنے لگا، لودیکھو عبارتوں پر جگہ جگہ روشنائی سے دائرے لگے ہوئے تھے۔ ملک صاحب نے مہربانی فرمائی اور وپیرہ، تماشا، سہرہ، تھانہ دار، ڈاکیا، رپورٹ جیسے میرے ترجمہ شدہ الفاظ بہ صحت (وتیرہ، تماشا، سہرا، تھانے دار، ڈاکیا، تلاطم اور رپٹ) لکھ کر میری ڈیسک پر بچھوا دیے۔

مقبول جہانگیر سکرایا اور سنجیدگی سے بولا ”صاحب شکر بجالائیے، یہ ملک نصر اللہ خاں عزیز ہیں، نہ ہوئے مولانا ظفر علی خاں، جنھوں نے اپنے اخبار میں ڈبلی تیلی جسامت والے مولانا شبلی کے تذکرے میں مولانا شبلی لکھے جانے پر اپنے پروف ریڈر کو گھر کی راہ دکھا دی تھی۔

اب مجھے پتا چلا، یہ ملک صاحب قبلہ، جن کا ہماری ڈیسک پر بار بار تذکرہ آتا۔ ملک نصر اللہ خاں عزیز تھے۔

میں ابو الکلام آزاد کی ”غبار خاطر“ پڑھ چکا تھا۔ میرے ذہن کے ایک گوشے میں نہیں یہ نام بھی اب تک محفوظ چلا آتا تھا۔ مولانا سے ان کے گھر پر عملہ ”تسلیم“ کے ساتھ ملاقاتیں ہوا کرتیں۔ کبھی ہم اپنے واجبات کی سہل اور بروقت ادائیگی کے لیے کہنے جاتے، کبھی وہ از خود بھی یاد فرماتے۔ بھونڈ پورہ، پھل روڈ مزنگ چوکی جاتے ہوئے اٹے ہاتھ پر ایک نہایت کشادہ سی گلی میں یہ ایک قدیم طرز تعمیر والا مکان تھا۔ یہ گلی میں بھی بھول نہیں پاؤں گا۔ اس گلی کے ایک طرف میرا بہت پیارا دوست طاہر اسدی رہتا تھا۔ وہ مساوات اور نوائے وقت کا صحافی تھا۔ جوانی میں مر گیا۔ ملک صاحب کا مکان بھی اسی گلی میں تھا۔ مغل عہد کی کلیا اینٹوں سے بنا ہوا، الگ طرز تعمیر

کا مظہر، چوڑی چوڑی، منہ پھیلی سیڑھیاں چڑھ کر ہم آگے کچے صحن والی چھت پر جمع ہوتے۔ پکلی پھلکی چائے پیتے ”تسلیم“ سے متعلق ہدایات سننے اور چلے آتے۔ اس کی

ملاقاتوں میں مولانا کے بڑے اور چھوٹے صاحب زادے ظفر اللہ خاں اور حامد اللہ خاں بھی موجود رہتے۔ مولانا نصر اللہ خاں نہایت دھیے مزاج والے، گفت و بیان شخص تھے۔ ہمیشہ حوصلہ افزائی سے پیش آتے، عمل کی طبیعت کا خاصہ تھا۔ کئی سے قطعاً نا آشنا تھے، رویے میں

بزرگانہ شفقت، ہر قدم چھلکتی، عموماً شروانی اور شلوار میں ملبوس رہتے، قراقلی ٹوپی پہنتے، برہنہ سر بھی نظر نہ آئے۔ اللہ اللہ! کیا خوب آدمی تھے۔ روایات پنجاب کی تہذیب متحسنا شخصیت سے چھلکتی۔ ہماری ملاقاتوں کا ایک براہ ایجنڈا ہمارے واجبات کی بروقت اور مکمل ادائیگی سے متعلق ہوتا۔ مولانا کا مہذب اور مشفقانہ طرز عمل، ہمارے کام سے طلب کو بھرتو نہ پاتا۔ تاہم ہم تینوں..... مقبول جہانگیر،

اشفاق اور میں پرسکون انداز سے واپس سرور آ جاتے۔ مقبول، پرانی انارکلی کی عقبی گلی میں جہاں بھی دھولی گھٹا ہوتا تھا، ایک نہایت خستہ کوارٹر نما مکان میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتا۔ میں اسے وہاں چھوڑ کر خود دھولی کچا نسبت روڈ آ جاتا اور خدا کا شکر ادا کرتا کہ میرے روزگار کا واحد ذریعہ ابھی برقرار ہے۔

روزنامہ تسلیم میں مجھے کام کرنا اور ۳۵ روپے ملنا خواہ وہ بالاقساط ملیں، بڑا حوصلہ دیتا۔ کیونکہ میں جب دسویں جماعت میں تھا، ۱۹۵۳ء، ۵۳ء کا زمانہ ہوگا۔ عملی سٹی کے اخبار ”سفینہ“ اور ۳۵ روپے پارک میں قائم خوب حسن نظافی کے چہیتے مرید، میاں سلطان وجوہی کے

ایک پرکھت پڑھت کے کئی کام کر چکا تھا۔ وہاں بھی برادری میں واجبی سا تھا، باتیں زیادہ تھیں مگر باتوں اور دلوں سے پیٹ بھلا کب بھرتا ہے۔

ہجرت کے بعد پہلے ۸، ۹ برس لاہور میں جس طرح گزرے، ان دنوں کی کسک آج تک باقی ہے۔ تربیت سے بھرے لاہور نے سب ذمہ آہستہ آہستہ بدل کر دیے۔ لیکن جو گفتنی ہے، اس کے کہہ دینے میں کیا حرج ہے؟

یہ وہ دور تھا، جب نا آسودہ معاشرت کے ستارے بے ہم جیسے بے حال مہاجر لڑکے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے لیے گھر گھر جا کر ٹیوشن پڑھاتے۔ بیشتر لڑکوں کے گھروں میں صدیوں سے تعلیم کا رواج عام چلا آتا تھا۔ ہم بھی انہی میں سے ایک تھے۔ ہمارے پڑھکوں کا پوزیشن تو ہمیشہ ادب و انشا اور شاعری رہا، چنانچہ ہم نے بھی اسی میدان میں قسمت آزمائی۔

پاکستان بننے کے بعد پہلی دہائی میں لاہور کا اردو ادبی اچھے عروج پر تھا۔ چند ادارے اردو کلاسیکی ادب کو اظہار چھاپنے لگے، میر اسلم، ڈپٹی نذیر احمد، فرحت اللہ، امداد امام اثر، مولانا محمد حسین آزاد کی کتابوں کے اردو رنگ گئے۔ شاعری اور ادب کی بمشکل ہی کوئی کتاب ملتی جو چھپنے اور کینے سے رہ گئی۔ ان مرقہ حقوق کائنات کی آہی مارا باری تھی کہ اللہ دے بندہ لے۔ اس

ادب کے ساتھ ساتھ ایک اور بھی سیلاب اُٹھ چلا آتا تھا۔ قلم جمل شدہ پرچہ جات، گیس پیپر، علوم شرقیہ کی کتابیں اور خلاصے۔ اس کا ٹھکانہ والے لڑچکر کا مؤلف لکھنؤ شخص کبھی نہ ہوتا، ہم جیسے پیشہ طلب، نوعمر طالب

علم ہی ہوتے۔ علی کتاب خانہ، کتب خانہ اعظم، پاک پبلشرز، فاضل مقبل اینڈ سنز، فرمان علی نامی اداروں نے یہ خدمات بخوبی انجام دیں۔

ایک دن ہم بھی اس گرمی بازار میں جا پہنچے۔ ڈاکٹر روح العین یزدک، خیال امر وہوی (جو بعد میں ایران گئے اور ڈاکٹر یٹ کر کے آئے) آقائے رازی اور یہ حقیر اٹھارہ بیس برس کا ناپختہ طالب علم، ان گلی کوچوں کی خاک صبح شام اڑایا کرتے۔ ہمیں حوصلہ ملتا، جب ہم دیکھتے نشتر جالندھری جیسے بزرگوں کے پاؤں بھی اسی ریت کی ڈھیری پر ہیں۔ پچیس تیس روپے یکشت ملتے تو اسی کو غنیمت جانتے کیونکہ عموماً وہاں پیسے قسطوں میں ملتے۔ مجھے اوروں کی تو خبر نہیں اپنا حال ضرور معلوم ہے۔ میرے لکھے غلاصوں اور گائیڈوں پر لکھا ہوتا: ”ماہرین نصاب کی نگرانی میں تیار کی گئی۔“ حل پرچہ جات پر تحریر ہوتا ”فاضل پروفیسروں کے قلم سے“ اور یہ نو آموز انڈر میٹرک۔ اس کام کے محتفیانے کی وصولی کے لیے ان داتاؤں کے در پر کئی چکر لگاتا۔ اب آسودہ حالی، جہاں گشتی، خوش بختی اور فارغ البالی کے اس دور میں وہ دن یاد آئیں تو کھلکا منہ کو آتا ہے۔ ان دنوں خلاصہ نگاری کے سبب قلم کی کساد بازاری زوروں پر تھی۔ علوم شرقیہ کے امتحانات (اردو، فارسی، عربی، عالم فاضل) پاس کر کے، انگریزی کا پرچہ، بورڈر یونیورسٹی کے نصاب کے مطابق دیا جاتا تو میٹرک، ایف اے، بی اے کی سند مل جاتی۔

حتیٰ کہ اسی گریجوایشن کی بنیاد پر وکالت کا امتحان بھی پاس ہو جاتا، آقا بیدار بخت وکیل نے جو ایم اے، ایم او

کتاب چھپ کر آئی تو مرتب میں ایک اور نام لکھا تھا۔ پتا چلا پبلشر کے نومو لو دفرزند ہیں یہ کتاب اب بھی سامنے آئے تو تملکلا جاتا ہوں

محبت سے بھرے لاہور میں ان دنوں کا تذکرہ جنھوں نے سب زخم آہستہ آہستہ مندمل کر دیے

ہم نے کہا تھا لکھیے۔ اپنی تحریری صلاحیتوں کا اظہار کیجیے اور اردو ڈائجسٹ کے صفحات پر جگہ لگائیے۔ ہمیں بہت اچھا لگا جب کہتے ہی نئے لکھنے والوں نے بڑی توجہ اور محنت سے اپنی تحریریں بھیجوائی ہیں۔ یہ پورے ۱۶ صفحات انہی تحریروں سے سجے ہیں اور بطور خاص انھیں رنگوں سے سنوارا گیا ہے یوں چاہیے یہ صفحات ہم نے آپ ہی کے لیے مختص کر دیے ہیں۔ سوچیے دلچسپ واقعات، چچی کہانیاں، کسی کی زندگی بدل دینے والے تجربات و مشاہدات اور ہمیں بھجوادیتجیے۔ (ایڈیٹر)

باتیں نئی
تحریریں نئی

یونیورسٹی میں چار سال

کہتے ہیں بار بار جانے سے عزت کم ہو جاتی ہے
پیار بڑھ جاتا ہے یہ کوئی کیوں نہیں بتاتا

محمد قاسم رضا۔ گوجرانوالہ

یونیورسٹی میں جانے والے ایک طالب علم کا قصہ دل پذیر اس نے روز کا کام
روڈ سٹم کرنے کا تہیہ کر لیا تھا۔ پھر 4 سال یہ تہیہ طے کر کے کیسے رکھا رہا؟

حبیب رضا کو کہ لاہور میں انھوں نے میرے ساتھ مل کر پائیزہ تفریح کی ایک مہم چلائی۔ وہ کہتے تھے، لاہور شہر کی ہر مسجد میں ہم نماز ظہر ادا کر کے نیار کیا کر ڈھنگ کریں گے۔ چنانچہ اسی سلسلہ خیر میں ہندو سے ایک دن ہم بھی اس بازار میں جا پہنچے۔

تذکرہ تھا ”السنہ شریفیہ“ کے اس ادارے کا جسے جناب آقا بیدار بخت وکیل چلاتے تھے۔ وہاں بڑے فاضل استاد پڑھاتے۔ مثلاً مشتاق اسلام آبادی جو بعد میں ڈائریکٹر تعلقات عامہ پنجاب ہوئے۔ آقا غریب نواز، بیدار بخت کے بھائی جنھوں نے امام بخش سہیانی کی ”حداائق البلاغت“ کا اردو ترجمہ کیا اور خود جناب آقا بیدار بخت جو لاہور کارپوریشن کے ایک مضبوط کونسلر اور لاہور بار کے ایک قد آور وکیل بنے۔ وہ وہاں باقاعدگی سے پڑھانے آیا کرتے۔ یہ وہی زمانہ تھا، جب قلم اور کتاب کے رشتے کو میں نے مضبوطی سے پکڑا۔ ائمہ اے تک کی تعلیم میں نے اسی سہارے سے حاصل کی، گوکہ اس راہ میں کئی بار سخت منزلوں کا بھی سامنا ہوا۔ اس ضمن میں ایک واقعہ میں اب تک بھلا نہیں سکا۔ میں پانچویں جماعت کے لیے لکھی اردو کمپوزیشن کی کتاب لکھ کر اپنے پبلشر کو دے آیا۔ جب وہ چھپ کر آئی، میں نے دیکھا کہ اس پر میرے نام کے ساتھ کسی طارق صاحب کا نام بھی ”مرتبین“ کے نیچے درج ہے۔ دریافت کیا تو معلوم ہوا، موصوف ہمارے پبلشر کے نومولود فرزند ہیں۔ وہ کتاب اب بھی میرے نامہ اعمال میں جب سامنے آئے، تملنا اٹھتا ہوں۔

”ایک پبلشر صاحب کے تقاضے پر گیس پیسٹ کیے۔ محنتان وصول کرنے گیا تو فرمانے لگے کل ادائی کروں گا۔ ایک ذرا محنت کیجیے حرف ”نون“ سے کوئی اچھا سا نام نکال کے لائیے۔ پانچ دس نام ہوں تو انتخاب میں سہولت رہے گی۔“ ان کے کسی عزیز کے ہاں پہنچے کہ آدھی آمد تھی۔ گویا میری اجرت کی وصولی اس نے کام سے مشروط کر دی تھی۔

ایل، اسی بنیاد پر کھلاتے، علوم شرقیہ کے اس فروغ میں ایک بڑا کام کیا۔ انھوں نے دہلی دروازے کے باہر، سرکلر روڈ پر لاہور کارپوریشن سکول کی ایک عمارت میں شبینہ تعلیم کے لیے ”ادارہ السنہ شرقیہ“ کھول رکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب میرے محترم استاد ڈاکٹر سید عبداللہ نے اردو بولو، اردو پڑھو، اردو لکھو تحریک سے لاہور کا قلب گرما رکھا تھا۔ آقا بیدار بخت بھی اردو تہذیب کے شیدائی تھے۔ انھوں نے اس ادارے میں بڑے بڑے فاضل و لائق استاد جمع کر رکھے تھے۔ میں ذاتی طور پر جناب طہ نقوی کو جانتا ہوں، وہ بعد میں پرانی انارکلی والے کسٹم کلکٹر ایٹ میں آفس سپرنٹنڈنٹ بھی تعینات ہوئے۔ غالب، انیس اور حافظ کے ایسے تکتہ شناس شخص تھے کہ بات نکلتے ہی ان کی نوک زبان سے ان شعراء کے شعر پھولوں کے مانند جھرنے لگتے۔ میرے سر میں بھی اردو کا سودا سایا رہتا۔ اس ادارے میں مجھے پڑھنے کے لیے حضرت شاہ صاحب نے بلایا۔ میں ایک دن اہل قلم کی مشہور بیٹھک ”گلینڈ بیکری“ میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ ایک مذہبی وضع کا خوبصورت، خوش لباس شخص میرے پاس آ کے بیٹھا اور مجھ سے بیٹھنے کی اجازت مانگی کہ اور میزیں وہاں خالی نہ تھیں۔ سلام دعا ہوئی، معلوم ہوا ”السنہ شرقیہ“ دہلی دروازے میں استاد ہیں۔ غالب کے متخلص ہیں۔ میں پھر انھیں سننے اور ملنے کے لیے کبھی کبھی ان کے لیکچر میں بھی جاتا رہا۔ ۳۵، ۴۰ برس کی عمر میں شاہ صاحب قبلہ نے کئی علوم پڑھ لیے تھے۔ مجھے تو وہ بحر العلوم معلوم ہوتے۔ اس پر طرہ یہ کہ پیش امام بھی تھے۔ ان کی امامت کا حال اس دن ہم پر کھلا جب ہم ”اس بازار“ کی ایک چھوٹی سی مسجد میں نماز پڑھنے گئے پتا چلا حضرت شاہ صاحب امامت کر رہے ہیں۔ ان کا حیلہ روزگار وہاں بھی تھا۔ ہمیں یہ منظر بھی انوکھے انداز میں ہاتھ آیا۔ اللہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے میرے مرحوم ہم سن بھائی،

سے ایف اے میں میرے نمبر اچھے آ گئے اور یوں ہر کوئی مجھے ہی اچھا سمجھنے لگا۔ زلث کے دن ابو نے پوچھا، ہاں بھی کتنے نمبر ہیں؟ میں نے نمبر بتائے تو کہنے لگا! اگر واقعی اتنے نمبر ہیں تو پھر جو تم مانگو گے، ملے گا۔ انھوں نے یہ بات اس لیے کہہ دی تھی کہ نہ اس کے اتنے نمبر ہوں گے اور نہ یہ کوئی چیز مانگے گا لیکن میں نے اس کے باوجود کسی خواہش کا اظہار نہ کیا کیوں کہ میں جانتا تھا کہ ۱۵ سال سے ابو مجھے سائیکل تک نہیں لے کے دے سکے تو اب انھیں کیوں تنگ کروں۔

اب مجھے ہر کوئی مشورہ دینے لگا کہ یہ کرو، یہاں داخلہ لو، آگے یہ پڑھو، تمھارے لیے فلاں ڈگری ٹھیک رہے گی اور میں سب کی ہاں میں ہاں ملاتا رہا۔ پہلے میرا خیال تھا کہ گورنمنٹ کالج میں بی اے کروں پھر اسلام آباد جانے کو جی کرنے لگا اور اب بھی مان گئے چونکہ گھر میں سب سے چھوٹا تھا اس لیے کسی بھی کام کے لیے ہر طرف سے ہر فرد سے اجازت ضروری تھی۔ ماں اس لیے نہیں مانی کہ بیٹا دور چلا جائے گا، بہن بھی ماں کی طرح ہی پیار کرتی ہے، اس لیے وہ بھی ماں کی طرف دار تھی، بڑے بھائی کو شک تھا کہ بچہ خراب ہو جائے گا، دوسرا بھائی میرے ساتھ تھا۔ کیونکہ وہ میرا دوست بھی تھا۔ اب کیونکہ ”نہ“ کا پڑا بھاری تھا اس لیے میں اسلام آباد نہ جاسکا اور شاید تعلیم اور زندگی کے بہترین معیار سے محروم رہ گیا۔

گھر میں سب سے چھوٹا تھا۔ جب کہیں نہ چلی تو ناراضی اختیار کی اور تین چار دن کھانا نہ کھایا اور اپنی ہی صحت خراب کر لی۔ پھر ماں نے مجھے سمجھایا، کچھ ڈرایا اور پھر دھمکی دے دی کہ اگر تو نہ کھانا نہ کھایا تو میں بھی نہیں کھاؤں گی۔ میں بھی پانی پی پی کر اور شہوت، جامن، نمکو بکٹ کھا کر تنگ آ چکا تھا، لہذا میں نے اسی میں عافیت

جانی اور ناراضی ختم کر کے خوب کھانا کھایا۔

اب بھائی کہنے لگا کہ کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی ہے، چلو یہاں گوجرانوالہ میں پنجاب یونیورسٹی کا نیا کیمپس بننا ہے وہاں داخلہ لے لو اور کل آخری تاریخ ہے فارم جمع کرانے کی۔ بھائی کا دوست وہاں پڑھتا تھا۔ میں اس کے ساتھ گیا اور فارم جمع کرا دیا۔ ٹیسٹ پتا نہیں کیسے پاس ہو گیا اور بی کام آنرز میں داخلہ ہو گیا۔

یہاں تو اور ہی دنیا تھی..... ہر کوئی پیسے کے حساب سے تولا اور باتوں کے حساب سے ناپا جا رہا تھا، باتوں کی بنیاد پر آپ کو اسفید کر سکتے تھے اور پیسے کی بنیاد پر خون سفید۔

اساتذہ ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ خلوص اور دورگی کی انتہا ایک ہی جگہ موجود تھی۔ آسمان چھونے والی باتیں اور عمل خاک نشیں والے۔ جھوٹ کو جھٹ ثابت کرنے کی دلیلیں اور سچ سے آنکھیں چرانے کا عمل میں نے بار بار دیکھا۔ جھوٹ پر ڈٹ جانے والے اور سچ پر بھی خاموش رہنے والے لوگ اور اس کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی بھی ایک معقول تعداد ہمارے ساتھ تھی۔ سرنوید کہتے تھے یہ واحد کلاس ہے جس میں لڑکیاں بھی محنت سے عاری ہیں۔

نئی جگہ، نئے لوگ، نئے حالات، نئے رشتے، نئے بندھن، نئی الجھنیں اور اگر کچھ پرانا تھا تو وہ میں تھا، یا میری سوچیں اور ہاں..... میرے کپڑے اور جو تھے بھی تو پرانے ہی تھے۔ پہلا سمسٹر تو بس ایک دوسرے کو دیکھتے دیکھتے ہی گزر گیا، طلباء تو شاید کبھی حیران و ششدر نظر آتے تھے، اوپر سے تمام اساتذہ پڑھاتے کم اور ڈراتے زیادہ تھے۔ ہر کوئی دھمکانے کے چکر میں تھا، یونیورسٹی تو پارک لگتی تھی لیکن کلاس جیل کی طرح محسوس ہوتی۔ کچھ دن تو چپ چاپ ہی رہا لیکن جب میں نے دیکھا کہ یہاں ہر کوئی ایک دوسرے سے ڈر رہا

ہے تو کچھ ہمت بندھی اور میرے منہ سے کچھ بول ادا ہونے لگے۔ کلاس میں کچھ سوال ہو گئے۔ کچھ ادھر ادھر کی چھوڑیں اور یوں میرے کچھ دوست بن گئے۔

شعب اور میں اکٹھے بیٹھنے لگے، رضا کو جب ایک لڑکی سے گھورنے کے علاوہ کچھ نہ ملا تو وہ بھی میرا دوست بن گیا۔ رضا کے ساتھ ساتھ حافظ عثمان سے بھی دوستی ہو گئی۔ بوٹی اور عمران تو ہمارے گروپ کی پہچان ہی بن گئے اور یوں باقی کلاس کے ساتھ بھی چھیڑ چھاڑ بن گئی۔ طلحہ سے میرا ادبی لگاؤ تھا تو سعد سے ادبی کھچاؤ، غلام محبتی سے ملازمت پر بحث ہوتی تھی تو عثمان اور لالے سے کاروبار پر بات چیت چلتی۔ شیراز مجھے سمجھاتا رہتا اور میں ارسلان پر نصیحتیں جھانڈنے کی کوشش کرتا۔

کلاس میں دو ابرار تھے، ایک ابرار شاہ اور ایک ابرار بزرگ۔ عمر میں دونوں ہی کلاس کے بزرگ تھے اور عمل میں دونوں ہی بیچے۔ ہر سچے سے بے عزتی کرانا انھوں نے خود پر فرض کیا ہوا تھا۔ آپس میں یہ ایسے تھے جیسے انڈیا اور پاکستان۔ کلاس میں ایسے تھے جیسے دنیا میں امریکا، یعنی ہر ایک پر چڑھائی کی کوشش، کمزور پر اصولوں کی بارش، برابر والے کے لیے منافقت اور جو خود سے بڑھ کر ہے، اس کی جڑیں کاٹنے کی کوشش۔ دھوپ میں یاں سفید کرنے کی مثال شاہ صاحب پر پوری اترتی تھی اور بزرگ پر ۶۰ سال کے بچے کی۔

کلاس میں دو رضوان تھے۔ ایک صرف پیپر میں آتا تھا اور دوسرا ریگولر آتا تھا لیکن اسے پیپر میں کچھ نہیں آتا تھا۔

پہلے سمسٹر میں، میں نے روز کا کام روز ختم کرنے کا تہیہ کر لیا، آخری سمسٹر تک یونہی تہیہ کر کے ہی پڑا رہا کہ روز ایک ایک باب ختم کیا جائے تو مہینے میں ساری کتابیں ختم ہو جائیں گی۔ پھر جب ۱۵ دن رہ جاتے تو روزانہ کے دو باب ختم کرنے کا ارادہ کرتا۔ پھر پیپر

شروع ہونے میں ایک ہفتہ رہ جاتا تو روز پوری ایک کتاب ختم کرنے کا پکا وعدہ کرتا اور آخر کار پیپر کی رات اہم سوالات کو پوچھ کر تیاری شروع کرتا۔ ۳ سال یہی چکر چلتا رہا۔ آخری سمسٹر میں تو یوں ہوا کہ پیپر کا وقت ۲ بجے ہوتا اور میں رات کو پڑھنے کے بجائے صبح تیاری کرنے کا ارادہ کر کے سو جاتا۔

میرے پیپر کچھ یوں ہوتے تھے کہ میں طلحہ کے ساتھ مل کر پڑھنے کے منصوبے بناتا، شعب کے ہاسٹل میں رہتا، ارسلان سے نوٹس کا پی کرانا، بوٹی کے ساتھ ساری رات پٹرول پمپ پر کتاب کھول کر بیٹھا رہتا اور عمران شیخ اسی پریشانی میں نہ پڑھ سکتا کہ ہم پڑھ رہے ہوں گے۔ ایک بار علی نے مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرانی اور جب زلث آیا تو اس کے اپنے نمبر مجھ سے کم آئے۔ اس کے بعد جب بھی میں نے اس سے کسی مضمون کی تیاری کرانے کو کہا تو اس نے یہی کہا کہ یار ابھی میری اپنی تیاری نہیں ہے۔

کہتے ہیں ایک جگہ بار بار جائیں تو عزت کم ہو جاتی ہے، پیار چاہے بڑھتا رہے۔ یونیورسٹی کے معاملے میں میرے ساتھ اس کے بالکل الٹ ہوا، پہلے چار سمسٹر میں، میں صبح صبح ہی یونیورسٹی پہنچ جاتا اور پھر لائبریری والوں کے ساتھ ہی باہر نکلتا یعنی شام پانچ بجے۔ لیکن ۴ سمسٹر کے بعد وہاں جانے کو بالکل جی نہ کرتا، دیر سے جانا، جلدی آ جانا۔ اکثر نہ جانا کئی بار پورا ہفتہ چھٹی منانا۔

یونیورسٹی کے ۴ سال نے میرے خیالات ایسے بدلے کہ جیسے پرانے شہر میں ہر چیز نئی بن جائے، میں ایک شہر تھا جہاں کے باسی کچھ سال بعد اجنبی بن جاتے اور نئے تصورات ان کی جگہ لے لیتے ہیں۔ ان ۴ برسوں میں ذہنی تبدیلیاں تو کئی تھیں لیکن بظاہر نظر آنے والی تبدیلیاں کچھ یوں تھیں کہ آنکھیں کتابوں سے

ٹکرائے بغیر ہی اندر کو دھسن گئیں۔ گلابی رنگت دھوپ سے سیاہ ہونے کے بجائے پیلی اور سفید نظر آنے لگی، چہرے پہ پڑنے والے گڑھے صاف لہروں میں بدل گئے۔ عادتوں میں کچھ یوں تبدیلی آئی کہ صبح جلدی اٹھنے کے بجائے دیر سے جاگنا معمول بن گیا۔ صبح کی ورزش اور سیر کی جگہ ایک انگڑائی پہ ہی کام چلنے لگا۔ گویا یہی ورزش تھی۔ جیب کی حالت کچھ زیادہ ہی جھڑکی جتنے پیسے ہوتے سب آنے جانے پہ ہی خرچ ہو جاتے۔

پہلے ۴ سمسٹرز میں نے خوب محنت کرنے کی کوشش کی لیکن کیونکہ میٹرک اور ایف اے پرائیویٹ کیا تھا اور یہاں ایک اور ہی سیٹ اپ تھا۔ شاید اس لیے مجھے اچھے نمبر نہ مل سکے اور صرف پاس ہونے پر اکتفا ہوا، البتہ نمبر لینے کا پتا چل گیا اور اگلے ۴ سمسٹرز میں بھی صرف پاس ہونے پر ہی اکتفا کیا کیونکہ اب نمبر لینے کا پتا چل گیا تھا لہذا اب پڑھنے کا کیا فائدہ۔

آخری ۲ سمسٹرز میں میڈم قنديل نے پڑھایا تو ہر لیکچر میں یہی کہتیں کہ میرے پیپر کی تیاری روز پڑھنے سے ہی ہوگی، میں رحمت کو کہنی لگا دیتا اور پھر ہم ہمیں روکنے کی کوشش کرنے لگتے۔

پہلے دن سے یہ خواہش رہی کہ اتنے اچھے نمبر لوں کہ سب لوگ مجھ پہ فخر کریں۔ تاہم ایسا نہ ہو سکا البتہ یہ ضرور ہوا کہ جب میں میڈم کے پیپر میں پاس ہوا تو سب لوگ حیران ہو گئے کیونکہ میڈم کے پیپر میں چند لوگ ہی پاس ہوتے تھے۔ ۸ سمسٹرز میں سے ۷ میں ہر دفعہ ایک میڈم نے ضرور پڑھایا لیکن پڑھایا نہیں بلکہ صرف رٹے پر ہی زور لگایا۔ میڈم قنديل تو ہمیں خوابوں میں بھی آکر ڈراتی، واحد میڈم ہے جب بھی یاد آئی، مانتے تھے پہل ضرور آئے۔ اکثر طلباء میڈم کے لیکچر کو طارق عزیز شوکت البتہ انعامات کی جگہ جھڑکیاں ملتیں اور آخر پہ پاکستان زندہ باد کا نعرہ بھی ہمیں خود لگانا پڑتا

(میڈم کے جانے کے بعد) اچھی بات ان کی یہ تھی کہ ہمیشہ وقت پہ آتی تھیں اور بری بات یہ کہ ہمیشہ وقت پہ نہیں جاتی تھیں بلکہ ۲۵، ۲۰ منٹ مزید پڑھا کر ہی جاتی تھیں اور ہم چاہتے تھے کہ ہو سکے تو وہ کلاس میں آنے کی زحمت نہ کریں لیکن ہماری معصوم خواہش، خواہش ہی رہی۔ البتہ انھوں نے بجائے چھٹی کرنے کے ۴ لیکچر زائد پڑھا دیے۔ وہ مشکل کو اہم کہتیں اور آسان کو مشکل بنا کر پڑھاتیں اور یوں میڈم کا ایک غیر اہم مضمون ساری کلاس کے لیے درد سر بنا رہا۔ کچھ لوگ صرف پڑھتے ہی میڈم کی کتاب تھے لیکن پھر بھی میڈم کی کتاب میں ۱۲ رلوگ فیل ہو گئے۔

پیپر جیسا بھی ہوتا، شیعہ اور میں ہستے ہوئے ہی ہال سے باہر نکلتے۔ ۴ رسال میں ۹۶ پیپر ہوتے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ساری کلاس رو رہی ہوتی یا رونے والا ماحول بنا ہوتا لیکن ہمارے چہروں پہ ہنسی دیکھ کر لوگ سمجھتے کہ ہمارا پیپر شاید ٹھیک ہو گیا ہو لیکن ہم تو یہ سوچتے نہ تھے کہ پیپر کیسا ہوا۔

ساتویں اور آٹھویں سمسٹرز میں جب میں اور رحمت اکٹھے رہنے لگے تو میں نے محسوس کیا کہ رحمت کی پریشانیاں مجھ پہ بھی اپنا اثر دکھا رہی ہیں لیکن جب میں دیکھتا کہ میری خوشیاں اسے بھی خوشیاں دے رہی ہیں تو میں پریشانی جھٹک دیتا۔ بات کچھ بول تھی کہ رحمت چھوٹی چھوٹی باتوں پہ پریشان ہو جاتا تھا اور میں بڑی بڑی بات پہ بھی خوش رہتا۔ ایک سال بعد اس نے میری عادت اپنائی اور مجھ پر اس کا سایہ پڑ گیا اور آپ تو جانتے ہیں کہ سائے کا اثر جاتے جاتے ہی جاتا ہے۔

اس مضمون کے مصنف نے پنجاب یونیورسٹی گوجرانوالہ کیسپس سے ایم کام آرز کیا ہے اور آج کل دی صفہ اسکول تملہ عالی کے پرنسپل کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ہمارے

ملک میں ایک کہانی مشہور ہے جو بچپن سے ہم پڑھتے اور سنتے آئے ہیں اور وہ کہانی یہ ہے کہ کسی عمارت میں آگ لگ گئی۔ لوگ اپنی اپنی جانیں بچا کر بھاگنے لگے۔ عمارت میں ۲۲ معذور بھی تھے۔ ایک لنگڑا اور دوسرا نابینا۔ انھوں نے بھی اپنی جان بچانے کی کوشش کی اور ان دونوں نے اپنی کمزوریوں سے مصالحت کر کے اور آپس میں مل کر جان بچائی۔ یعنی نابینا کے کندھوں پر لنگڑا سوار ہو گیا اور وہ نابینا کی رہنمائی کرتا رہا اور اس طرح دونوں اس آگ سے نکل گئے۔

آج کے ترقی یافتہ دور میں نئی تحقیقات اور ایجادات نئے مواقع پیدا کر رہی ہیں لیکن اس ترقی کے باوجود وطن عزیز میں لوگوں کی ایک بڑی اکثریت مایوسی اور ناکامی کی زندگی بسر کر رہی ہے۔ لوگوں کی زندگیوں میں احساس ذمہ داری کا شدید فقدان اور ناامیدی پائی جاتی ہے۔ کوئی اعلیٰ نصب العین اور مقصد حیات نہ رکھنے کے باعث کسی بھی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ۲۰۰۵ء میں یونیسف کی رپورٹ کے مطابق غریب ممالک کے لوگوں کی غربت اور بدحالی کے اسباب

میں نمایاں سبب یہ ہے کہ پسماندہ ممالک کے لوگوں کی سوچ بھی پست ہے۔ وہ اپنی غربت کو ختم کرنے کے بارے میں تنہا سوچتے تک نہیں۔ وہ یہ نہیں سوچتے کہ اس کائنات کی ہر چیز کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے مسخر کر دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔

وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِی السَّمَوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ

ترجمہ: ”اور اللہ نے آسمان و زمین کی ہر چیز تمھارے لیے مسخر کر دی ہے۔“ چند صدیاں قبل انسان نے ہوا میں اڑنے کا خواب دیکھا تھا۔ انسان کے اس خواب کو رائٹ برادرز (Right Brothers) نے تعبیر دی۔ کچھ عرصہ پہلے کے انسان نے آواز کو دنیا کے ایک کونے سے دوسرے کونے تک پہنچانے کا سوچا اور مارکونی نے اسے عملی جامہ پہنایا۔ ماضی

حافظ احمد ہاشمی

اپنی زندگی کے مثبت اہداف طے کرنے والے زیادہ بہتر کوشش کرتے ہیں

”ناکامیوں سے کامرانی تک“

ناکامی کو عارضی رکاوٹ جان کر جینے والے کامیابی کا چہرہ ضرور دیکھتے ہیں

قریب میں انسان نے اپنی تاریک راتوں کو منور کرنے کا سوچا اور تھامس ایڈیسن (Thomas Edison) نے اسے ممکن بنایا۔ سوال یہ ہے کہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اور عظیم ترین کامیابیاں حاصل کرنے کے لیے کوئی خصوصیات اور خوبیاں اپنائی جائیں؟ ان خصوصیات کی فہرست بہت طویل ہو سکتی ہے لیکن ان میں سرفہرست یہ ہیں:

- ۱۔ مثبت سوچ اور اعلیٰ مقصد حیات
- ۲۔ کامیابی کی شدید خواہش
- ۳۔ مسلسل سیکھتے رہنا، ۴۔ منزل کا تعین بروقت کرنا
- ۵۔ پختہ عزم و یقین، ۶۔ حوصلہ، صبر و استقامت
- ۷۔ مستقل مزاجی۔

کسی بھی فیلڈ کے باکمال اور سرکردہ افراد کی کامیابی کی بڑی وجہ ان کی مستقل مزاجی اور چھوٹی چھوٹی ٹیکنیکس ہوتی ہیں۔ مختصر شخص کے ہاتھوں میں مٹی بھی آکر سونا بن جاتی ہے جبکہ کامل، ست اور کام چور آدمی کے پاس آکر سونا بھی ہو تو وہ اسے مٹی بنا دیتا ہے۔ پوری دنیا کے سلف میڈ کامیاب ترین افراد کی اکثریت کا تعلق غریب یا متوسط گھرانوں سے ہے۔ یہ وہ افراد ہیں جنہوں نے کمپری کی زندگی گزارنے سے انکار کر دیا اور اپنی محنت، عزم اور استقلال سے اپنے اپنے کیریئر میں عروج حاصل کیا۔ کامیابی کے حصول کی راہ میں بے شمار رکاوٹیں بھی آتی ہیں۔ معروف دانشور روسو کہتا ہے: ”ناکام ہونا کوئی جرم نہیں، اصل ناکامی یہ ہے کہ آدمی ناکامی سے سبق حاصل کرنے میں ناکام رہے۔“ لہذا کسی بھی شخص کو عارضی ناکامیوں سے دل برداشتہ نہیں ہونا چاہیے۔

مقصد حیات طے کرنا

افسوس ناک حقیقت یہ ہے کہ اکثر لوگ قبر تک پہنچ جاتے ہیں لیکن ان کے اندر کا باصلاحیت انسان اندر ہی رہ جاتا ہے۔ اس ناکامی کی سب سے بڑی وجہ صلاحیت کا نہ ہونا نہیں بلکہ مقصد حیات کی عدم موجودگی اور اعلیٰ نصب العین کا فقدان ہے۔ **لیسنس للانسان الا ماسعی**۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق ہمیں وہی کچھ

ملتا ہے جس کے لیے ہم کوشش کرتے ہیں۔

غربت کے پسند ہے؟

میں نے اپنے ایک لیکچر میں حاضرین سے سوال کیا کہ آپ میں سے کون کون غریب ہونا چاہتا ہے؟ سب کے لٹی میں سر جھٹے دیکھ کر میں نے کہا اگر غریب نہیں ہونا تو غریبوں والے کام بھی چھوڑ دو۔ سب حیرت و استعجاب سے مجھے دیکھنے لگے۔ میں نے کہا آئیے دیکھتے ہیں کہ غریب کو کیا عادات غریب رکھتی ہیں اور اسے بہتر زندگی کی جانب نہیں آنے دیتیں۔

کیا انھیں نئے علوم اور نئی چیزوں کو سیکھنا پسند ہے یا نہیں؟ کیا وہ لوگ ایمانداری سے کام کرتے ہیں؟ کیا وہ اپنے وقت کا صحیح استعمال کرتے ہیں؟ کیا وہ مسلسل سیکھتے رہنے کے عمل سے گزرتے ہیں؟ کیا وہ اپنے سرمایہ کا صحیح استعمال کرتے ہیں؟ کیا وہ سگریٹ نوشی اور اس جیسی دیگر مضر صحت عادات سے گریز کرتے ہیں؟ کیا ان کی زندگی کا کوئی بڑا مقصد ہوتا ہے؟ کیا انھوں نے اپنی زندگی اور مستقبل کی منصوبہ بندی کی ہوتی ہے؟ یہی وہ خصوصیات ہیں جو ناکام اور کامیاب آدمی میں فرق پیدا کرتی ہیں۔ اگر آپ کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ان خوبیوں کو اختیار کریں۔ یاد رکھیں! امیر افراد کی سوچ غریب یا متوسط طبقے کے لوگوں سے مختلف ہوتی ہے اور ان کی یہی مختلف سوچ انھیں مختلف طرز زندگی عطا کرتی ہے۔

کامیابی حاصل کرنے کے لیے آپ کو دن رات محنت کرنا ہوگی۔ تکلیف اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑے گا اور یہ تکلیف اس کامیابی کی قیمت ہوگی لیکن ملنے والی کامیابی کا وہ لمحہ آپ کی تمام تکلیف کا ازالہ کر دے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ **ان مع العسر یسر**۔ ”پیشگی کے ساتھ ہی آسانی موجود ہے۔“

جسمانی صحت و تندرستی

اچھی اور کامیاب زندگی گزارنے کے لیے اچھی صحت ناگزیر ہے۔ Anthony Robins کے بقول ”Energy is the fuel of Excellence.“ (شاہراہ زندگی پر

کامیابی کا سفر)۔

صحت مند زندگی گزارنے کے لیے روزانہ صبح ہلکی چٹکی ورزش، کھیل کود، سیر و تفریح، مناسب آرام، متوازن خوراک، حفظان صحت کے اصولوں کی پابندی اور دیگر مثبت مشغلے اختیار کرنا چاہئیں۔

یاد رکھیے! زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال سے کام لینا کامیابی کی ضمانت ہے۔ اچھی کتب پڑھیں خصوصاً سیلف ڈیولپمنٹ کے موضوع پر بے شمار کتب موجود ہیں۔ ٹریننگ پروگرامز میں شرکت کریں۔

یاد رکھیں! آپ کا ذہن آپ کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے۔ اگر آپ کوئی کار خریدتے ہیں تو اس کی قدر قیمت مسلسل کم ہوتی رہتی ہے جیسے ہی آپ اسے شوروم سے نکال کر سڑک پر چلا تے ہیں۔ اس کی قیمت کم ہو جاتی ہے۔ اگر آپ کوئی بھی شے وجود رکھنے والی شے خریدتے ہیں تو اس کی قیمت کم ہوتی رہتی ہے مگر آپ اپنے ذہن کی قدر قیمت اسے نئی معلومات اور خیالات فراہم کر کے مسلسل بڑھا سکتے ہیں۔ عملی زندگی میں کام آنے والا جتنا زیادہ علم آپ کے پاس ہوگا آپ کو اتنے ہی زیادہ اعمال ملیں گے۔ اتنی ہی زیادہ کامیابیاں آپ کا مقدر ہوں گی۔

اب آئیے! ناکامیوں کو عارضی رکاوٹ کے طور پر لیں۔ کیا آپ نے کبھی سوچا ہے کہ ہم اپنی کامیابیوں سے نہیں سیکھتے بلکہ ہم ہمیشہ اپنی ناکامیوں سے سیکھتے ہیں۔ جی ہاں۔ ناکامیاں ہمیں سیکھنے کے مواقع فراہم کرتی ہیں۔ ہم ہمیشہ اپنی ناکامیوں سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ اگر آپ قائل نہیں تو پھر نیچے دیے گئے حقائق کو دیکھیں۔

☆ باسکٹ بال کے امریکی سپر سٹار مائیکل جوردن (Michael Jordon) کا نام اپنے ہائی سکول کی باسکٹ بال ٹیم کی طرف سے مسترد کر دیا گیا تھا کیونکہ کوچ کو یقین تھا کہ وہ اس قابل نہیں۔

☆ ادب کا نوبل انعام یافتہ برطانوی سیاستدان (Winston Churchill) چھٹی جماعت میں فیل ہو گیا تھا اور بعد ازاں جب تعلیم یونیورسٹی کے مرحلہ تک پہنچی تو آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں نے داخلہ دینے سے

انکار کر دیا تھا۔

☆ امریکی سائنسدان تھامس ایڈیسن (Thomas Edison) نے جب بجلی کا بلب ایجاد کیا تو اس کی حتمی کامیابی سے قبل وہ دو ہزار مرتبہ ناکام ہوا تھا۔

☆ ایک ڈاکٹر اور کلرک سے زندگی شروع کرنے والا ابراہم لنکن (Abraham Lincoln) امریکا کا سولہواں صدر منتخب ہوا تھا اور دوسرے صدر بنا۔ پہلی دفعہ ۱۸۶۰ء میں اور دوسری دفعہ ۱۸۶۴ء میں۔

☆ موجودہ دور کے مایہ ناز سائنسدان سٹیفن ہاکنگ (Stephen Hawking) جنھیں آئن سٹائن کے بعد دوسرا بڑا سائنسدان قرار دیا جاتا ہے۔ ان کا زیادہ تر کام بلیک ہولز اور تھیوریٹیکل کاسمولوجی (کونیات) کے میدان میں ہے۔ A brief history of time کے نام سے شہرہ آفاق کتاب کے مصنف بھی ہیں۔ آپ ایک خطرناک بیماری سے دوچار ہیں اور کرسی سے اٹھ نہیں سکتے۔ ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتے اور بول نہیں سکتے۔ لیکن دماغی طور پر صحت مند ہیں اور بلند حوصلگی کی وجہ سے اپنا کام جاری رکھے ہوئے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کو دوسروں تک پہنچانے اور اسے صفحے پر منتقل کرنے کے لیے ایک خاص کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں۔

پس ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم اپنے اندر یہ عادت پیدا کریں کہ صرف ان کاموں پر توجہ دیں جو ٹھوس نتائج حاصل کرنے کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں اور کسی بھی ناکامی کو عارضی رکاوٹ کے طور پر لیں۔ کسی غلطی سے کچھ سیکھے بنا آگے مت بڑھیں۔ بقول صادق حسین (مرحوم)

تندرستی بادل مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کے لیے

○

اس مضمون کے مصنف نے وفاق المدارس السلفیہ سے عالم کورس کیا اور حافظ قرآن بھی ہیں۔ انٹرنیشنل حسن قرأت مقابلہ میں ایران سے پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔ آج کل ڈاکٹر اسرار احمد کے ادارہ اکیڈمی میں عربی اور تجوید پڑھانے میں مصروف ہیں۔



کے بڑے کمرے میں سب افراد خانہ جمع تھے اور ٹی وی دیکھتے ہوئے اپنی اپنی رائے کا اظہار کر رہے تھے۔ ایک مشہور چینل کا میزبان، ”علامہ یوسف زئی“ پر حملے کے حوالے سے شرکاء سے ان کی رائے دریافت کر رہا تھا۔ ۱۴ سالہ بیٹی پر حملے کی تو تقریباً سب ہی مذمت کر رہے تھے مگر پھر بھی گفتگو کا رخ ایک دوسرے کی طرف مڑ گیا۔ شرکاء خوب تاک تاک کر نشانے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرے کو ”طالبان“ کا ساتھی، ملک میں بدامنی کا ذمہ دار، امریکا کا پھوڑا دے رہے تھے۔ سب کے چہرے سرخ تھے۔ منہ سے کف جاری تھا اور گلا پھاڑ پھاڑ کر اپنی بات کہے جا رہے تھے۔ پروگرام ختم ہوا تو کمرے میں بیٹھے افراد بولنے لگے۔ سب سے پہلی آواز اسماء کی تھی۔ وہ ایم۔ بی۔ بی۔ ایس، سال اول کی طالبہ تھی۔

”توبہ“ آج کے دور میں ایسی تنگ ذہنیت، ایسی جاہلانہ اور تاریک سوچ میں تو بہت حیران اور پریشان ہوں۔ حکومت کو چاہیے کہ ان لوگوں کو روکے..... کسی بھی طرح۔“ اسماء کا بھائی عمار محنتی اور ذہین۔ چند ماہ پہلے وہ امریکا سے برنس ایڈمشریشن کی ڈگری لے کر آیا تھا۔ اس

کے والدین اس کے معمولات میں ایک خوشگوار تبدیلی دیکھ کر بہت خوش تھے۔ نماز جمعہ اور عیدین کے لیے جانے والا، اب ہر وقت باجماعت نماز کا اہتمام کرتا تھا۔ اس کے انداز فکر، انداز گفتگو میں ایک واضح تبدیلی کا احساس ہوتا تھا۔ اسماء تو کبھی ”بھائی لگا ہے کہ آپ امریکا سے نہیں، رانیوینڈ سے ہو کر آ رہے ہو۔“ وہ جواب میں کہتا ”اسماء اللہ کا شکر ہے کہ دنیاوی تعلیم حاصل کرتے ہوئے، مجھے کسی حد تک حق کی پہچان بھی ہوئی۔“ ابھی بھی وہ کچھ کہنے والا تھا کہ اس کے تایا بول اٹھے۔

”بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے اسماء۔“ یہ حکومت کی ناپاکی ہے۔ جب قانون کی حکمرانی نہیں ہوگی تو ایسے ہی واقعات پیش آتے رہیں گے۔ عمار کہنے لگا، ہمارا مذہب ہمیں ہر معاملے میں اعتدال کی تلقین کرتا ہے اور ہم یہ اہم ترین تلقین بھول چکے ہیں۔ ”علامہ“ پر حملہ ایک بزدلانہ اور شرمناک عمل ہے۔ ہٹلری کا نشان، مارا بک اوباما اور بائیں مون، سب ہی کو بہت دکھ پہنچا۔ سب ملالہ کی مدد کرنا چاہتے ہیں، یقیناً یہ اچھا عمل ہے۔ ہم اسے راستے ہیں لیکن ڈاکٹر عافیہ صدیقی، ڈرون حملوں اور بم دھماکوں میں مرنے والے بچے، بے گناہ مردوزن، جامعہ حفصہ کی طالبات، فلسطین، افغانستان، شیمیر اور برہا میں بہتا مسلمانوں کا لبوہ ان کے ساتھ ہمدردی کیوں نہیں کی جاتی؟ مشرقی تیمور اور کشمیر کے بارے میں متضاد رویے نظر کیوں نہیں آتے؟ کوئی ذہنی مریض اس کا نات کی سب سے قابل احترام ہستی محمد ﷺ کی شان میں گستاخی کرتا ہے، تو اسے برا کیوں نہیں کہتے؟ اس کا راستہ کیوں نہیں روکتے؟ اسماء اور عمار کے والد کے چچا زاد ملک جہان خان کی گاؤں

جھگڑے جب ہی کیوں ہوتے ہیں جب گھر میں ”طلے“ ہوتے ہیں

چوہدری فتح خان اور چچا سام

سوال بڑا واضح ہے کہ اتنے سمجھدار ہو کر بھی چچا سام کی ”غلیل“ سے بے خبر کیوں رہتے ہیں آج کی نئی نسل کے لیے ایک مختصر مگر دلچسپ تحریر

عطیہ عمر

میں کبھی باڈی تھی اور ساتھ ہی کھیل فارم تھا۔ وہ خاموش بیٹھے، سب کی باتیں سن رہے تھے اچانک ہنس دینے تو سب لوگ ہنسنے لگے۔ وہ بولے ”ٹی وی پروگرام دیکھ کر تم لوگوں کی باتیں سن کر مجھے اپنے لڑکپن کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے اگر تم لوگ پسند کرو تو تمہیں سناتا ہوں۔ شاید تمہیں میری ہنسی کی وجہ سمجھ آ جائے۔“

”جی چچا جان! ضرور سنا دیے۔“ عمار کے کہنے پر وہ گویا ہوئے۔ ان دنوں ہمارے گاؤں کے کافی لوگ دینی اور مشرقی کے ممالک میں کمانے کی غرض سے جا رہے تھے۔ فوج، پولیس میں بھی ہمارے علاقے کے جوان کافی بھرتی ہوتے تھے۔ ہمارے گھروں سے کچھ فاصلے پر غریب کسانوں اور دراجوں کے گھر تھے۔ ان گھرانوں کے خلیجی ریاستوں میں جانے والے نوجوان جب چھٹی پر گھر آتے تو اکثر ان گھرانوں میں زبردست لڑائی جھگڑا ہوتا تو بہت تھانے کچھری تک جا پہنچتی۔ پھر ہمارے گاؤں کا چوہدری فتح خان ان لوگوں میں صلح کر دیتا۔ دونوں فریق ہی اس کے شکر گزار ہوتے۔

میں اور میرے ہم عمر چوہدری فتح خان کو خدا ترس اور رحم دل انسان سمجھتے تھے۔ ہمارے ابا اور چچا، چوہدری فتح خان کی کبھی تعریف نہ کرتے۔ چچا اکثر کہتے پھرتے، ”نہ جانے یہ لوگ اتنی بھی عقل کیوں نہیں استعمال کرتے کہ ان کے جھگڑے توبہ ہی کیوں ہوتے ہیں، جب ان کے گھر میں دانے (کندم) ہوتے ہیں یا ان کے ہاں ”پاٹر“ کی کمائی کے روپے ہوتے ہیں اور پھر یہ بھی نہیں سوچتے کہ کیا کچھ تھانے پہنچ جاتا ہے۔“

ابا جان کہتے۔ سرور دین! تم خاموش رہو۔ ان لوگوں کو دے الفاظ میں بار بار سمجھا چکا ہوں۔ صاف نہیں کہہ سکتا، بدھریوں کے ساتھ دشمنی پالنا ہمارے بس میں نہیں۔ ہماری سمجھ میں بھی کچھ نہیں آتا تھا لیکن ایک رات کو میں پانی پینے اٹھا تو چٹکی ہوئی چاندنی میں چند گھر چھوڑ کر اپنے گھر کی چھت پر مجھے چوہدری فتح خان کھڑا ہوا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ میں غلیل تھی اور وہ غلیل چلا رہا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے؟ اگلی صبح ایک ہنگامہ پھا تھا۔ موجودہ کار

اور فیروز (مزارغ) کے بیٹے آپس میں جھگڑ گئے تھے۔ ان کی مائیں، بہنیں زبانی گولہ بارود، مغلفات کی صورت ایک دوسرے پر برسرِ آہ تھیں۔

موجود کے بیٹے پر الزام لگا کہ فیروز کا بیٹا زمان اس کی بہن پر بڑی نظر رکھتا ہے۔ اسے اشارے کرتا ہے، کنکر پھینکتا ہے تو دوسری طرف زمان یہی الزام صابر پر لگا رہا تھا اور کہہ رہا تھا، ”میں تو تم لوگوں پر قہر لگاتا بھی نہیں، تم اور تمہاری بہن میری شادی کی کمائی کے دیوانے ہو۔“

حسب معمول چوہدری فتح خان نے ہی صلح کرائی کیونکہ زمان اور صابر نے ایک دوسرے کو گھونٹوں اور لاشیوں سے مارا تھا اور ایک دوسرے کو لبوہاں کر دیا تھا۔ اب پولیس پکڑ کر لے گئی تھی۔

تھانیدار نے کہا! اب معاملہ بڑے تھانیدار اور ڈاکٹر کے پاس چلا گیا ہے۔ سب کو راضی کرنا پڑے گا۔ بڑے تھانیدار کو ہونے کی کوئی چیز دو، ڈاکٹر کے لیے پیسے اور ہمارا بھی خیال رکھنا۔“ شادی کے لیے لائے گئے زیورات میں سے ایک جوڑی جھینکے اور ۱۰ ہزار روپے دیے تب جان بچی۔

ابا نے ٹھنڈی سراس لی۔ ”اونیک بخت! ہونے کے جھینکے تو مجھے یقین ہے کہ چوہدری فتح خان کے گھر ہی گئے ہوں گے۔ تھانیدار کا حکمانہ امتحان ہونے والا ہے اور چوہدری فتح خان کا بڑا سالا یہ امتحان لے گا۔“

مجھے پوری کہانی سمجھ آ گئی اور میں حیران ہوتا رہا کہ زمان اور صابر کی عقل میں یہ بات کیوں نہ آئی۔

عمار پتر! ہم پاکستانی بلکہ سب مسلمان اچھے خاصے سمجھ دار ہو کر بھی ”چچا سام“ کی ”غلیل“ سے انجان کیوں ہیں؟ کب ہماری سمجھ میں آئے گا اور کب ہم ایک دوسرے سے لڑنا بند کریں گے، کب ہماری خون پسینے کی کمائی، ہمارے گھروں میں خرچ ہوگی اور ”چچا سام“ کی تجوروں میں اس کی منتقلی رک جائے گی۔

.....0.....

مصنفہ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے بی۔ اے کیا اور آج کل کراچی میں رہائش پذیر ہیں۔

باتیں دانش کی

علی عباس قادر

کہا عبد القادر جیلانی نے!

- ۱۔ ست آدمی ہمیشہ ناکام رہتا ہے اور ندامت اس کے گلے کا بار ہوتی ہے۔
- ۲۔ حسن خلق یہ ہے کہ تم پر جفا کے خلق کا اثر نہ ہو۔
- ۳۔ تیرے سب سے خطرناک دشمن تیرے برے ہم نشین ہیں۔
- ۴۔ دنیا کے سمندر سے بے خوف نہ رہ! اس میں بہت سے لوگ غرق ہو چکے۔
- ۵۔ بدگمانی تمام فائدوں کو بند کر دیتی ہے۔
- ۶۔ جس نے مخلوق سے کچھ مانگا وہ خالق کے دروازوں سے اندھا ہے۔
- ۷۔ خالق کے قریب ہونا چاہتا ہے تو مخلوق پر شفقت کر۔
- ۸۔ تو اپنے نفس کی خواہش پوری کرنے میں مصروف ہے اور تیرا نفس تجھے برباد کرنے میں۔
- ۹۔ مصیبتوں کو چھپا، قرب حق نصیب ہوگا۔
- ۱۰۔ بہترین عمل دوسروں کو دینا ہے نہ کہ دوسروں سے لینا ہے۔

عبد القادر جیلانی کم رمضان ۵۷۰ ہجری کو ایران کے ضلع جیلان میں پیدا ہوئے۔ برصغیر پاک و ہند میں ”غوث الاعظم“ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ ایک مذہبی شخصیت، استاد اور مبلغ تھے۔ بچپن میں اپنے آبائی گاؤں میں رہے اور ۱۸ سال کی عمر میں بغداد چلے آئے۔ وہاں ابوالکزی سے فقہ کی تعلیم پائی۔ اپنی تعلیم مکمل ہونے پر انھوں نے بغداد چھوڑ دیا۔ آپ کی تبلیغ پر بہت سارے لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ ان کی دو کتابیں ”غنیات الطالبین“ اور ”فتوح الغیب“ امت میں بہت مشہور ہوئیں۔ ۹۱ سال کی عمر میں ۵۶۱ ہجری میں وفات پائی۔ مقبرہ بغداد میں ہے۔ آپ کی چار بیویاں اور ۳۹ بچے تھے جن میں سے ۲۷ بیٹے اور ۲۹ بیٹیاں تھیں۔ بیٹے اور پوتوں نے آپ کی نگرانی میں برصغیر تک تبلیغ کی۔ آپ کا شجرہ نسب آل محمد ﷺ تک جاتا ہے۔ جب آپ پیدا ہوئے تو آپ کی والدہ کی عمر ۶۰ برس تھی۔ پیدائش سے بہت پہلے حضرت جنید بغدادی نے آپ سے متعلق پیشین گوئی کی تھی کہ جیلان میں پانچویں ہجری کے آواخر میں ایک بچہ پیدا ہوگا جس کا نام عبد القادر ہوگا اور وہ اولیائے کرام میں اعلیٰ درجے کا مقام رکھے ہوگا۔



کہا ابو علی سینا نے!



اُدھار لینا ذلت کی ایک قسم ہے۔

یہاں کوئی بھی ناقابل علاج بیماری نہیں سوائے خواہش نفس کے۔

زندگی کی وسعت اس کے دورانیے (عمر) سے زیادہ اہم ہے۔

کسی کے بارے میں اپنے دل میں بُرا گمان مت رکھو، ورنہ بدلے میں وہ بھی اپنے دل

میں نفرت ہی رکھے گا۔

بے تحاشا دولت یا بے پناہ غربت، دونوں انسان کو تباہی کی طرف لے جاتی ہیں۔

کسی بھی چیز سے متعلق علم اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک یہ نہ جان لیا جائے کہ اس

کے وجود کی وجہ کیا ہے۔

اپنے دل میں کسی کے لیے رنجیدگی یا ناراضی مت رکھو۔

بوعلی سینا، ابن سینا کے نام سے جانے جاتے ہیں۔ ایک فارسی سکالر تھے۔ انھوں نے ۲ سو سے اوپر

مقالے لکھے جن میں سے ۱۵۰ فلسفے پر مشتمل جب کہ ۳۰ مقالے ادویات سے متعلق ہیں۔ سب سے

مشہور کتاب ”القانون فی الطب“ کئی میڈیکل یونیورسٹیوں میں پڑھائی جاتی ہے۔ انھوں نے فلسفہ،

فلکیات، کیمیا، نفسیات، اسلامیات، ریاضیات اور طبیعیات پر لکھا اور شاعری بھی کی۔ ابن سینا ۹۸۰ء میں

ہر جان کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں آپ کی ملاقات اپنے ہم عصر ابو ریحان البیرونی سے ہوئی۔ فلسفہ

سے متعلق ان کی کتاب ”کتاب الشفاء“ بہت مشہور ہوئی۔ موسیقی کے میدان میں فارابی کے کام کو وسیع

کیا۔ ۱۸ جون ۱۰۳۷ء میں وفات پائی۔ بخارا کا حاکم جب بیمار ہوا تو ابن سینا نے ۱۷ سال کی عمر میں

ان کا کامیاب علاج کیا۔ اس پر خوش ہو کے حاکم نے انھیں شاہی حکیم کا منصب عطا کیا۔

شکر کا جزبہ



شکر گزاری پر خدا اور زیادہ نوازتا ہے

شکر کا جذبہ بھی کتنا خوبصورت

ہے۔ اگر انسان اس سے متصف ہے تو وہ خدا کے تھوڑے دیے پہ بھی مطمئن ہے اور یہ جذبہ مفقود ہے تو وہ دنیا کی سب نعمتیں پا کر بھی ناخوش! اللہ نے انسان کو بیش بہا نعمتیں عطا کی ہیں۔ ان سب کا شکر فرض ہے اور قرض بھی۔ اور بلا شک وریب، خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا نہ ہی شمار کیا جاسکتا ہے نہ ہی شکر کا حق ادا ہو سکتا ہے۔ ساری عمر جدے میں رہ کر بھی کسی ایک نعمت کے شکر کا حق ادا کرنا ممکن نہیں۔ کچھ

لوگ بہت ناشکرے ہوتے ہیں وہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کی قدر نہیں کرتے بلکہ الٹا شکوہ کنناں رہتے ہیں کہ انہیں اس دنیا میں کچھ نہیں ملا۔ اگر غور کریں تو حضرت انسان کو اس پاک ذات نے بلا مانگے بے شمار نعمتوں سے نوازا ہے۔ سب سے بڑی نعمت جو زندہ رہنے کے لیے انتہائی اہم ہے اور جس کے بغیر زندگی کا تصور بھی ناممکن ہے، وہ ہے ہوا! اگر شاید ہی کبھی ہم نے اس کے متعلق غور و فکر کیا ہو۔ اسی طرح خدا کی دی ہوئی ان گنت نعمتیں ہیں! شکر ادا کرنے میں بخل سے ہرگز کام نہیں لینا چاہیے۔ وہ ذات شکر پہ خوش ہوتی اور مزید نوازی ہے!

انسان پر جب بھی رنج و غم یا کوئی مصیبت آئے تو وہ اس وقت بھی ناشکرے پن کا اظہار کرتا ہے۔ اسے کوئی کامیابی ملے یا نعمت یا پھر بھی مصائب و آلام کی زندگی میں شامل ہو جائے تو اُسے یقین رکھنا چاہیے کہ

میبانی اور ناکامی کا رشتہ کسی بالاتر ہستی کے ہاتھ میں ہے۔ جب کامیابی ملے تو فخر و غرور سے دور رہے اور ناشکر ادا کرے۔

نبی ﷺ کی زندگی میں ہمیں شکر کے حوالہ سے بھی ملتی ملتی ہے۔ آپ ﷺ کی سیرت شکر و سپاس سے بھرپور ہے۔ آپ ﷺ کو زندگی میں بہت مایامیاں ملیں جو کسی اور کے نصیب میں نہیں آئیں لیکن آپ ﷺ کے دل میں فخر و غرور نے مقام نہیں کیا۔ حضرت ﷺ کثرت سے عبادت اور تسبیح و تہلیل کیا کرتے تھے، بعض صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مانے آپ ﷺ کو بے گناہ اور معصوم بنا دیا ہے، اب آپ ﷺ کیوں یہ زحمت اٹھاتے ہیں؟ ارشاد ہوا: ”کیا خدا کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟“

دنیا میں عام طور پر جن لوگوں کو کامیابی ملتی ہے، وہ اپنے زور بازو، اپنے حسن تدبیر اور اپنے ذاتی رعب و ہیکل کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ لیکن خدا کے خاص سے ہر کامیابی اور خوشی کو قادر مطلق کی دین سمجھتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے پاس جب ان خوشی کی خبر آتی تو خدا تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ ﷺ فوراً سجدہ میں گر جاتے۔ قبیلہ ہمدان کے اسلام لانے کی خبر جب آپ ﷺ کو پہنچی تو آپ ﷺ نے سجدہ کر دیا۔ اکیا۔ وحی کے ذریعے جب آپ ﷺ کو پتا چلا کہ جو درود بھیجے گا اس پر اللہ درود بھیجے گا تو اس رفیع منزلت آپ ﷺ نے سجدہ شکر ادا کیا۔

حضرت سعدؓ بیان کرتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت ﷺ کے ساتھ مکہ سے مدینہ سفر کر رہے تھے جب مقام زورحہ کے قریب پہنچے تو سواری سے اتر کر ہاتھ اٹھ کر دیر تک بارگاہِ انبی میں دعا کی۔ پھر وہاں سے اتر کر دیر تک اسی حالت میں پڑے رہے۔ پھر اٹھ کر بدستور دعا کے لیے ہاتھ پھیلانے اور پھر رکعت سجدہ میں رہے۔ پھر اٹھ کر دعا شروع کی۔ اس دعا کے بعد سے فارغ ہو کر آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا

”میں نے اپنی امت کی مغفرت کے لیے خدا سے دعا مانگی تھی جس کا ایک حصہ قبول ہوا۔ میں شکر کے لیے سجدہ میں گرا پھر مزید درخواست کی اللہ نے وہ بھی قبول کی۔ میں سجدہ شکر بجالایا۔“

اس سے ثابت ہوا کہ اللہ کی ذات شکر کرنے پر مزید نوازتی ہے۔ دنیا کی روایت ہے کہ جب فاتح، مفتوح شہروں میں داخل ہوتے ہیں تو ان کے سر فخر و غرور سے بلند ہوتے ہیں۔ لیکن مکہ و خیبر کا فاتح اس وقت بھی سر نیاز بارگاہِ ایزدی میں جھکا کر شہروں میں داخل ہوا۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ جب آنحضرت ﷺ ذی طویٰ میں پہنچے اور دیکھا کہ خدا نے آپ ﷺ کو فتح عطا کی ہے تو آپ ﷺ نے اپنی سواری پر توقف کیا تاکہ اپنا سر خدا کے سامنے جھکا لیں۔

ایک بار حضرت حسینؑ نے کسی کو بچے کی پیدائش پر مبارک باد دینے کا طریقہ سکھاتے ہوئے فرمایا کہ یوں کہا کرو: ”خدا تمہیں اپنے اس عطیہ میں خیر و برکت دے، اپنی شکر گزاری کی تمہیں توفیق بخشے، بچے کو جوانی کی بہاریں دکھائے اور اس کو تمہارا فرمانبردار بنائے۔“ شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ بندہ اپنی زبان سے اللہ کی تسبیح و تہلیل کر کے شکر ادا کرے۔ دوسرا طریقہ یہ کہ اپنے اعمال سے اس ذات کریمی کے احسانات کا شکر ادا کرے۔ خدا نے جو نعمتیں انسان کو عطا کی ہیں ان میں خدا کے بندوں کو بھی شریک کرے۔ کسی کو خدا نے متمول بنایا ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ کر کے اس نعمت کا شکر ادا کرے۔ خدا کی راہ میں دیتے ہوئے وہ فخر و غرور سے دور رہے اور نمود و نمائش اور دکھاوے کے لیے نہ دے بلکہ خالص اللہ کی رضا کے لیے دے۔ شکر کا جذبہ انسان کو بہت کچھ دیتا ہے۔ اگر یہ جذبہ دلوں میں موجود نہیں تو وہ دل بھلانے کے مستحق نہیں۔ کیوں کہ شکر کے جذبات سے کشادہ دلی پیدا ہوتی ہے۔ تنگ دلی، کڑھن، مایوسی کی کیفیت سے نجات ملتی ہے۔

دنیا کی سب سے زہریلی مچھلی

جسے پکانے کے لیے شیف کا لائسنس یافتہ ہونا لازمی ہے

ہمیشہ خصوصی چاقوؤں کے ذریعے نوگو (Fugu) تیار کرتا ہے۔ یہ چاقو روزانہ تیز کرائے جاتے ہیں تاکہ ان کی کاٹ زبردست رہے۔ کوئیو گڈشتہ ۶۰ برس سے نوگو تیار کر رہا ہے لیکن اب بھی بہت احتیاط کرتا ہے۔ وہ یہی ہے کہ ایک معمولی سی غلطی بھی گامک موت کے منہ میں پہنچا سکتی ہے۔ نوگو جاپان کی ایک خاص ڈش ہے جو دھوک (Blow) مچھلی سے تیار کی جاتی ہے۔ اسے معمولی مچھلی نہ سمجھیے، یہ دنیا کی سب سے زہریلی مچھلی ہے۔ لیکن اسی خطرناک حیوان کو جاپانی مزے لے لے کر کھاتے ہیں بلکہ اس سے بنی ڈش دنیا کی مہنگی ترین ڈشوں میں شمار ہوتی ہے۔ ایک نوگو پلیٹ کی قیمت ۱۲۰ ڈالر ہے۔ پاکستانی کرسی میں یہ قیمت تقریباً بارہ ہزار روپے بنتی ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مہنگی ہونے کے باوجود جاپانی

کوئیو مورا کے ریسٹوران باقاعدہ وقت لے کر نوگو کھانے آتے ہیں۔ دراصل دیوار پر لٹکا کوئیو کا لائسنس انہیں تقویت بخشتا ہے۔ جاپان میں صرف لائسنس یافتہ باورچی ہی نوگو تیار کر سکتا ہے۔ کوئیو زندہ مچھلی کاٹ کر پکائی کا آغاز کرتا ہے۔ ریسٹوران کے ٹینک میں ہر وقت ۵۰، ۶۰ دھوک مچھلیاں تیرتی رہتی ہیں۔ جب کوئی آرڈر آئے تو کوئیو مچھلی ٹینک سے نکال کر اس سے دودھ ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ دھوک مچھلی کے اعضا خصوصاً جگر، جلد اور بیضہ دانتوں میں "ٹیزروڈ ٹوکسین" (Tetrodotoxin) نامی زہر پالا جاتا ہے۔ ماہرین کے مطابق یہ سائنائڈ (Cyanide) سے ۴۰۰ گنا زیادہ طاقتور زہر ہے۔ جب دھوک مچھلی زہریلی نباتات کھائے تو اس میں یہ زہر جنم لیتا ہے۔ نوگو تیار کرتے ہوئے کوئیو پہلے مچھلی کا سر علیحدہ کرتا ہے۔ پھر بڑی احتیاط سے جلد، جگر اور بیضہ دانتوں کو نکال

زہریلے کھانے

دھوک مچھلی کے علاوہ بھی بعض غذائیں زہریلے اثرات رکھتی ہیں۔ ان کا مختصر تعارف پیش خدمت ہے:

کھمبیاں

کھمبیوں کی بعض اقسام زہریلی ہوتی ہیں۔ ان میں سب سے خطرناک امابتا فالوئیس (Amanita Phalloides) ہے۔ یہ کھمبیوں کا ایک خاندان ہے جو عرف عام میں دھوک کپ (Death Cap) کہلاتا ہے اگر کوئی یہ کھمبیاں زیادہ مقدار میں کھالے تو مر بھی سکتا ہے۔

ریوند چینی

اس پودے کی ڈنڈیاں چینی بنانے میں مستعمل ہیں۔ نیز جڑیں قبض کشا اور مقوی ادویہ میں استعمال ہوتی ہیں۔ تاہم اس کے پتے زہریلے ہوتے ہیں لہذا انہیں استعمال نہیں کیا جاتا۔ کوئی انسان غلطی سے پتے بڑی مقدار میں کھالے تو موت کے گھاٹ اترنے میں دیر نہیں لگتی۔

مونگ پھلیاں

یہ بظاہر بے ضرر میوہ ان انسانوں کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتا ہے جو میووں سے الرجی رکھتے ہیں۔

آلو

بعض آلوؤں میں بڑھ چا جاتا ہے۔ یہ حصہ کبھی نہ پکائیے کیونکہ اس میں گلائکو الکلائڈز (Glycoalkaloids) نامی زہر پایا جاتا ہے۔ یہ حصہ کاٹ کر پھینک دیجئے۔ اسے چٹ کرنے سے صحت کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔

ہے۔ کئی جاپانی جگر بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ لہذا یہ فطرتاً ہی دیکھ بھال سے زہر سے پاک کیا جاتا ہے۔ ٹیزروڈ ٹوکسین کھانا پکانے کے دوران تلف نہیں ہوتا۔ جب اس کی معمولی سی مقدار بھی جسم کے اندر پہنچے تو وہ انسان کو مکمل طور پر مفلوج کر دیتا ہے۔ اس کیفیت میں انسان مائیں نہیں لے پاتا، چنانچہ چند ہی منٹ میں وہ عالم بالا پہنچ جاتا ہے۔ اذیت ناک بات یہ ہے کہ مفلوج حالت میں رستہ دم تک انسان ہوش و حواس میں رہتا ہے۔ ۲۰۰۰ء سے اب تک جاپان میں نوگو کھانے سے ۱۲ افراد جان بحق ہو چکے۔ تاہم ان میں کوئی بھی ریسٹوران میں ہلاک نہیں ہوا۔ یہ سبھی مائی گیر تھے۔ انہوں نے جب گھر میں مچھلی پکا کر کھائی تو نا تجربہ کاری کے باعث زہر بھی چڑھا گئے۔ یوں موت ان کا مقدر بن گئی۔ مچھلی کا چھوٹا سا ٹکڑا بھی انسان کو عالم بالا میں پہنچانے کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے دھوک مائی تیار کرنے والے شیف یا باورچی خود کو عام باورچیوں سے

بلند مرتبہ یا طبقہ ایلیٹ میں شامل سمجھتے ہیں۔ ایسا سمجھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ دھوک مچھلی پکانے کا عمل بڑی محنت و دیانت سے دیکھتے ہیں۔ اب کوئیو ہی کو سمجھئے۔ وہ ۱۵ سال کی عمر میں بحیثیت اپرنٹس دھوک مچھلی تیار کرنے والے شیف کے ساتھ کام سیکھنے لگا۔ یہ تربیت دو سال جاری رہی۔ تاہم ۲۰ سال کا ہو کر بالغ ہوا تو اس نے لائسنس حاصل کرنے کی خاطر امتحان دیا۔ (جاپان میں بالغ ہونے کی عمر ۲۰ سال ہے)۔ دلچسپ بات یہ کہ تمام تربیت یافتہ شیف زندہ دھوک مچھلی صاف کر کے پکاتے ہیں۔ لیکن ٹوکیو کے بعض ریسٹوران چاہتے ہیں کہ وہ تیار شدہ دھوک مچھلی فروخت کرنے لگیں۔ مگر تربیت یافتہ شیف اس اقدام کے مخالف ہیں۔ انہیں خطرہ ہے کہ یوں غیر لائسنس یافتہ باورچی بھی مچھلی تیار کر سکتے ہیں۔ جب ان کے کاروبار کو زک پہنچے گی۔ آخر وہ تقریباً "۱۰۰" مچھلیاں کاٹ کر دھوک مچھلی کا ٹنا سیکھتے ہیں اور ان سب کی قیمت وہی ادا کرتے ہیں۔ ■



سال کا سورج بے شمار نئی خواہشات اور
خوابوں کی کرنیں لیے طلوع ہو
چکا ہے۔ وہ سارے خواب جو کئی
دہائیوں سے اُصوڑے چلے آ رہے کیا ان کی تکمیل کا آغاز
ہو پائے گا.....؟؟؟

ظہیر کا شیریں جیسے امیدوں کے جہان بسانے والے
تو برسوں پہلے کہہ گئے تھے کہ.....

ہمیں خبر ہے کہ ہم ہیں چراغِ آخر شب
ہمارے بعد اندھیرا نہیں اُجالا ہے
خود کو چراغِ آخر شب سے تعبیر کرنے والے
ظہیر کا شیریں اور اُن کی نسل کے پر امید لوگوں کو یہ انداز
ہی نہیں تھا کہ آخر شب کے لمحات جو عموماً جلد گزر جایا
کرتے ہیں ہمارے رہنماؤں کی نااہلی، بددیانتی اور
بدنیتی کے باعث انتہائی طویل ہو جائیں گے۔ اتنے
طویل کہ برسوں نہیں دہائیاں ہو گئیں اور آخر شب کی یہ
تاریکی جتنے ہی میں نہیں آ رہی..... خلعت ختم ہونے کا
نام ہی نہیں لے رہی..... دن ہے کہ نکلنے ہی پہ نہیں
آ رہا..... اجالا ہے کہ اپنے رُخ انور کا درشن کرانے ہی
پہ تیار نہیں ہے۔

کوئی تاریکی سی تاریکی ہے جو پاکستان کو اپنی لپیٹ
میں لیے ہوئے ہے..... کوئی ناامیدی سی ناامیدی ہے جس
نے میرے وطن کو اپنی ہانہوں میں جکڑ رکھا ہے..... کوئی
مایوسی سی مایوسی ہے جس نے میری دھرتی پہ پڑ پھیلانے
ہوئے ہیں.....!

کرپشن بددیانتی، بد امنی، اغواء برائے تاوان ہر قسم
کی انتہا پسندی، جھوٹ، فریب، فراڈ، دھوکہ دہی، موروٹی
سیاست، چور بازاری، قتل، ڈاکے، چوریاں..... یقیناً
۲۰۱۲ء اہل وطن کو بے شمار دکھ دے کر گزرا لیکن جیسے یہ
سال اپنی تمام تر آفات اور مصائب کے ساتھ بالآخر ختم ہو
ئی گیا..... جیسے تیسے کر کے ہی سہی مگر نئے سال کا سورج
طلوع ہو ہی گیا۔ جسے ۳۱ دسمبر کی شام کے سورج کی گود
میں پچھلے سال نے اپنی تمام تر تلخیوں سمیت دم توڑا اور نئی

اُردو فورم کے ساتھ ساتھ اس مریہ کو بھی جلوہ میں ڈالیں تو ضرور اس کا ذائقہ اور بھی شاندار ہو جائے گا



عمران ہیل ہوئی کی
مسکراتی
لکیریں



رحمان ملک! گھبرانا نہیں! جن بابا اپنا ہی ہے

گجروں کے چاہنے والے تو اب فلمیں دیکھنے آتے نہیں
ینگ ڈاکٹروں پہ فلم بناؤ۔ ان کی روز روز کی برہکوں اور
ہڑتالوں سے تنگ آتی مخلوق شاید فلمیں دیکھنے ہی آجائے۔



اب تو ڈرون حملے بند کرادو۔
ہم نے بندے مارنے کا خود ہی نیار یکاڑ قائم کر لیا



امیدوں کے ساتھ ۲۰۱۳ء نئے سورج کی انگلی تھامے طلوع
ہوا، ایسے ہی امید رکھنی چاہیے کہ امیدوں کے چراغ ان شاء اللہ
ضرور روشن ہوں گے۔

اک ذرا صبر کہ اب جبر کے دن تھوڑے ہیں
اور صبر کرنے والوں کے ساتھ تو اللہ بھی ہوا کرتا
ہے۔ مگر یقیناً ان صبر کرنے والوں کے ساتھ کہ جو جبر سے
لڑائی کے دوران اٹھنے والی مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں۔ جبر
کے آگے زیر ہو کر ہاتھ پر ہاتھ دھر کے بیٹھ جانے والے
صابر نہیں بزدل کہلائیں گے۔

دنیا میں قاتل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا
مانا کہ پاکستان میں مایوسیوں کی ہزار وجوہات ہیں۔
دل چھوٹا کرنے کے، پاکستان سے مایوس ہونے کے
لا تعداد اسباب ہیں۔ مگر امید کے بھی تو کتنے دیے روشن
ہیں امید کے یہ چراغ مدد سہی مگر روشن تو ہیں۔
یہی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

اُردو ڈائجسٹ
کا مقبول سلسلہ

مشورہ حاضرہ



آپ بھی ان مشوروں کا حصہ بن سکتے ہیں، بڑے بڑے مسائل کے چھوٹے چھوٹے حل اکثر زندگی آسان کر دیتے ہیں

صغیرہ بانو شیریں

بھتی روڑے لکھتی ہیں۔ جوڑوں کے درد کے لیے اپنا آزمودہ نسخہ لکھ رہی ہوں۔ جو بے حد کارآمد ہے۔ اس میں چار دوائیں ہیں۔ اسکند، سورجنان، اسپند، خولجان، ہرودا ۲۳ گرام یعنی ہے اور پھر ان کو صاف کر کے پیس، چھان لیں۔ صبح شام ۴ گرام پانی کے ساتھ کھائیں۔ کھٹی چیزوں سے پرہیز کریں، تین ماہ کھانے سے تکلیف دور ہو جائے گی۔

صنوبر بہن کا شکریہ، زمانہ قدیم سے اسکند اور سورجنان کو جوڑوں کی تکالیف میں مختلف ادویہ کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ اس کے مابعد اثرات بھی نہیں۔ دوسرا یہ کہ اس کی خوراک بھی زیادہ نہیں۔ اسے استعمال کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ آپ بے فکر ہو کر لے سکتے ہیں جو لوگ یہ نسخہ استعمال کریں۔ وہ مجھے ضرور بعد میں مطلع کریں۔

کوڑمتمہ

کوڑمتمہ کہاں ملتا ہے اور اس کی کیا پہچان ہے؟ مجھے اس کے بارے میں بتائیے تاکہ میں خرید کر استعمال کر

قد کیسے بڑھ سکتا ہے؟

میری عمر ۲۰ سال ۵ ماہ ہے۔ میری خواہش ہے کہ میرا قد ۶ فٹ ہو جائے۔ اس سلسلے میں آپ بتائیں میرا قد ۵ فٹ ۷ انچ ہے۔ دوسرا مسئلہ یہ کہ میری کلائیائیں بہت کمزور ہیں۔ یہ کیسے مضبوط ہو سکتی ہیں؟ (محمد خیام حیدر۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ)

بیٹا جی! آپ کا قد مناسب ہے۔ ہو سکتا ہے قدرتی طور پر تھوڑا سا بڑھ جائے۔ اپنی غذا کا خیال رکھیے، پھل، دودھ، بادام استعمال کریں۔ جم (Gym) جا کر آپ کلائیوں کے لیے ورزش کر سکتے ہیں۔ کلائیائیں مضبوط ہو جائیں گی۔ زیتون کے تیل کا روزانہ مساج کرنے سے بھی فرق پڑتا ہے۔

جوڑوں کا درد

ہماری قاریہ بہن محترمہ صنوبر، راولپنڈی چھاؤنی عزیز

وہ کروڑوں نوجوان ہیں جو اپنے بزرگوں کی غلطیاں دہرائیں نہیں چاہتے جو تہذیبی کی خواہش رکھتے ہیں، جو موروٹی سیاست سے نفرت کرتے ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جس میں چار موسم ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جو دنیا کا بہترین کینو، چاول، کپاس اور جانے کیا کیا کچھ پیدا کرتا ہے۔ یہ وہی ملک ہے جس کے پہاڑوں کو قدرت نے سونے اور تانبے جیسے بے شمار ذخائر سے مالا مال کر رکھا ہے یہ وہی ملک ہے کہ اگر صرف اپنے کوئلے کو ہی صحیح طریقے سے استعمال میں لائے تو اپنی روشنیاں جگمگاائیں کہ اس ملک میں اندر سے کا تصور تک باقی نہ رہے۔ یہ وہی ملک ہے جس میں صحرا بھی ہیں، پہاڑ بھی، سمندر بھی، دریا بھی، ندی نالے بھی، گلیشیر بھی، جھرنے بھی، چشمے بھی، کے ٹو بھی، گوادر بھی۔ اس ملک کی صفیتیں گونا گونا شروع کروں تو کالم کے کالم بھر جائیں مگر اس دھرتی ماں کو عطا ہونے والی نعمتیں بیان نہ کر پاؤں۔ حکیم سعید کی ایک بات پر جو سو باتوں کی ایک بات ہے کالم کا اختتام کرتا ہوں مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ.....

پاکستان مثل سورہ رحمن
کہ سورہ رحمن میں جتنی نعمتوں کا ذکر ہے وہ تمام کی تمام پاکستان میں موجود ہیں۔ سچی بات ہے جب میں اپنی دھرتی ماں پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے قرآن کی ایک اور آیت یاد آتی ہے جس کا مفہوم کچھ یوں ہے..... کہ تم اللہ کی نعمتوں کا شاعر نہیں کر سکتے..... پاکستان کو بھی جو نعمتیں میرے مالک نے عطا کی ہیں ان کا شمار ممکن نہیں ہے۔ آئیے اس نئے سال میں ان نعمتوں کے ذریعے اس ملک اور اس ملک کے لوگوں کی تقدیر بدلنے کی کوشش کریں۔ تمام قارئین کو نیا سال مبارک ہو.....

(بکریہ پی بات)

آپ مجھ سے رابطہ کر سکتے ہیں۔

www.facebook.com/wasishahpoet

ان امیدوں سے بھرے چرائیوں کی تہ میں ابھرنے ڈال کر ان کی روشنی تیز کرنے کی ضرورت ہے ایسی روشنی جس سے تاریکیاں چھٹ جائیں اور پاکستان واپس منور ہو جائے جیسے ڈاکٹر اقبال و محمد علی جناح کی خواہش تھی۔ جس کی روشنی کی خاطر ہمارے بزرگوں نے اپنے لبو کا تیل پاکستان کے قدموں میں نچھاور کر دیا تھا۔

اگرچہ ناکامیوں کی ایک طویل فہرست اور تاریخ ہے پھر بھی مایوس ہونے کی ضرورت نہیں کہ یہ پاکستان ہی ہے جس کے بارے میں دشمنوں کا خیال تھا کہ یہ تین ماہ سے زیادہ نہیں چل پائے گا مگر تمام تر بے سروسامانی کے باوجود پاکستان اپنے پیروں پر کھڑا ہوا۔ یہ وہی ملک ہے جس نے کسی باقاعدہ سسٹم یا ادارہ جاتی نظام کے بغیر جہانگیر، جان شیر، عمران، میا نداد، محمد یوسف، حسن سردار، مسیح اللہ جیسے کھلاڑی پیدا کیے۔ یہ وہی ملک ہے کہ آغاز میں جس کے بنائے منصوبوں کو مختلف ممالک نے فالو کیا۔ یہ وہی ملک ہے جس نے نوبل انعام حاصل کرنے والے سائنسدان پیدا کیے۔ یہ وہی ملک ہے جہاں فیض جیسا شاعر اور نصرت فتح علی خان جیسا گانیک جنم لیتا ہے۔ یہ صادقین اور شا کر علی کا ملک ہے۔ یہ وہی ملک ہے جو دنیا کے ان آٹھ دس ممالک میں شامل ہے جو ایسی طاقت کہلاتے ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جہاں ارفع کریم جیسی بیٹیاں جنم لیتی ہیں۔ یہ وہی ملک ہے جہاں سرکاری سرپرستی نہ ہونے کے باوجود اپنی مدد آپ کے تحت کینسر ہسپتال جیسے کئی فلاحی ادارے بنائے اور چلائے جاتے ہیں یہ وہی ملک ہے جو آج دنیا کی بہترین ایئر لائنز چلانے والوں کو تربیت دیتا تھا انہیں سکھاتا تھا۔ یہ وہی ملک ہے جہاں عوام نے آمریت کو کم سے کم چار مرتبہ تخت مقابلے کے بعد اپنے جوتے چائے پر بھجور کیا۔ آمر آیا تو ضرور مگر بالآخر اسے جانا پڑا۔ اس ملک کی طاقت اس کے اٹھارہ کروڑ سے زائد عوام ہیں۔ اس ملک کی طاقت

سکوں۔
اسے حنظل بھی کہتے ہیں۔ چھوٹے خربوزے کی طرح
دھاری دار ہوتا ہے۔ یہ سخت کڑوا ہوتا ہے اسی لیے کوڑتہ
کہتے ہیں۔ مزے کی بات یہ کہ جتنا کڑوا ہے اتنا ہی فوائد
سے بھرپور۔ پسناری کے ہاں بوریوں میں خشک پھل مل
جاتے ہیں۔ پنجاب میں تو تازے تھے بھی اکثر بھری فروش
کے پاس نظر آتے ہیں اور خشک تو آپ تمام سال خرید سکتے
ہیں۔ تہہ والی اجوان گاؤں دیہات میں بہت مشہور ہے
سب لوگ اسے پہچانتے ہیں اور استعمال کرتے ہیں۔

ہونٹ پھٹ جاتے ہیں

جب بھی سردی کا موسم آتا ہے، میرے ہونٹ خشک
ہونے لگتے ہیں اور پھٹ جاتے ہیں۔ ان میں سے خون
نکلتے لگتا ہے۔ سارا چہرہ بد وضع ہو جاتا ہے۔ اس کے
بارے میں ضرور مشورہ دیجیے۔ میں بہت پریشان ہوں۔

(افشاں حیدر)
آپ ہونٹوں پر دودھ کی بالائی صبح شام لگائیں۔
ہونٹ پھٹنے لگیں تو سیب کے بیج دس بارہ لے کر اسے
باریک چیں کر ہونٹوں پر لگا کر سو جائیں اور رات کو سوتے
وقت ناف میں تھوڑا سا تیل روز لگائیں۔ اس سے بھی
ہونٹ نہیں پھٹتے۔ نرم ملائم رہتے ہیں۔ کچھ خواتین گہرے
رنگ کی لپ اسٹک ہونٹوں پر لگاتی ہیں تاکہ ہونٹ نہ
پھٹیں، ناقص قسم کی لپ اسٹک ہونٹوں کو مزید خراب کر
دیتی ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ پٹرولیم جلی، زیتون کا
تیل لگائیں۔ ہونٹ ملائم رہیں گے۔ کچے دودھ کے اوپر
ہلکی سی تہہ جم جاتی ہے اسے اتار کر ہونٹوں پر دن میں تین
بار لگائیے۔ ہونٹ نرم ہو جائیں گے۔

مچھلی

میں ڈپریشن کا مریض ہوں۔ سوچ بچار سے دل کی
دھڑکن بھی بے قابو ہو جاتی ہے۔ ہر وقت سوچتا رہتا ہوں،
ایسا لگتا ہے زندگی میں کچھ نہیں رہا۔ گائے کا گوشت پسند تھا۔

مگر ڈاکٹر اب کہتے ہیں۔ گائے کا گوشت مضر ہے۔ سردی
ہے، آپ مجھے مچھلی کے بارے میں بتائیے کیا یہ میرے لیے
مفید ہے اور اس کے کھانے سے کوئی مسئلہ تو نہیں ہوگا؟
(عبدالحمید۔ اسلام آباد)

مچھلی تو قدرت کی عطا کردہ نعمت ہے۔ اس میں تو
فائدے ہی فائدے ہیں۔ باقی مچھلی کھانے سے کوئی فائدہ
نہیں، نقصان ہی نقصان ہے۔ ہفتہ میں کم از کم دو بار ضرور
مچھلی کھانی چاہیے۔ مچھلی میں فیٹی ایسڈ موجود ہیں جو دل کو
خطرات سے بچاتے ہیں۔ دل کی دھڑکن کو اعتدال پر
لائے ہیں۔ ڈپریشن کو دور کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ دل
اور دماغ کے لیے مچھلی بہت مفید ہے۔ سردی کے موسم میں
تو آپ اس کا ایک بڑا ٹکڑا روزانہ بھی لے سکتے ہیں۔ مچھلی
وٹامن اے اور ڈی کا بھرپور خزانہ ہے اور جب سے یہ دنیا
وجود میں آئی یہ انسانوں کی مرغوب غذا رہی۔
سو گرام کا مچھلی کا ٹکڑا آپ کو غذا بابت فراہم کرتا ہے۔
بلڈ پریشر کو بھی کنٹرول کرتا ہے۔ آپ کی ذہانت کو بڑھاتا
ہے۔ آپ مچھلی ضرور کھائیں فائدہ ہوگا۔

سانس کی بدبو

مجھے کچھ لوگ کہتے ہیں کہ تمہارے سانس میں بدبو
ہے۔ مجھے خود محسوس نہیں ہوتی۔ یہ کیسے پتا چلتا ہے کہ آپ
کے اپنے منہ سے بدبو آ رہی ہے۔ اس کے لیے کوئی دیکھی
نوٹکد بھی بتائیں تاکہ میں استعمال کر سکوں۔

(شہاب)
کہتے تو یہی ہیں۔ کھانے کے ذرات منہ میں رہ
جائیں تو ان کے گلے ٹھرنے سے بدبو آنے لگتی ہے۔ اسی
طرح اگر قبض کی پرانی شکایت ہو۔ منہ میں کوئی تکلیف ہو،
بیناری سے اٹھے ہوں اور کچھ دواؤں کے رد عمل سے بھی
مسئلہ ہو جاتا ہے۔ زبان پر بہت سارا میل جما ہو۔ یا نیوریا
ہو، تب بھی یہی مسئلہ ہوتا ہے۔ کافی وجوہات ہیں۔ جن کی
وجہ سے منہ میں بدبو ہو جاتی ہے۔ نیم، کیکر، مسواک
روزانہ کی جائے تو بہت فرق پڑ جاتا ہے۔ آپ اپنے

دونوں ہاتھوں کو اچھی طرح جوڑ لیں کہ پیالے کی شکل بن
جائے۔ اب اسے اپنے منہ کے قریب لا کر گہرے گہرے
سانس لیں۔ پھر آپ اپنے ہاتھ کو سونگھیں۔ آپ کو پتا چل
جائے گا کہ آپ کے سانس میں بدبو ہے یا نہیں۔

سب سے پہلی بات یہ کہ آپ قبض نہ ہونے دیجیے۔
دوسری بات یہ کہ انجیر کے چند دانے کھانے سے آنتوں
میں جمی غلاظت بھی نکل جاتی ہے۔ انجیر کے بہت فائدے
ہیں۔ تین سے پانچ دانے انجیر قبض کو ختم کرتے ہیں۔
پیٹ میں گیس نہیں بنے دیتے۔ نہار منہ تین دانے کھانے
سے پیٹ میں جو بھی گیس ہوگی وہ ختم ہو جاتی ہے۔
۱۵/۱۵ نیم کے پتے لے کر چل کر پانی میں ملا کر لوگ غرارے
کرتے ہیں اور دو بڑے بچے گلاب کا عرق ایک گلاس
تازے پانی میں ملا کر سوتے وقت ماٹھو واش کی طرح
استعمال کرتے ہیں۔ گلاب کا عرق بھی بدبو زائل کر دیتا
ہے۔ یعنی ہوئی سونف، چھوٹی الائچی کے دانے، دھنیے کی
تھوڑی سی بجھنی ہوئی گرمی ملا کر اس میں تھوڑی سی چینی یا
مصری ملا کر بوتل میں رکھ لیں۔ دن میں دو تین بار تھوڑا
تھوڑا کھائیں۔ اس سے بھی بدبو دور ہو جاتی ہے۔

چہرے کے مسام

میرے چہرے کے مسام بہت بڑے لگتے ہیں۔ ایسا
گھر بیلو ٹمکے بتائیے جس سے یہ بند ہو جائیں اور میرا چہرہ
بھی صاف ہو جائے۔
(نزیہ افتخار، سیالکوٹ)
مجھے ایسا لگتا ہے کہ آپ رات کو چہرہ پر گلی کریم یا میک
اپ صاف نہیں کرتیں۔ میک اپ کرنے کے بعد اسے
رات کو اتار کر سونا چاہیے۔ کھلے مساموں میں آہستہ آہستہ
گرد اور چکنائی جم جاتی ہے اور ان کی صفائی مشکل ہوتی
ہے۔ ایک کپ گرم پانی لے کر اس میں چوتھائی چائے کی
چمچی پسپی ہوئی سفید پھلکوی ملائیں اور اپنا منہ اچھی طرح
دھو کر خشک کر کے روئی کے ساتھ چہرے پر لگا کر صاف
کریں۔ تین چار بار یہ عمل دہرائیں۔ پھلکوی مساموں کو
سکیرتی ہے جب بھی باہر سے آئیں فوراً منہ دھولیا کریں تاکہ

کہ چہرے پر جمی چکنائی ختم ہو جائے۔ اپنے مساموں کا
خود خیال رکھیں۔ ان پر زیادہ ٹائلکم پاؤڈر بھی نہ لگائیں۔
کبھی بھی ۲/۲ چمچے کھیرے کے رس میں ۱۵ بوند کیوں کا رس
ڈال کر چہرے پر لگائیں۔ ۱۵ منٹ بعد منہ دھو کر خشک کر
کے گلاب کا عرق لگائیں۔ کھلے مسام بند ہو جائیں گے۔
ہلکا میک اپ کیجیے۔ زیادہ میک اپ کرنے سے بھی
مسئلہ ہو جاتا ہے۔ اپنے چہرے کو ہوا لگنے دیجیے اور میک
اپ کو جلد سے جلد اتارنے کی کوشش کیجیے۔ اس طرح
آپ کے چہرے کی دلکشی برقرار رہے گی۔

کھانا ہضم نہیں ہوتا

دو تین ماہ سے دوپہر کو کھانا کھاتا ہوں تو مجھے بدضمی کا
احساس ہوتا ہے۔ پیٹ اوپر کی طرف ہوا سے بھر جاتا ہے۔
کبھی دل مٹلاتا ہے، دو تین گھنٹے اسی حال میں گزرتے
ہیں۔ کھانا ہضم ہوتا ہے تو پھر کام کر سکتا ہوں۔ آپ اس
کے لیے کچھ بتا سکتی ہیں۔
(شہباز علی)
چند روز آپ مرغن غذا نہ کھائیے۔ سفید زیرہ پسوا کر
رکھیے اور کالی مرچ بھی۔ ایک پیالہ دہی میں ذرا سناٹک
ڈال لیے۔ سفید زیرہ پیسنے سے پہلے تو بے ہلکا سا فراٹی کرنا
ہے، جلے نہیں، ہلکا براؤن ہو جائے تو اتار کر ٹھیں لیں۔ اب
دہی میں آدھا چائے کا چمچ سفید بھنا ہوا زیرہ ملائیے اور
چوتھائی چمچ پسپی ہوئی کالی مرچ۔ دوپہر کے کھانے کے ساتھ
ایک دو ہفتہ یہی دہی کھائیے۔ روزانہ تازہ دہی بنانا ہے۔ اس
سے کھانا ہضم ہونے میں مدد ملے گی۔ ایک پیچٹا لاکر
رکھیے۔ صرف دو پچائیں کاٹ کر کھانے کے بعد کھائیں۔ یہ
بھی کھانے کو ہضم کرے گا۔ پیچٹا آنتوں میں گیس نہیں
ہونے دیتا اور کھانے کو ہضم کر دیتا ہے۔ بھوک رکھ کر کھانا
کھائیے۔ کھانا کھانے کے بعد ڈٹ کر پانی نہ پیئیں۔ ہاضمہ
کے لیے زیادہ دوائیاں بھی نہیں کھانی چاہئیں۔ بلکہ غذا میں
بھرپور احتیاط کرنی چاہیے۔ گوشتی، ماش کی دال وغیرہ جب
بھی پکوائیں اس میں ڈھیر سارا کاٹا ہوا اورک اور پسا گرم
مسالہ ضرور شامل کر لیا کریں۔

ماہ رواں کی شخصیات

محمد غنیمت

اس معلوماتی سلسلہ کو بہت محنت سے مرتب کیا گیا ہے۔ یہ آپ کے لیے اہم معلومات کا ماخذ ثابت ہوگا

ماہ فروری میں پیدا ہونے والی اہم عالمی و ملکی شخصیات

- ۱۸ فروری ۱۸۹۳ء محمد ہاشم گزدر (سندھ کے ممتاز سیاستدان)
 ۱۹ فروری ۱۹۱۰ء ڈاکٹر جہاگیر خان (مشہور کرکٹر)
 ۱۹ فروری ۱۹۳۳ء عطاء الحق قاسمی (معروف ادیب، شاعر)
 ۲ فروری ۱۹۱۳ء شوکت تھانوی (اردو کے ادیب)
 ۲ فروری ۱۹۵۱ء ڈاکٹر منیف الدین شیخ (استاد و صحافی)
 ۲ فروری ۱۸۸۲ء جیمز جوائس (آئر لینڈ کے ادیب)
 ۳ فروری ۱۹۰۵ء نواب بہادر یار جنگ (تحریک آزادی کے رہنما)
 ۳ فروری ۱۸۲۱ء الازہرہ بلیک ویل (دنیا کی پہلی خاتون ڈاکٹر)
 ۳ فروری ۱۹۳۰ء کسور ناہید (شاعرہ ادیب)
 ۳ فروری ۱۲۳۹ء شہزادی زبیب النساء (مغل شہزادی)
 ۳ فروری ۱۹۰۲ء جلال سنان برگ (امریکی ہواباز)
 ۴ فروری ۱۹۳۳ء ڈاکٹر عابد رضا بیدار (اردو کے نامور محقق)
 ۵ فروری ۱۹۳۷ء ریاض بٹالوی (نامور صحافی)
 ۵ فروری ۱۹۳۰ء محمود شام (صحافی اور شاعر)
 ۵ فروری ۱۹۳۶ء خواجہ رضی حیدر (محقق تذکرہ نگار)
 ۶ فروری ۱۹۳۳ء منو بھائی (ادیب، صحافی)
 ۶ فروری ۱۸۹۳ء سر مظفر اللہ خان (پاکستان کے پہلے وزیر خارجہ)
 ۶ فروری ۱۹۱۱ء رونالڈ ریگن (سابق امریکی صدر)
 ۷ فروری ۱۸۱۲ء چارلس کنز (مشہور برطانوی ادیب)
 ۷ فروری ۱۵۲۸ء میر محمد معصوم شاہ (سندھ کے مشہور عالم، مورخ، ادیب)
- ۷ فروری ۱۸۳۳ء مینڈ لیف (ہیبرڈاک ٹیبل کے موجد)
 ۸ فروری ۱۹۰۳ء نگو عبدالرحمن (ملائیہ کے سابق وزیر اعظم)
 ۸ فروری ۱۹۱۳ء جاسٹس رائٹر (اردو شاعر)
 ۸ فروری ۱۸۹۸ء ڈاکٹر ڈاکٹر کریسن (بھارت کے سابق صدر)
 ۹ فروری ۱۹۰۱ء نیکر نعت عبداللہ ہارون (تحریک پاکستان کی رہنما)
 ۹ فروری ۱۹۳۳ء قاضی عبدالستار (مشہور افسانہ نگار)
 ۹ فروری ۱۸۸۳ء خواجہ دل محمد (شاعر، ریاضی دان، استاد)
 ۱۰ فروری ۱۷۱۲ء شاہ ولی اللہ عالم دین مترجم مشرق و غرب
 ۱۱ فروری ۱۸۳۷ء تھامس ایلیو ایڈیسن (دنیا کا عظیم ترین موجد)
 ۱۱ فروری ۱۸۶۸ء حلیم اجمل خان (طیب اور مصلح)
 ۱۱ فروری ۱۹۲۰ء شاہ فاروق اول (مصر کے آخری بادشاہ)
 ۱۲ فروری ۱۸۰۹ء ابراہام لنکن (امریکا کے سولہویں صدر)
 ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء سید عارف (اردو کے ممتاز شاعر)
 ۱۳ فروری ۱۹۱۱ء فیض احمد فیض (اردو کے نامور شاعر)
 ۱۳ فروری ۱۹۰۵ء بیگم رعنا لیاقت علی خان (پاکستان کی پہلی خاتون اول)
 ۱۴ فروری ۱۳۸۳ء ظہیر الدین بابر (مغلیہ سلطنت کا بانی)
 ۱۴ فروری ۶۶ء اے تھامس رابرٹ (معاہدات دان)
 ۱۵ فروری ۱۵۶۳ء گیلیلیو گیلیلی (مشہور اطالوی سائنسدان اور ستارہ شناس)
 ۱۵ فروری ۱۹۱۶ء سید انور (افسانہ نگار)
 ۱۵ فروری ۱۹۵۱ء صغیر مال (اردو کے شاعر اور ادیب)



منو بھائی



شوکت تھانوی



محمود شام



عطاء الحق قاسمی

- ۲۶ فروری ۱۹۷۸ء یاسر حید (پاکستانی ٹیسٹ کرکٹر)
 ۲۷ فروری ۱۹۳۲ء الازہرہ بیگم (ہالی وڈ اداکارہ)
 ۲۷ فروری ۱۸۰۰ء لائگ فیلو (امریکی شاعر)
 ۲۷ فروری ۱۹۰۳ء جان آئین بک (مشہور امریکی ادیب)
 ۲۸ فروری ۱۹۰۱ء آئنسٹائن کارل پانک (امریکا کا مشہور کیمیا دان)
 ۲۸ فروری ۱۹۰۳ء ڈاکٹر دین محمد تاثیر (اردو شاعر، نقاد، ماہر تعلیم)
 ۲۹ فروری ۱۷۹۲ء اے الطونیہ روز بی (موسیقار)
 ۲۹ فروری ۱۸۹۶ء مرزا جی ڈیسی (سابق بھارتی وزیر اعظم)

ماہ فروری میں وفات پانے والی شخصیات

- ۱ فروری ۱۹۶۷ء چنٹس شیخ دین محمد (ماہر قانون)
 ۱ فروری ۱۹۹۱ء مفتی احمد الرحمن (ممتاز عالم دین)
 ۱ فروری ۱۹۹۲ء صادق قریشی، سیلانی (صحافی)
 ۲ فروری ۱۶۶۶ء شاہجہان (مغل بادشاہ)
 ۲ فروری ۱۹۸۷ء مولانا بہاء الحق قاسمی (عالم دین، مصنف)
 ۳ فروری ۱۹۵۱ء چودھری رحمت علی (لفظ پاکستان کے خالق)
 ۳ فروری ۱۹۷۰ء برٹنڈرسل (معروف انگریزی فلسفی، ادیب)
 ۳ فروری ۱۹۷۵ء ام کلثوم (مصر کی مشہور گلوکارہ)
 ۳ فروری ۱۹۳۶ء علامہ راشد الحیری (اردو ادیب)
 ۴ فروری ۱۸۷۰ء امام شامی (چھینیا، روس) گوریل جنگ کے بانی)
 ۴ فروری ۱۸۸۰ء تھامس کالائل (ہیرو پرست انگریز مصنف)
 ۴ فروری ۱۹۶۰ء نواب حمید اللہ خاں (سابق ریاست بھوپال کا حکمران)
 ۵ فروری ۱۹۵۳ء احمد غلام علی چھاگلہ (قومی ترانے کی دھن کے خالق)
 ۵ فروری ۱۷۶۵ء میر جعفر (نواب سراج الدولہ کی فوج کا خاندان سالار)
 ۵ فروری ۱۹۷۳ء عیدر یاش حسین شاہ (سابق گورنر بلوچستان)
 ۶ فروری ۱۸۰۳ء جوزف پریستلی (مشہور انگریز کیمیا دان)
 ۶ فروری ۱۹۳۰ء موتی لعل شہرہ (بھارتی سیاسی لیڈر)
 ۶ فروری ۱۹۵۲ء جارج ششم (برطانوی بادشاہ)



حمید نظامی



صوفی غلام مصطفیٰ نقشبندی



ریاض بٹالوی



نواب بہادر یار جنگ

۱۸ فروری ۱۴۰۳ء سلطان شہاب الدین غوری (سکران، قاتح)
 ۱۸ فروری ۱۷۵۸ء صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (معروف شاعر، ادیب)
 ۸ فروری ۱۷۲۵ء میر اعظم (روں کا بیدار مغز بادشاہ)
 ۸ فروری ۱۹۸۹ء محمد ایوب صابر (صحافی، ادیب اور شاعر)
 ۹ فروری ۱۹۵۶ء یاس ریگانہ چنگیزی (اردو شاعر)
 ۹ فروری ۲۰۰۰ء حضرت عمر بن عبدالحزیز (پانچویں خلیفہ راشد)
 ۹ فروری ۱۸۸۱ء دوستو یوکی (روسی ناول نگار)
 ۱۰ فروری ۱۸۳۷ء الگزیٹر سرگئی وچ پشکن (روسی شاعر)
 ۱۰ فروری ۱۹۸۷ء سید صادقین احمد نقوی (پاکستان کے نامور مصور)
 ۱۰ فروری ۱۹۲۳ء ولیم کوناڈ روجن (انکس ریز کا دریافت کنندہ)
 ۱۱ فروری ۱۹۷۷ء فخر الدین علی احمد (بھارت کے سابق صدر)
 ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء مقبول بٹ شہید (کشمیری لیڈر)
 ۱۱ فروری ۱۹۸۳ء پروڈیوسر یوسف سلیم چشتی (شارح کلام اقبال)
 ۱۲ فروری ۱۹۳۹ء شیخ حسن البنا (اخوان المسلمون کے بانی)
 ۱۳ فروری ۱۹۷۹ء قاضی محمد اکبر (سیاستدان اور صحافی)
 ۱۳ فروری ۲۰۰۹ء میر نسیم الدین نسیم (شاعر، روحانی شخصیت)
 ۱۳ فروری ۱۹۵۵ء نواب مرزا خاں داغ دہلوی (غزل گو، شاعر کے نام)
 ۱۳ فروری ۱۹۵۸ء سردار عبدالرب نشتر (پنجاب کے پہلے مسلمان گورنر)
 ۱۳ فروری ۲۰۰۲ء اے جے کاردار (فلم ساز اور ہدایت کار)
 ۱۵ فروری ۲۰۰۲ء ڈاکٹر حسن رضوی (مشہور شاعر)
 ۱۵ فروری ۱۸۶۹ء مرزا اسد اللہ غالب (نامور شاعر)
 ۱۵ فروری ۱۹۸۹ء اعظم کلیم (ممتاز مصنف)
 ۱۶ فروری ۸۳۵ء ابو عبد اللہ محمد بن سعد (مشہور مورخ، محدث اور ادیب)
 ۱۶ فروری ۱۹۳۳ء دادا صاحب پھالکے (ریفریجر کے پہلے فلساز، ہدایت کار)
 ۷ فروری ۱۹۳۸ء امام بیگی (بکین کے بادشاہ)
 ۷ فروری ۱۹۷۱ء اشرف عطا (معروف صحافی)
 ۷ فروری ۱۹۹۳ء عبدالحمید دہلوی (نامور خطاط)
 ۱۸ فروری ۱۳۰۵ء تیمور (ایشیا کا ایک عظیم فاتح)

۱۸ فروری ۱۹۶۷ء رابرٹ اوپن ہائم (بائے ایٹم بم)
 ۱۸ فروری ۸۸۵ء ابن ماجہ (محدث اور مفتی)
 ۱۹ فروری ۱۲۵۷ء حضرت لعل شہباز قلندر (سندھ کے مشہور صوفی بزرگ)
 ۱۹ فروری ۱۹۸۶ء اعجاز الحق قدوسی (اردو کے ادیب، مورخ، محقق)
 ۱۹ فروری ۱۹۹۳ء امیر حمزہ شٹواری (پشتو کے معروف اہل قلم)
 ۲۰ فروری ۱۹۲۹ء رتی جناح (قائد اعظم کی بیوی)
 ۲۰ فروری ۱۹۶۹ء سید حسن عسکری (پاکستان کے نامور نقاد)
 ۲۰ فروری ۲۰۰۸ء نطل ہما عثمان (قلم: پنجابی کی صوبائی وزیر)
 ۲۱ فروری ۱۹۷۶ء کشمیری الاسدی ملتانی (اردو کے ممتاز شاعر، ادیب، صحافی)
 ۲۱ فروری ۱۹۷۷ء سردار عبدالحمید خاں لاشاری (اردو شاعر)
 ۲۱ فروری ۱۹۸۰ء مولانا عبدالرحیم (عالم دین)
 ۲۲ فروری ۱۹۸۴ء جوش شیخ آبادی (اردو کے نامور شاعر)
 ۲۲ فروری ۱۹۵۳ء استاد امام دین گجراتی (پنجابی کے نامور شاعر)
 ۲۲ فروری ۱۹۵۸ء مولانا ابوالکلام آزاد (عالم دین، سیاستدان)
 ۲۳ فروری ۱۳۶۸ء جان کٹن برگ (چچا خان کا موجد)
 ۲۳ فروری ۱۹۶۷ء اے۔ آر خاتون (اردو کی معروف ناول نگار)
 ۲۵ فروری ۱۳۲۵ء سلطان غیاث الدین تغلق اول (سکران)
 ۲۵ فروری ۱۶۸۹ء خوشحال خاں خشک (پشیمان ہیرو، پشتو شاعر)
 ۲۵ فروری ۱۹۶۲ء محمد عید ظہا (بانی نوائے وقت)
 ۲۶ فروری ۱۹۷۸ء ڈاکٹر احسن فاروقی (افسانہ نگار اور نقاد)
 ۲۶ فروری ۲۰۰۹ء ڈاکٹر آغا شہیل (ممتاز افسانہ نگار اور نقاد)
 ۲۷ فروری ۱۹۳۱ء چندر شیکھر آزاد (آزادی ہند کے رہنما)
 ۲۸ فروری ۱۹۸۷ء نسیم امر ہوی (اردو کے نامور شاعر اور ماہر لسانیات)
 ۲۸ فروری ۲۰۰۸ء نذیر صیدا (اردو، پنجابی کے شاعر)
 ۲۸ فروری ۲۰۰۸ء خواجہ نور کا شمیری (ادیب، شاعر)
 ۲۹ فروری ۲۰۰۰ء محمد عارف کٹنی (سابق وزیر اعلیٰ پنجاب)
 ۲۹ فروری ۱۹۶۸ء استاد اذت اللہ پاکستان کے نامور طبلہ نواز
 ۲۹ فروری ۱۹۶۳ء ربرگینڈر ڈاکٹر نسیم سرور (صدرا ایب کے ذیلی معالج)

چچی معلومات اور کچھ گزرنے کا جذبہ،
 یہی ہے اس کو نر کا اصل مقصد

یہی ہے قصہ کوثر



درست جوابات پر انعامات آپ کے منتظر ہیں

قصہ کوثر دراصل اہم تاریخی واقعات سے ایسے دلچسپ قصوں کا انتخاب ہے جن کا مطالعہ پڑھنے والوں کو بڑے کاموں پر اسکا تاؤ زندگی کا مقصد بنانے کا شعور عطا کرتا ہے۔
 دلچسپی، معلومات اور کچھ کر گزرنے کا جذبہ، اس کی ۳۳ قیادیاں خوبیاں ہیں۔ ان قصوں کو بغور پڑھیں اور پھر سے دیکھے گا آخر میں دیے گئے ۱۸ سوالات سے اپنی ذہانت کو پکھن۔ درست جوابات ہمیں بھجوا دیجیے۔ درست جوابات دینے والے زیادہ ہونے پر قرعہ اندازی کی جائے گی اور درخوش نصیبوں کو 'اردو ڈائجسٹ' کے ۶ مہینوں کی انعامی و عمرانی تزیل کے علاوہ مندرجہ ذیل ۱۲ جو جو صورت نامیں دی جائیں گی۔
 جوابات بھیجئے کا پتہ: **مدیر ماہنامہ اردو ڈائجسٹ 325 G-III، جوہر ٹاؤن لاہور**

ماہ جنوری میں دیے گئے قصہ کوثر کے صحیح جوابات

قصہ کوثر ۱۔ (الف) بادشاہی مسجد (ب) اونگیز بے عالمگیر ۱۶۱۷ء قصہ کوثر ۲۔ (الف) بابری مسجد (ب) ۱۹۹۲ء
 قصہ کوثر ۳۔ (الف) قطب الدین ایبک (ب) قطب مینار (دہلی)

درست جوابات دینے والوں کے نام

محمد رضا (گوجرانولہ)، عمران عثمانی (لاہور)، مریم قمر قریشی (کراچی)، شگفتہ رحمان (راولپنڈی)، عرفان عثمانی (لاہور)، راحت حبیب (راولپنڈی)، سید ذیشان صادق شاہ (کوہاٹ)، علی رضوی (کراچی)، ایاز نطل (حیدر آباد)، مرزا اسفار بیگ (حیدر آباد)، آصف رحمن (لاہور)، ردا ذوالفقار (میرپور خاص)، انیس احمد (لاہور)، محمود منور خان (سرگودھا)، محمد حسن ندیم (اسلام آباد)، سید رحمان شاہ (تلہ گنگ)، منور علی (نواب شاہ)، مس فوزیہ فیاض (پکوال)، اقبال احمد خان (کراچی)، حافظ محمد باقر (بھولال)، ندیمہ سعیدہ احتیاج (جھلم)، محمد عرفان (کراچی)، ہارہ عرفان (کراچی)، جویریہ ہوسف (کوئی لوہار)، فرحت النساء (پورے والا)، منسل احمد خان (کراچی)، محمد حسن شہزاد (سیالکوٹ)، شیر نواز گل (پشاور)، حاجی اسد احمد خان (نٹوالہ یار)، نسیم شہزاد (سیالکوٹ)، مسرودین سلیم (لاہور)، الفت شہین (شہر پورہ)، محمد عرفان (حیدر آباد)، ذہرا اسماعیل خان، حافظ کوہرا یب (ذہرا اسماعیل خان)، محمد طفیل چودھری (دینہ)، محمد حنیف (ذہرا اسماعیل خان)، مرزا جمال بیگ (حیدر آباد)، سلطان حسین (حیدر آباد)، محمد یاسین راندوری (کراچی)، سید ظفر علی (حیدر آباد)، سید محمد فضل (اسلام آباد)، حاجی اسد احمد خان (نٹوالہ یار)، علی اختر (جام شورو، سندھ)، ڈاکٹر خالد سیف اللہ خان (لاہور)، پرویز اختر واحد (ہری پور)، حبیب شاہ (لاہور)، نیر اشا جن (لاہور)

قرعہ اندازی میں
 جیتنے والوں کے نام
 • شگفتہ رحمان شاہین ٹاؤن کنگل ویسٹ نزدیکی پکھن و لاہور
 • سید ذیشان صادق 6- نیواریاں سٹی 4- تعلیمی چوک اسلام آباد

آپ ہمیں جوابات اپنے نام اور پتے کے ساتھ editor@urdu-digest.com پر بھیج سکتے ہیں



صادقین



نسیم امر ہوی



سردار عبدالرب نشتر



سلطان شہاب الدین غوری

ناصر بشیر

مرتب و معلومات - نوید غازی



اسسٹنٹ پروفیسر ہوں اور حلقہء ارباب ذوق لاہور کا ممبر ہوں اور آج کل میری سیاسی شاعری ’روزنامہ پاکستان‘ کے صفحہ اول پر چھپتی ہے۔

غزل

میں خواب گہ ذات کے اندر نہیں رہتا
انسان ہوں ماحول سے کٹ کر نہیں رہتا
مل جاتی ہے طبع سے کسی نام کی منتحی
دستار تو رہتی ہے مگر سر نہیں رہتا
وہ پھول ہے گل چیں کی رسائی نہیں اس تک
آہو ہے مگر تیر کی زد پر نہیں رہتا
اس وقت ستانی ہے ہمیں نیند کی دیوی
جب ایک ستارہ بھی فلک پر نہیں رہتا
ہر شخص کی باتوں سے یہ اندازہ ہوا ہے
اس شہر میں کوئی بھی قد آور نہیں رہتا
کشتی کا سفر اچھا لگا ہے مجھے ناصر
اب بچش نظر ایک ہی منظر نہیں رہتا

حوالہ میری پسند کا

میں ۱۸ اکتوبر ۱۹۶۸ء کو ملتان شہر میں پیدا ہوا۔ ملتان سے ی میٹرک، انٹراور بی۔ اے کیا۔ گورنمنٹ کالج ملتان کے کالج میگزین ’نخلستان‘ کا مدیر بھی رہا۔ میٹرک کے بعد سے ہی ادبی تقریبات، مشاعروں، شعری نشستوں اور تنقیدی اجلاسوں میں شریک رہا اور بہت کچھ سیکھا۔ اردو کے ساتھ لگاؤ اور محبت کا یہ عالم تھا کہ میٹرک سے ہی فیصلہ کر لیا کہ میں اردو کا لیکچرار بنوں گا لہذا ایف۔ اے اور بی۔ اے میں اردو اعلیٰ بطور امتیازی مضمون رکھا اور بہت جلد ملتان کے ادبی منظر نامے پر ابھر آیا۔ شاعری اور علم عروض پر دسترس حاصل کی اور بہاؤ الدین ذکریا یونیورسٹی ملتان سے ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور بعد ازاں روزنامہ پاکستان میں نوکری حاصل کی اور لاہور چلا آیا۔

میں اوائل عمر سے ہی ادب کا ایک سنجیدہ طالب علم رہا اور تمام ادبی جرائد میرے زیر مطالعہ رہتے تھے جس سے ادب کی رفتار کا اندازہ رہتا تھا کہ کون سا ادیب کس پائے کا ادب تخلیق کر رہا ہے۔ سال اول میں میری غزل اوراق میں چھپی، اسی سال فنون میں بھی چھپی اور پھر تقریباً سبھی معیاری جرائد میں میری غزلیں اور نظمیں چھپتی رہیں۔

۱۹۹۴ء میں غزلوں کا اولین مجموعہ ’منظر بدل گئے‘ کے عنوان سے چھپا اور اس کو خوب پذیرائی ملی۔ ۱۹۹۵ء میں ایم۔ اے کا مقالہ ’گمشدہ افسانہ نگارش آغا کی کہانی‘ کے عنوان سے چھپا۔ ۲۰۰۶ء میں ’اشفاق صاحب کے زوایے‘ کے نام سے ایک کتاب مرتب کی۔ ۱۹۹۰ء میں ’محکمہ تعلیم سے وابستگی اختیار کی اور گورنمنٹ کالج پٹوکی میں بطور لیکچرار اردو مقرر ہوا۔ اب گورنمنٹ دیال سنگھ کالج لاہور میں

انھوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی اور جڈن اینگلو اورینٹل کالج کی ترویج کا کام کرایا۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لیے جدوجہد کی۔ لندن میں پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر واضح طور پر کہا کہ جب تک برصغیر کو آزادی نہیں مل جاتی، میں زندہ واپس اس ملک میں نہیں جاؤں گا اور بیرون ملک میں مرنا پسند کروں گا کیونکہ یہ ایک آزاد ملک ہے۔ کانفرنس کے کچھ عرصے بعد ۲۴ جنوری ۱۹۳۱ء کو لندن میں وفات پا گئے اور وصیت کے مطابق انھیں ریو خلم میں دفنایا گیا۔

(الف) یہ کس شخصیت کا ذکر ہے؟

(ب) ان کے انگریزی اور اردو اخبارات کے نام بتائیں؟

قصہ کوئٹہ ۳

آپ ایک مذہبی۔ کارل اور برصغیر مسلمانان کے سیاسی رہنما تھے لیکن بھارت کی تقسیم کے خلاف تھے۔ سمجھتے تھے کہ مسلمان یہاں رہ کر زیادہ طاقتور اور غالب ہوں گے۔ برصغیر کی تقسیم کے بعد بھارت کے وزیر تعلیم رہے۔ ۱۹۹۲ء میں بھارت کا سب سے بڑا سول انعام ’’بھارت رتن‘‘ بھی ملا۔ بھارت میں آپ کی سالگرہ کا دن ’’نیشنل ایجوکیشن ڈے‘‘ کے نام سے منایا جاتا ہے۔ اردو میں شاعری بھی کی۔ صحافی کے طور پر بھی کردار ادا کیا اور برطانیہ کے کردار پر تنقید کی۔ ۱۹۱۹ء کی تحریک خلافت میں نمایاں رہے۔ ۳۵ سال کی عمر میں انڈین نیشنل کانگریس کے صدر بنے۔

(الف) یہ کس شخصیت کا ذکر ہے؟ ان کا قلمی نام بتائیں؟

(ب) ان کے اخبار کا نام بتائیں؟

قصہ کوئٹہ ۱

مسلمانوں کے عظیم رہنما اور مصنف علی گڑھ یونیورسٹی کے بانی، دہلی میں ایک درویش صفت شخصیت، میر تقی ولد سید ہادی کے ہاں پیدا ہوئے۔ اسلاف ہرات سے شاہجہان کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ دہلی میں ان دنوں علوم اسلامی کے دو بڑے مراکز تھے: ایک شاہ عبدالعزیز کا مدرسہ، دوسرا مرزا مظہر جانجاناں کے جانشین شاہ غلام علی کی خانقاہ۔ انھوں نے دونوں سے فیض حاصل کیا۔ ۱۸۳۱ء میں منصفی کا امتحان پاس کیا اور مین پوری میں جج بن گئے اور پھر ترقی کرتے ہوئے ’’جج سال کار‘‘ بنے۔ بعد میں حکومت کی طرف سے انھیں ’’سر‘‘ کا خطاب بھی ملا۔ ۱۸۸۸ء میں کے سی ایس آئی کا خطاب ملا۔ انھوں نے ’’انتخاب الافین، قول متین درابطال حرکت زین، تسہیل فی جرنیل اور آثار الصنادید‘‘ نامی کتب تحریر کیں۔ سب سے پہلے سرویلیم میور کی کتاب ’’لائف آف محمد‘‘ کے جواب میں ’’خطبات احمدیہ‘‘ تصنیف کی۔ آپ نے الگ وطن کے لیے دو قومی نظریہ کا علان بھی کیا۔

(الف) یہ کس شخصیت کا ذکر ہے، نام بتائیں؟

(ب) ان کے اخبار کا نام بتائیں؟

قصہ کوئٹہ ۲

برصغیر کے عظیم سیاسی رہنما جن کا تعلق پٹھانوں کے قبیلہ یوسف زئی سے تھا۔ بھارت کے شہرام پور میں پیدا ہوئے۔ بعد میں اتر پردیش آ گئے۔ مدرسہ دیوبند، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، لیکن کالج اور آکسفورڈ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ اردو اور انگریزی دونوں اخباروں میں کام کیا۔

خوبصورت اور معیاری کتب

منشورات

ہید آفس: منصورہ، ملتان روڈ لاہور

انعامات کے لیے تعاون

جن شاعروں سے میں بہت متاثر ہوا ان کا کچھ تعارف اور کلام حسب ذیل ہے۔

ولی دکنی

کلاسیکل شاعری کا ایک بڑا نام ولی دکنی ہے جنھیں بجا طور پر اردو شاعری کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ ولی سے محبت کی وجہ ان کا اسلوب اور شعری تنوع ہے۔ ذیل میں ان کی ایک غزل پیش ہے۔



غزل

وہ صنم جب سوں بسا دیدہ حیران میں آ
آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ
ناز دیتا نہیں گر رخصت گل گشت چمن
اے چمن زار حیا دل کے گلستان میں آ
عیش ہے عیش کہ اس مہ کا خیال روشن
شع روشن کیا مجھ، دل کے شبتان میں آ
دیکھ اے اہل نظر سبزہ خط میں لب لعل
رنگ یا قوت چھپا ہے خط ریحان میں آ
غم سوں تیرے ہے ترخم کا محل حال ولی
ظلم کو چھوڑ جن شیوہ احسان میں آ

☆☆☆☆

مرزا غالب

مرزا اسد اللہ خان غالب کا انداز اور اشعار اس قدر منفرد ہیں کہ آج تک ایسا شاعر کہیں ابھر ہی نہیں سکا غالب محکمہ مصرعے عین غالب ہی کے اسلوب کی ترجمانی کرتے نظر آتے ہیں۔ ذیل میں غالب کی ایک پسندیدہ غزل پیش خدمت ہے۔

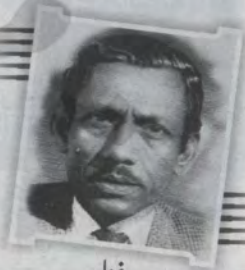


غزل

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے مگر کوئی عنان گیر بھی تھا
تو مجھے بھول گیا ہو تو پتا بتلا دوں؟
کبھی فراق میں تیرے کوئی پیچھے بھی تھا؟
قید میں ہے ترے وحشی کو وہی زلف کی یاد
ہاں کچھ اک رنج گرا بنائی زنجیر بھی تھا
بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا!
بات کرتے کہ میں لب تشیر تقریر بھی تھا
یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے، خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا
پیٹھے میں عیب نہیں، رکھیے نہ فرہاد کو نام
ہم ہی آشفند سروں میں وہ جواں میر بھی تھا
ہم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر اس شوخ کے ترکش میں کوئی تیر بھی تھا
پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناق
آدی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا
رہنے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ناصر کاظمی

ناصر کاظمی نے جو لکھا ہے وہ اردو غزل کے مستقبل کا تعین کرنے کے لئے کافی ہے۔ آپ کے اسلوب میں نیم تربیت اور رواں دواں تصویریں ناگوں نے غزل کو نیا اعتبار بخشا ہے۔ آپ کا اسلوب زندگی کی طرح مسلسل اور محبت کی طرح متواتر ہے۔ ناصر کاظمی کا نام رہتی دنیا تک زندہ رہے گا۔



غزل

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی
شور برپا ہے خانہ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی
بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی
تو شریک سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی
یاد کے بے نشان جزیروں سے
تیری آواز آ رہی ہے ابھی
شہر کی بے چراغ گلیوں میں
زندگی تجھ کو ڈھونڈتی ہے ابھی
سو گئے لوگ اس حویلی کے
ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی
تم تو یارو ابھی سے اٹھ بیٹھے
شہر کی رات جاگتی ہے ابھی
وقت اچھا بھی آئے گا ناصر
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

احمد فراز

احمد فراز نے دنیائے ادب میں اردو غزل کو اعتبار بخشا ہے۔ ان کی ڈکشن اور زبان پر دسترس سے پتا چلتا ہے کہ شعر یوں بھی کہا جاسکتا ہے۔ احمد فراز کو بجا طور پر جدید دور کا میر کہا جاسکتا ہے۔ ہر شعر میں انہوں نے زندگی میں ایک نئی روح پھونکا ہے۔



غزل

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آپھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ
کچھ تو مرے پندار محبت کا بھرم رکھ
تو بھی تو کبھی مجھ کو منانے کے لیے آ
پہلے سے مراسم نہ سہی پھر بھی کبھی تو
رم و رہ دنیا ہی نبھانے کے لیے آ
کس کس کو بتائیں گے جدائی کا سبب ہم
تو مجھ سے خفا ہے تو زمانے کے لیے آ
اک عمر سے ہوں لذت گریہ سے بھی محروم
اے راحت جاں مجھ کو رلانے کے لیے آ
اب تک دل خوش فہم کو ہیں تجھ سے امیدیں
یہ آخری شمعیں بھی بجھانے کے لیے آ

☆☆☆☆

رازوں سے پردہ اٹھا کر انہیں طشت ازبام نہیں کر دیا جاتا۔ تاہم عام نوجوانوں کی معلومات کے لیے یہ کتاب مفید ثابت ہوگی۔ چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔
نام کتاب: انسائیکلو پیڈیا۔ پاکستان میں اول اول
صفحات: ۵۳۶، ملے کا پتا: مکتبہ تعمیر انسانیت، اردو بازار، لاہور۔ قیمت: ۷۰۰ روپے

سُگلٹا ہوا افغانستان

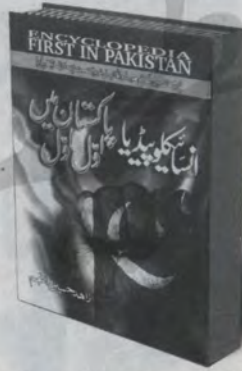
وقت اور حالات کے تمام تر قرائن یہی کہتے سنائی دیتے ہیں کہ سُگلٹے ہوئے افغانستان کا ملبہ ہمیں (پاکستان) پر گرنے کو ہے اور اس میں بلوچستان کا آکر شامل ہو جانا بھی اغلب ہے۔ کیونکہ بلوچستان سے ہمارا (ہر حکومت کا) سلوک ویسا ہی ہے جیسا کبھی مشرقی پاکستان کے ساتھ تھا۔



اب سوال صرف ایک ہے کہ اس گنجبر اور خطرناک صورت حال سے بچ نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ صورت صرف ایک ہے اور وہ بھی آخری۔ چند لوگ ایسے کہیں سے ڈھونڈ کر لائے جو دلوں میں صرف اللہ کا خوف اور لوگوں کی خدمت کا شوق رکھتے ہوں۔

سجاد محمد خاں یوسف زئی کی تصنیف 'سُگلٹا ہوا

نوعیت کا پہلا انسائیکلو پیڈیا ہے۔
زاہد حسین انجم نے کتاب کے اندر کچھ دیگر انسائیکلو پیڈیا کا حوالہ بھی دیا ہے جو وقتاً فوقتاً مرتب کیے



گئے۔ اگرچہ کتاب میں اپنی بات کے حوالے سے انھوں نے اس کتاب کے اول اول ہونے کی وضاحت کی ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس کی نوعیت کا اول اول ہونا نہیں سمجھ سکا۔ ممکن ہے کہ قارئین اس کا بھید پاکسین۔ تاہم اگر اول اول سے ان کی مراد کسی واقعہ کی ابتدائی معلومات یا مبادیاتی اطلاع یعنی وہ مفصل نہیں تو پھر ٹھیک ہے۔ لیکن پاکستان کے بعض واقعات ایسے بھی ہیں جن کی تفصیل ضروری ہے۔ ویسے عام نوجوانوں کی معلومات کے لیے اس کے لیے اس کے حوالہ جات کارآمد ہیں۔

دراصل پاکستان کی سیاسی تاریخ تمام تر خونریزیوں کے شاشانوں پر مشتمل ہے اور کئی واقعات بلکہ سانحات ایسے ہیں جن کی وجہ اور محرکات ۶۴ سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک صیغہ راز میں ہیں۔ ان میں اہم ترین پاکستان کا دولخت ہونا ہے اور ابھی سانحات کا نتیجہ ہے کہ آج معاشی اور سیاسی بد حالی کے سیاہ بادل ہمارے حال و مستقبل کو گھیرے کھڑے ہیں اور ان سے مفر کا کوئی راستہ سمجھائی نہیں دے رہا۔ میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان کی کوئی بھی تاریخ یا انسائیکلو پیڈیا اس وقت تک نامکمل ہے جب تک ان

آئیے.....! گت ابوں کی صحبت میں کچھ وقت گزاریے

کتابوں کی کہکشاں

کتابوں پر پتھرے کے روایتی کالم سے تھوڑا مختلف

محمود جمال

بغیر نہ رہ سکے۔ باہر سے آکر یہاں کے لوگوں کو رش و ہدایت کا درس دینے والے اولیائے کرام میں سے حضرت موج دریا، حضرت شاہ یوسف گردیز، حضرت بہاؤ الدین زکریا، حضرت شاہ شمس تبریز، حضرت موسیٰ پاک شہید اور بے شمار دوسرے بزرگان دین ہیں جنہیں فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ اور یہ ایک بڑی قابل ذکر بلکہ قابل غور بات ہے کہ بزرگان دین اکثر و بیشتر اس سر زمین کی طرف رجوع کرتے رہے۔ اس سر زمین میں یقیناً کوئی ایسی بات ہے جو ہم عامیوں کی سمجھ میں نہیں آسکتی لیکن مولانا ظفر علی خاں نے ذرا مختلف انداز میں اس شہر کی تعریف فرمائی: ملاحظہ کیجیے

چہار چیز است تحفہ ملتان
گرد، گرما، گدا و گورستان

نام کتاب: ارمغان ملتان، صفحات: ۵۹۲

پبلشر: فیروز سنز، مال روڈ، لاہور، قیمت: ۹۹۵ روپے



”اس شہر کی شہرت چار دانگ عالم میں تھی اور یہی شہرت، ہیون ساگ (سیاح چین) اور ابن بطوطہ جیسے مشہور عالم سیاحوں کو آج سے کئی سو سال پہلے یہاں پہنچ لانے کا سبب بنی۔ بہت سارے یورپی سیاح بھی وقتاً فوقتاً یہاں آئے اور اس شہر پر فُرسوں سے متاثر ہوئے

اُردو ڈائجسٹ کا ایک
قابل قدر سلسلہ

وزن میں کمی کا کوئی شارٹ کٹ نہیں

وزن
کم کریں مگر
صحت
نہیں

ستّرہ سو نو جوانوں پر تحقیق، لڑکیوں میں موٹاپے سے ہائی بلڈ پریشر کا خطرہ زیادہ ہے
بیکری آئٹمز دیکھ کر ہم سے ”ناں“ کیوں نہیں ہوتی؟

بریم چندر سے لے کر سعادت حسن منٹو تک ہر ادیب نے
کسی نہ کسی طور طنزیہ اسلوب اختیار کیا ہے تو اس دوران
میں لکھے گئے ادب میں اگر کہیں تھوڑی سی ظرافت ملتی بھی
ہے تو ایک تھکے ہوئے انسان کے لبوں پر آتی ہوئی



مسکراہٹ کی طرح بہت مدھم سی ہے۔ لیکن قیام پاکستان
کے بعد ہمیں طنز، مزاح اور ظرافت زیادہ ملتی ہے۔
حسین احمد شیرازی کی کتاب ”بابونگر“ ایسے طنز
و مزاح پر مبنی ہے۔ جس سے معاشرتی اصلاح کا کام لیا جا
سکے۔ اس میں روزمرہ زندگی کی بے اعتدالیوں اور
مناقضات کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے اور ان کا اول و
آخر مقصد معاشرتی برائیوں کو بے نقاب کر کے انھیں
مائل بہ اصلاح کرنا ہے۔ ”بابونگر“ میں ہمیں مزاح کے
ساتھ ساتھ گھلاوٹ ملتی ہے۔ معاشرتی کمزوریوں پر شگفتہ
انداز میں ہنسنے کا رجحان ملتا ہے۔ کسی کی تحقیر کرنے کی
کوشش بھی نہیں کی گئی۔ طنز کی نشتریت گہری تو ہے مگر کسی
دل جلے آدمی کی طرح حسین احمد شیرازی کا لہجہ تیزابی
نہیں ہے۔ بلکہ شوخی اور شگفتگی تحریر کا طرہ امتیاز ہے۔ خیر
میں ذکاوت و ذہانت کو بہت دخل حاصل ہے۔

نام کتاب: بابونگر صفحات: ۶۰۸
ملنے کا پتہ: سنگ میل پبلی کیشنز لاہور، قیمت: ۹۹۵ روپے
تہرہ نگار: فوزیہ افضل

افغانستان ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے مسئلہ
افغانستان کے حوالے سے بڑی قابل قدر معلومات دی
ہیں۔ طالبان سمیت اس پورے تناظر کو سامنے رکھ کر جو
کہانی دی ہے وہ بڑے غور و فکر اور تدبر و تفکر کی متقاضی
ہے۔ کیا ہوا؟ کیوں ہوا؟ کیسے ہوا؟ یہ سب جاننا بے حد
ضروری ہے۔ کوئی حل اگر ڈھونڈا جاتا ہے تو وہ اس منظر
سے ہٹ کر تو نہیں ڈھونڈ سکتے۔ ضیاء الحق نے پاکستان کی
حفاظت کی غرض سے پاکستان کو افغانستان میں ملوث کیا
جبکہ اپنی غرض اور اندر کے خوف کے باعث
پرویز مشرف نے سب کچھ امریکا کے آگے ڈھیر کر دیا۔
کمال یہ کہ اس خوف زدہ آدمی کا ہر وقت ایک ہی نعرہ
ہوتا تھا۔ ”میں کسی سے نہیں ڈرتا، افغانستان پر بڑی
کہانیاں لکھی گئیں اور لکھی جاتی رہیں گی۔ بڑے زرموز
اور بڑے اعداد و شمار دیے جائیں گے۔ لیکن سیاست
دانوں اور جرنیلوں کی خود غرضیوں کا حل کیا ہے۔

تاہم یہ کتاب یقیناً پڑھنے کے قابل ہے۔ بڑے چشم
کشار موز ہیں جتھیں جاننا ضروری ہے۔ کتاب کا سرورق
خوبصورت اور اس کی چھپائی اور کاغذ عمدہ ہے۔
نام کتاب: سُلگتا ہوا افغانستان، ملنے کا پتہ: شعیب سنز،
جی ٹی روڈ منگورا سولہ 729448-946، قیمت: ۲۰۰ روپے
صفحات: ۱۷۶

”بابونگر“

بیسویں صدی میں طنز و مزاح کے دو ادوار ہیں۔
پہلا دور ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۳۷ء تک ہے اور دوسرا دور
۱۹۳۷ء سے تاحال ہے۔ ان دو ادوار کے طنز و مزاح میں
 واضح فرق نظر آتا ہے۔ یہ فرق اسلوب کا بھی ہے اور
نوعیت کا بھی۔ بیسویں صدی کے نصف اول میں طنز کم
اور ظرافت زیادہ نظر آتی ہے۔ طنز کا آغاز ہمیں ۱۹۳۶ء
کے بعد ترقی پسند تحریک کے ادب میں ملتا ہے۔ جب

زندگی
میں ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے۔
جس طرح زمین کے اندر بیج بونے
کا وقت ہوتا ہے۔ وہ اپنے وقت
سے پہلے اُگ سکتا ہے نہ وہ وقت سے پہلے پودا بن سکتا
کیونکہ وقت کا دورانیہ (Time Duration) بہت
اہمیت رکھتا ہے۔

ہر چیز کو پچھل وقت دیا جائے تو ہی فائدہ ہوتا ہے۔
لیکن ہم اپنی جلد بازی سے نہ صرف نقصان اٹھاتے ہیں
بلکہ ڈھیر سی مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ مایوسی سے بچنے کے لیے ہمیں چاہیے کہ اپنے
”ارادوں“ اور ”پلان“ کو پورا وقت دیں۔ وزن کی کمی
کے لیے بھی کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے کہ جسم پر جتنا اضافی
وزن ہے وہ راتوں رات کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔
خواہش اپنی جگہ مگر نہ تو ہماری زیادہ کھانے کی شدید
خواہش قابو میں آتی ہے اور نہ بیکری آئٹمز دیکھ کر آنکھوں

میں چمک کم ہوتی ہے۔ انکار کرنے کا تو رواج ہی نہیں
ہے۔ اسی لیے وزن نہ تو قابو میں آتا ہے اور نہ مرضی سے
کم ہوتا ہے۔

موٹاپے سے لڑکیوں میں ہائی بلڈ پریشر
امریکا میں حال ہی میں کی گئی ایک تحقیق کے نتائج
بے حد توجہ طلب ہیں۔ خاص طور پر نو جوان لڑکیوں کے
لیے اس میں سوچنے کی کئی باتیں ہیں۔ اس تحقیق کے
مطابق لڑکوں کی نسبت نو جوان لڑکیوں میں موٹاپے کے
باعث بلند فشار خون میں مبتلا ہونے کا خطرہ زیادہ ہوتا
ہے۔ بلند فشار خون آگے جا کر امراض قلب اور دل کے
دورے کی وجہ بنتا ہے۔

ستّرہ سو نو جوان پر کی گئی تحقیق سے پتا چلا ہے کہ
لڑکوں کی نسبت لڑکیوں میں بلند فشار خون کے امکانات
تین گنا زیادہ تھے۔

برٹش ہارٹ فاؤنڈیشن نامی تنظیم کے ترجمان نے ایک نئی بات کہی ہے کہ برطانیہ میں اس وقت ہر تیسرا نوجوان موٹاپے کا شکار ہے۔ تحقیق کے دوران ضلعی سطح پر اسکولوں میں کیے گئے سروے میں ۱۳ سے ۱۷ برس کے درمیان کے نوجوانوں کے فشارِ خون کا جائزہ اور طبی معائینہ کیا گیا۔ ان کے قد اور وزن کے تناسب کا ریکارڈ بنایا گیا جسے ”باڈی ماس انڈیکس“ یا بی ایم آئی کہا جاتا ہے۔ ان نوجوانوں میں دو طرح کے خون کا دباؤ پایا گیا۔ ایک ڈیاسٹولک پریشر جس میں شریانوں میں دباؤ کم رہا۔ دوسرا سسٹولک بلڈ پریشر جس میں خون کا دباؤ زیادہ ہوتا ہے۔ اس دوران جب دل کی دھڑکن بڑھتی ہے تو شریانوں میں خون کا بہاؤ تیز ہو جاتا ہے۔ سسٹولک پریشر کی زیادتی امراضِ قلب اور دل کے دورے کی وجہ بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفاظت میں رکھے، علم، تحقیق، جستجو اور معلومات سبھی ہمارے لیے نعمت کے درجے میں ہیں، نعمت کا حق یہ ہے کہ اسے سمجھا جائے اور اس میں اپنے لیے راستہ نکالا جائے۔

ہمارے دماغ میں دو مرکز ہیں۔ ان دو مرکز میں سے ایک کی بیداری سے کھانا کھانے کی خواہش محسوس ہوتی ہے اور دوسرا مرکز کو اس بات کا احساس دلاتا ہے کہ کھانا زیادہ کھایا جا چکا ہے۔ لہذا مزید کھانا نہ کھایا جائے۔ خون میں شکر کی کمی واقع ہونے کی صورت میں بھوک کا احساس ہوتا ہے اور شکر کی موجودگی کی مناسب مقدار چند جسمانی غدودوں کی وجہ سے کنٹرول ہوتی ہے۔ ایک تندرست و توانا انسان میں شاذ و نادر ہی بھی ایسا ہوتا ہے کہ اس کے خون میں شکر کی مقدار بہت ہی زیادہ کم ہو جائے حتیٰ کہ ایک لمبے عرصے تک اگر کھانا نہ کھایا جائے تو بھی شکر کی مناسب مقدار خون میں اس وقت تک موجود رہتی ہے جب تک جسم پر جمع شدہ تمام فالتو گوشت کچھل کر استعمال نہ ہو جائے۔

اگر کھانے کے ساتھ سلاڈ اور ہری سبزیوں مثلاً گاجر،

مولی، ٹماٹر وغیرہ کا بھی شامل ہو تو اس سے دوہرا فائدہ ہو گا۔ ایک تو ان سے پیٹ بھر جائے گا جس کی وجہ سے دوسری خوراک کا کم استعمال ہوگا۔ دوسرا ان میں کیلوریز کی مقدار بہت کم ہوتی ہے۔

اب آتے ہیں آپ کے سوالوں کی طرف

س: میرا نام ڈاکٹر نایاب ہے، عمر ۳۰ سال قد ۵ فٹ ۶ انچ ہے۔ وزن ۸۹ کلو ہے۔ میں OPD میں کم از کم ۶ گھنٹے بیٹھ کر کام کرتی ہوں۔ میری ایک بیٹی Breast feed پہ ہے۔ میرا وزن روز بروز بڑھ رہا ہے۔ کبھی کبھار میں ۲۵ منٹ کی واک کر لیتی ہوں لیکن ریکور نہیں۔ ناشتے میں ایک روٹی یا پراٹھا دہی یا سالن کے ساتھ اور ایک کپ چائے پیتی ہوں۔ لچ میں دو گلاس دودھ یا فروٹ لیتی ہوں۔ کبھی کبھار بسکٹ لیتی ہوں یا پھر کیک وغیرہ۔ ڈنر میں دو روٹیاں سالن کے ساتھ یا چاول لیتی ہوں۔ میں بوتل وغیرہ بھی پیتی ہوں۔ پلیز مجھے ڈائٹ پلان ضرور تجویز کر دیں۔

ج: صبح اٹھ کر شہد ملے پانی کے ساتھ ۴ ملائی سپون پسلی ہوئی دار چینی پھاکیں۔ ناشتے میں ابلانڈہ اور چائے لیں۔ ۱۰ بجے دودھ اسکڈ، ۱۲ بجے سیب، ۳:۳۰ بجے گرین ٹی کے ساتھ دو شامی کباب اور سلاڈ۔ ۳:۳۰ بجے کم چکنائٹ والی دہی، دودھ کے ساتھ براؤن سلاڈ، ۵:۳۰ بجے چائے کے ساتھ ۳ بادام، ۶:۳۰ بجے ایک سیب، اور بج، ۸:۳۰ ڈنر۔ ایک روٹی فور گرین آٹا، ایک پیالی چھوٹی سالن، سلاڈ، گرین ٹی۔

سونے سے پہلے پانی کے ساتھ اسپغول لیں، زیادہ بھوک لگے تو ایک اور سیب کھالیں۔ Standing واک بھی کریں۔ براہِ مہربانی Holder ضرور لگائیں، آپ کا بیٹھنے والا کام ہے۔ پانی ضرور پیئیں، ملٹی وٹامن ضرور لیں اور Fizzy ڈرنکس نہ لیں۔ اس کی جگہ لیمن گراس، آئسی لے سکتی ہیں۔ وزن کم ہو تو ضرور بتائیں۔

نماز باقاعدگی اور درست طریقے سے ادا کریں۔ ان

شاء اللہ مطلوبہ نتائج حاصل ہوں گے۔

”میں آپ کو بہن کہوں یا بیٹی مجھے نہیں پتا۔ لیکن ازراہِ مہربانی میرا جواب ضرور دیں۔“

(نام اور مقام نامعلوم)

عمر ۴۹، قد ۱۰، ۵، وزن ۹۵ کلو۔ کمر درد کی وجہ سے نماز میں رکوع نہیں ہوتا۔ گھٹنوں میں درد ہے۔ دس سال سے بی پی زیادہ ہے۔ ۲۰۰۸ء تا ۲۰۰۶ء کچھ مسائل کی وجہ سے میں ڈپریشن کا مریض رہا ہوں۔ بہت کھانا کھاتا ہوں، لیٹا رہتا ہوں اور مایوس رہتا ہوں۔

ج: انکل نہ آپ نے اپنا نام دیا اور نہ مقام نہ ہی بتایا کہ آپ کیا کھاتے ہیں۔ بہر حال آپ کو جو میں Prescribe کروں اگر آپ اس پر عمل کریں گے تو ان شاء اللہ Instant رزلٹ ملے گا۔

وضو کم از کم دس بار کریں

اگر ہم دن میں پانچ وقت وضو کرتے ہیں۔ آپ کم از کم دس بار دہرانے یا بنانے کو معمول بنائیے۔

پاکیزگی کے ساتھ دیگر فوائد حاصل ہوں گے۔

Depression کے سڑوک کا علاج Deep Breathing اور مسحا کرنے میں ہے۔ آپ کم از کم گردن کے گرد دس مرتبہ مسحا کریں گے تو آپ کے Strokes میں کمی آئے گی۔ اس کے علاوہ سجدہ طویل کریں۔ ایسا کرنے سے ایسے بارموزن Develop ہوں گے جس سے زیادہ کھانے کی طلب اور ہر وقت لیٹے رہنے کی خواہش میں کمی آئے گی۔

آپ ناشتے میں اور بج، انڈے کی سفیدی، براؤن سلاڈ، آدھا کپ دودھ لیں۔

۱۲ بجے: چار امرود کی چاٹ لیں۔

۲ بجے گھر کا بنا سالن ۴ سپون، فور گرین آٹا روٹی،

گرین ٹی۔

۴ بجے: دودھ کا آدھا کپ اور تین بادام

۶ بجے: سیب ۸ بجے دال، فور گرین آٹا روٹی، سلاڈ، گرین ٹی لیں اور ساتھ Deep Breathing کی ورزش بھی جاری رکھیں۔

س: میرا نام عامر، عمر ۲۸ سال، قد ۵'۱۱، وزن ۷۵ کلو ہے۔ میں اپنا وزن بڑھانا چاہتا ہوں۔ ۶ سے ۸ کلو تک

ج: بھائی آپ کا وزن بالکل درست ہے۔ آپ جاگنگ کریں آدھا گھنٹہ اس کے علاوہ دودھ دوٹائم لیں۔ خود کو چست اور فٹ رکھیں۔ وزن بڑھانے کی خواہش آپ کے بڑھے ہوئے پیٹ کی صورت میں سامنے آسکتی ہے۔ خوش رہیں، نماز ادا کریں۔ اللہ کا شکر بھی ادا کریں۔ قدرتی غذائیں زیادہ کھائیں۔ یوں آپ کی صحت مثالی رہے گی۔

(عامر ملک، سعودی عرب (جدہ))

س: نوشین صلیب میری عمر ۴۴ سال ہے۔ ہائی بلڈ CPK ریڈنگ کی وجہ سے مجھے 3 / MG کی Steroid گولیوں ۴ ماہ سے لینی پڑ رہی ہیں۔ اس کے سائیڈ ایفیکٹس بھی برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔ میں اپنا ڈائٹ پلان کرانا چاہتا ہوں کہ میرا بلڈ CPK نارمل Range میں آجائے۔ اللہ آپ پر رحمت کرے میں آپ کے لیے مکہ میں بھی دعا کروں گا۔

ج: Creatine Phosphokinase (CPK) ایک ایسا Enzyme ہوتا ہے جو دل، دماغ اور Skeletal Muscles میں پایا جاسکتا ہے۔ ہائی لیول CPK کا ہونا اچھا نہیں ہوتا ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے دل کا دورہ اور بہت سے سیریس Diseases ہو سکتی ہیں۔ تاہم کچھ Prescription Drugs اور کچھ Substances بھی اس لیول کو بڑھانے کا باعث بنتے ہیں۔

آپ جو ہائی فیت فوڈ سے پرہیز کریں۔ Skim ملک اور لو فیت دہی ناشتے میں لیں۔ ۱۲۰ گرام ش اور ۱۰۰ گرام

ضروری نہیں ہے مثلاً:-

- ۱۔ یہ ساری باتیں خوب ذہن نشین کر لو۔
- ۲۔ فائر کی آواز سن کر جانور سارے بھاگ گئے۔
- پہلے ہٹلے میں موصوف (باتیں) صفت کے بعد، یعنی صحیح مقام پر ہے۔ دوسرے میں (جانور) صفت سے فوراً پہلے آیا ہے، جو اگرچہ اس کا صحیح مقام نہیں، مگر بول چال میں زور دینے کے لیے اس طرح بھی آتا ہے۔
- البتہ یہ جملے سارے کے غلط استعمال کی مثالیں ہیں:-
- ۱۔ مجمع میں جتنے بھلے آدمی تھے، سارے یہ سن کر ملول ہوئے۔

۲۔ سوال: تمہارے ساتھی کہاں ہیں؟

جواب: سارے چلے گئے۔

ان دونوں جملوں میں سب استعمال کرنا چاہیے۔

کیونکہ ان کے موصوف مخدوف ہیں۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ پہلے جملے میں سارے کا

موصوف آدمی موجود ہے۔ پھر اس کا استعمال کیوں درست نہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ جملہ دو جملوں سے مل کر بنا ہے۔

۱۔ مجمع میں جتنے آدمی تھے،

۲۔ سارے یہ سن کر ملول ہوئے۔

پہلے جُز میں فعل ”تھے“ کا فاعل ”آدمی“ ہے، اور

دوسرے جُز کے فعل ”ہوئے“ کا فاعل مخدوف ہے۔ اس

فعل کا فاعل یا تو ”وہ“ ہونا چاہیے (یعنی پورا جملہ اس طرح

ہوتا: ”وہ سارے یہ سن کر ملول ہوئے“) یا وہ کا بدل

”آدمی“ مانا جائے۔ یعنی جملہ اس طرح ہو ”وہ سارے

آدمی یہ سن کر ملول ہوئے“ دونوں مفروضہ صورتوں میں

صفت عددی ”سارے“ کا موصوف مخدوف ہے۔

تیسرا فرق، جو دراصل دوسرے فرق ہی کی ایک

شاخ ہے، یہ ہے کہ سب کے بعد حرف جار بھی آ سکتا ہے،

کُلّیت ظاہر کرنے والی صفات

یعنی جو کسی پوری تعداد کے لیے آتی ہیں۔ یہ صفات یہ ہیں۔

سب، سارے (یا ساری)، تمام، ہکل۔

(الف) مفتی کے لحاظ سے سب اور سارے میں

کوئی فرق نہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ سارا صفت عددی

نہیں، صفت مقداری ہے اور سب صفت مقداری نہیں،

صفت عددی ہے، یعنی، ان کے خیال میں، ”سارے لوگ“

غلط ہے، اس کی جگہ ”سب لوگ“ ہونا چاہیے اور اسی طرح

”سب پانی“ کے بجائے ”سارا پانی“ درست ہے۔ مگر میں

نے اہل زبان کی بول چال کے علاوہ اساتذہ شعر کے کلام کا

مطالعہ کر کے نتیجہ نکالا ہے کہ سب اور سارا دونوں صفات

عددی بھی ہیں اور صفات مقداری بھی۔ مثلاً:

گلشن تجل تھے وادی مینو اساس سے

جنگل تھا سب ہوا، پھولوں کی باس سے

(انیس)

یہاں ”سب جنگل“ کا مطلب ”سارا جنگل“ ہے۔

یعنی ”سب“ یہاں صفت مقداری ہے۔ اسی طرح

روزمرہ کو بول چال میں بھی سب اور سارا عدد اور مقدار

دونوں کے لیے آتے ہیں۔ البتہ سب بطور صفت

مقداری بہت کم آتا ہے۔

بہر حال بحیثیت صفت عددی سب اور سارے میں

ایک فرق یہ ہے کہ سارے میں سب سے ذرا زیادہ زور ہے۔

مثلاً، ”اوپر مومن کے شعر میں ”سارے گلے“ کے مقابلے میں

”سب گلے“ لایا جاتا تو اتنا زور بخیر اور تاکید نہ ہوتی۔

دوسرا فرق یہ ہے کہ سارے کا موصوف بھی مخدوف

نہیں ہوتا۔ اُس کا ”سارے“ سے آگے یا پیچھے ہونا

ربحانہ کوثر، گوجرہ

آپ نے ۹۵ رگلو سے ۹۰ رگلو وزن ایک ماہ میں کیا ہے۔ آپ کو مبارک ہو۔ آپ کو ۵۶ رگلو تک جانا ہے مستقبل مزاجی اور ماہانہ فوڈ پلانز آپ کو کامیابی کی طرف لے جائیں گے۔

حمیدہ جاوید، وکن پورہ لاہور

آپ نے ۱۵ رگلو تین ماہ میں کم کیا ہے۔ آپ کے لیے ۵۵ رگلو بہت وزن ہے۔ آپ دودھ کے دو گلاس روز پینا نہ بھولیں گے۔ ۴۵ رگلو کی واک مناسب ہے۔

ماہ جنین، مہاتوا

اللہ نے آپ کو خوشی دی ہے۔ بہت مبارک ہو۔ اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

مائی اتخبل مائی ڈاکٹر

صبا نعمان، شیخوپورہ

آپ میری زندگی میں اتخبل بن کر آئی ہیں۔ میں نے شادی کے نو سال بعد Conceive کیا ہے۔ میں آپ کا شکر یہ کیسے ادا کروں۔ میں نہیں جانتی لیکن روز قیامت میں اللہ سے آپ کی سفارش کروں گی کہ جس نے میرا گھر اور زندگی بچائی ہے۔ اسے اللہ اپنے عذاب سے بچانا۔

میرا چوتھا ماہ شارٹ ہے۔ ایک صحت مند بچہ زندگی کا خواب اور حسرت بن گیا تھا۔ آپ وسیلہ بنی ہیں۔ ہم ساری عمر آپ کے احسان مندر ہیں گے۔

بیاری صبا! شفا من جانب اللہ ہے۔ ہاں اللہ کا بڑا کرم ہوا کہ مجھے وسیلہ بنایا۔ بہت بہت مبارک ہو آپ اور آپ کے سب گھر والوں کو۔ مجھے ڈاکٹر سعدیہ نے آپ کی گڈ ٹیوز بتا دی تھی۔ میری دعا ہے کہ آپ کو نیک، صحت مند اولاد ملے۔

اس کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

مجھے میرے بچوں اور اہل خانہ کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ شکر یہ

بریسٹ پیس Steam فارم میں دوپہر کے کھانے میں سلاوا کے ساتھ لیں۔

Gravies، بٹر، Sauces، نمک اور ہربز (Herbs) مکمل طور پر بند کر دیں۔ رات کے کھانے میں دو انڈوں کی سفیدی اور دو براؤن سلاؤں اور اورنج جوس آدھا کپ پانی ملا کر استعمال کریں۔

اورنج جوس آدھا کپ اور پانی بھی آدھا کپ ہو۔ دن میں جب بھی بھوک لگے تو لوفیت دہی کی پیالی، سیب یا پھر ایک انار کا استعمال کر لیں۔

۲۰ بار سورۃ فاتحہ اپنے ہر کھانے اور پانی پر دم کر کے استعمال کریں۔ یہ فوری شفا دیتی ہے۔

پانی کا استعمال مسلسل کریں لیکن چھوٹے کپ پیئیں۔ سانس کی ورزش کریں۔ ہر نماز کے بعد تین منٹ سانس کی ورزش ضرور کریں۔ خوش رہیں، اللہ سے پُر امید رہیں۔ ان شاء اللہ، فائدہ ہوگا۔

س: میرا نام محمد اکرم اور تعلق آزاد کشمیر سے ہے۔ میری عمر ۳۲ سال، میرا وزن ۶۰ رگلو ہے اور قد ۵ فٹ ۵ انچ ہے۔ کیا میرا وزن درست ہے۔

ج: آپ کا وزن ۵۵ رگلو ہو جانا چاہیے لیکن ۶۰ رگلو Healthy وزن ہے۔ آپ ۴۵ رگلو کی واک اور نماز مکمل رکوع سجدے سے ادا کریں۔ بالائی ہٹا کر دو گلاس دودھ اور دن میں دوسروںگ فروٹ اور بیزوں کی لینا نہ بھولیں۔

مبارک ہو

اکمل خان، آزاد کشمیر

۸۶ سے ۸۱ رگلو۔ آپ نے ایک ماہ میں ۵ رگلو وزن کم کیا۔

صدرۃ المصنعا

آپ کے پیئر یڈز کا سرکل شارٹ ہونا مبارک ہو۔ آپ دو ماہ اور ۲ ہفتوں (Olives) لیں۔ لیکن ماہواری کے دنوں میں نہیں۔

نام بنانے کا طریقہ

۴۔ جاوید چودھری اور وصی شاہ تک میرا سلام پہنچا دیں اور دونوں کے مضامین و شاعری ہر ماہ شائع کریں۔
 ”ممکن ہو تو ان کا انٹرویو بھی دیں۔“

آپ کے اس جریدے میں اسلامی، ادبی کہانیاں، ناول، افسانے، ٹیکنالوجی، بزنس غرضیکہ ہر چیز موجود ہے۔ اگر اسے نوجوانوں کے لیے بالخصوص اور ہر عمر کے قارئین کے لیے بالعموم تفریح و معلومات کا انسائیکلو پیڈیا کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ ذیل میں کچھ ”حقیر“ سے مشورے پیش ہیں۔ ایک فرمائش بھی کرتی ہے۔

میں نے محسوس کیا ہے کہ اب ہوتا ہے، ہوا کرتا تھا
غیرہ کا استعمال کم ہو گیا ہے۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ یہ
استعمال انگریزی محاورے (Used to be) کا لفظی ترجمہ ہے
اور اب خود انگریزی میں بھی یہ طرز متروک ہو گیا ہے۔

۳۔ احمد پہلے میرا گہرا دوست ہوتا تھا۔
ہوتا ہے، ہوا کرتا ہے وغیرہ صرف ان مواقع پر آتے ہیں۔
الف۔ جب کوئی بات یا واقعہ بار بار ہو، مثلاً:-

۵۔ شاعری کا سلسلہ ”حوالہ میری پسند“ کا دو ماہ سے بند ہے۔ اسے دوبارہ جاری کریں۔ بہت عمدہ اور منفرد سلسلہ ہے۔ آج تک کسی اور رسالے یا اخبار نے اس طرح سے شاعر کو متعارف نہیں کرایا۔

۶۔ مجھے ادیب اور شاعر بننے کا بہت شوق ہے اور لگن بھی ہے۔ آپ میری رہنمائی کریں گے کہ مجھے نام بنانے کے لیے کیا کرنا ہوگا؟

ظیل صاحب! آسان سارا راستہ تو یہ ہے کہ کسی مضبوط لکڑی پہ نام کندھا لیں یا سٹیل کی پلیٹ پہ اپنی مرضی اور ساز کا نام کندھا لیں۔ دوسرا طریقہ لاگ مارچ اور ۳۱ جون دھرنے کا ہے۔ وہ کافی ہنگام اور رکی (Risky) ہے۔ تیسرا طریقہ لیا ہے۔ اس میں جو بننا ہے اس کا سوچ لیں اور اس شے میں جو بن چکے ہیں ان کو خوب خوب پڑھیں۔ بقول اشفاق احمد ”مقررہ کر کے کھا جائیں“ تب سوچ اور پسند کے مطابق کچھ ایسا لکھیے جو زندگی کو بہتر کرے لوگوں کے کام آئے۔ امید ہے کام بن جائے گا۔

خوگر حمد سے گلے

ایک گلے سے خوگر حمد کو آپ سے!! سوچ رہی تھی کہ شاید میری فائل تیار ہوگئی ہوگی اتنا سارا کچھ میں لکھ کر بھیجتی رہی۔ میں یہ تو نہیں کہوں گی کہ لکھنا مشکل کام ہے البتہ وقت طلب ضرور ہے اور پانچ بچوں، خانگی ذمہ داریوں اور تنظیمی ذمہ داریوں میں یہ وقت نکالنا اچھا خاصہ معرکہ ہوتا ہے۔ لیکن یہ وقت ہم دیتے ہیں ہر اس چیز اور فرد کو جس سے ہمارا تعلق ہوتا ہے۔ سو وہ طویل ترین خط اور تیرے جو میں نے کبھی ”دردل پہ دستک“ پر لکھے اور کبھی کسی حوالے سے میں یہ نہیں کہہ رہی اور چاہ رہی کہ آپ انھیں شائع کریں۔ لیکن اتنا تو علم مجھے ہو جاتا بھائی کہ وہ ”سعی رائیگاں“ نہیں ہے۔ کوئی مجھے کہہ دیتا کہ ادارے کے پاس وقت نہیں اتنی طویل تحریریں پڑھنے کا۔ تو کوئی حرج نہیں میں بالکل بھی ملوں نہ ہوں یا کوئی کہہ دیتا کہ ان لفظوں، حرفوں، تہروں، تجزیوں کی کوئی وقعت تھی، وہ ذرا سا بھی آپ کے کام آسکے تو میری بہت حوصلہ افزائی ہو جاتی کہ میں نے کسی کا وقت ضائع نہیں کیا اور وہ کسی درجہ میں بھی کہیں نافع ثابت ہو گئے تو مجھے کہ محنت وصول ہوگئی۔ لیکن اب تک خواہش یہی ہے کہ کوئی فیڈ

بیک ملے۔ اسی لیے پچھلے ماہ مختصر خط لکھا اور ساتھ نوٹ کہ ”چمن خیال کے لیے یہ خط نہیں“ تب میں سارا ماہ منتظر رہی کہ اب ادارے سے کوئی رابطہ کرے گا۔ شاید کوئی وجہ پوچھے۔ سو میری ہدایت پر عمل تو کیا الحمد للہ۔ لیکن وہ دو لفظ مجھ تک نہ پہنچ سکے کہ تبصرہ کا کوئی حاصل بھی ہے؟ بہر حال پھر تبصرہ حاضر ہے۔ اس خط میں کچھ سوال بھی تھے۔

میں اُردو ڈائجسٹ کو اپنا خیال کرتی ہوں اور اپنیوں کا خیال تو رکھا جاتا ہے۔ ہوا یوں کہ گھر میں دو شادیاں ۱۰ جنوری بہن کی پٹی، ۳۱ فروری میری پٹی (میں کارڈ شیج رہی ہوں بہت سعادت ہوگی کہ آپ شرکت کریں بلکہ میری بچی کی خوش بختی) کے نکاح کا دن تھا۔ دروازے کی بیل بجی، معلوم ہوا ہا کر ہے۔ ”باجی بل لے لیں اخبار کا“ میں نے دروازے کی اوٹ سے کہا ”بھائی اُردو ڈائجسٹ تو لائے نہیں اب تک؟“

بولا ”میرے ہاتھ میں ہے“ دروازہ کھول کر، لپک کر لے لیا۔ گھر میں سب نکاح میں جانے کی تیاریوں میں مصروف۔ میں ڈائجسٹ پا کر بھول گئی تیار۔ جب میری عدم موجودگی کو محسوس کیا گیا تو گویا بھونچال آ گیا کہ ”یہ وقت پڑھنے پڑھانے کا ہے کمال کرتی ہیں آپ۔ وقت تو دیکھیں اب تو نکلنے کا وقت ہے وغیرہ وغیرہ۔“ آپ ہی جانیں بچے کو پا کر ماں کو کب کچھ یاد رہتا ہے اور بچہ بھی وہ جسے پا کر ہر ماہ یہ احساس ہوتا ہو کہ جیسے کشیدہ پھیل گیا۔ پچھلے دنوں بہن سے ملی، شدید ڈپریشن میں محسوس کیا اس کو۔ ڈائجسٹ اگلے دن تفصیل سے پڑھا تو سوچا کہ یہ شمارہ بھی اس کے ڈپریشن کو ختم کرنے کے لیے کافی شامی ثابت ہوگا۔ (ان شاء اللہ)

پتا ہے بھائی کیا ہوا! جنوری کے اوائل میں امی کی بے طرح یاد آتی سوچا کہ ان کے نام کا صدقہ کروں پھر جی میں آیا کہ وہ اب جی کے نام کا صدقہ کرتی تھیں تو ان کی پسندیدہ چیزوں کو سرفہرست رکھیں، جو ان کو کھانے، پہننے میں پسند تھا۔ وہ دو پٹی ٹوپی پہنتے تھے سو وہ اپنے ہاتھ سے ہی کہ صدقہ کیا کرتیں۔ جائزہ لیا تو لگا کہ میری ماں کو تو کھانے سے رغبت معمولی تھی، چٹنی روٹی ان کو مرغوب تھی۔ مونا بھونٹا

پہنتیں۔ کبھی گرمیوں میں لان کے کپڑے تک نہ بنائے سارا ہنس رہی کپڑے ہی پہنتیں۔ کبھی کھانا دبا رہے کپڑے یا پسند کا نہ کپڑے پر اعتراض نہ بنا۔ ہمیشہ ایک روٹی پیاز اور بزم مرچ کی چٹنی کے ساتھ کھا لیتیں۔ کبھی بڑی جگہ سرخ مرچ ہوتی تب میرا دل بہت بھر آیا کہ میں ماں کی پسند کا صدقہ کیسے کروں اور میں نے ماہنامہ مقبول (لاہور) کو ایک تحریر بھیجی اس حوالے سے۔ آپ کی اس ماہ ”دردل پہ دستک“ پڑھ کر جی چاہا کہ اپنی اس تحریر کی ایک کاپی آپ کو بھی بھیجوں، ہمارے پاس یادوں کے سوا ہے ہی کیا؟ آپ کی تحریر نے بہت سوں کو بہت کچھ سکھایا ہے بھائی۔ واللہ! آپ کی تحریروں میں بہت سچ ہوتا ہے۔ آپ کے دل کی آواز جو بلا روک ٹوک ہر اس دل تک پہنچ جاتی ہے جہاں تک آپ پہنچنا چاہتے ہیں۔ اسی لیے آپ کی تحریروں پڑھنے والی سیکڑوں خواتین آپ کو میری طرح بھائی سمجھتی اور آپ کے لیے دعا کرتی ہیں۔ وہ لفظ جو قلم سے کہے گئے ہوں یا زبان سے جو بندے کو اس کے رب سے ملوا دیں۔ میرے جہدوں اور میری دعاؤں میں حصہ ہے ان سب لوگوں کے لیے جن کے لفظ بندوں کو ان کے رب سے ملوا رہے ہیں۔

۱۲ ربیع الاول کا انتخاب اچھا تھا۔ شخصیات بھی آپ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ اسی طرح کہانیاں بھی ”انتخاب لا جواب“ رہیں، ”درس محبت“ ہنس مکھ، وہ دس روپے“ بین السطور بھی باتیں تھیں جو پڑھی گئیں۔ محسوس کی گئیں۔ جاوید چودھری کے علاوہ اور ایسا مقبول جان کے کالم بھی دیا کریں۔ بہت زبردست قوت دی ہے رب نے ان کے قلم کو جو سوچائی کے لیے اٹھتا ہے۔ ”دماغ کے راز“، ”برے واقعات“، بڑی موثر تحریروں میں ”آج کے حاتم طائی“ بھی آنکھیں کھولنے کو کافی تھا۔

بھائی ”عشق ممنوع“ پر جو بھرپور ورکنگ آپ نے کی۔ اس پر تو واقعی شاباش! لیکن ہیروئن کی تصویر بائٹل پر تو نہ دیتے اور میرا دل بہت دکھ جاتا ہے بغیر آستینوں کے اشتہارات پر۔ یہی تو چیزیں ہیں نا جس کی بناء پر ہم اخبار جہاں دیگر رسائل

گھر میں نہیں آنے دیتے۔ جو بھی کچھ ہے آپ سوچیں۔ آپ ایک بار فیصلہ کر لیں کہ بغیر آستینوں کے اشتہارات نہیں دیں گے تو یقین چاہیے میں کیا یقین دلاؤں گی کمزور ایمان اور بے علم وجود میرا۔ یقین تو خود آپ نے دلا یا تھا نا بھائی۔ پچھلے ماہ ”رازق، رازق تو ہی رازق“ سو بس یقین رکھیے اس کے بنا پر وہ رزق دے گا۔

باقی سب خیریت۔ کتنا بوجھل رہا پچھلا عشرہ، غفور صاحب، مرحوم ہو گئے پھر قاضی صاحب کا سائنا اٹھ گیا۔ یقیناً قاضی صاحب پر کوئی گوشہ شائع کریں گے۔ (افسان نوید۔ کراچی)

بہترین خراج تحسین

ماہ رواں کی شخصیات کا مرتب محمد خلیل چودھری آپ سے مخاطب ہے۔

جنوری کا ”دردل پہ دستک“ پڑھا۔ اپنے والد صاحب یاد آ گئے۔ جو ۱۷ اکتوبر ۲۰۰۱ء کو وفات پا گئے تھے۔ اتنا اچھا اور بہترین خراج تحسین پیش کرنے پر دل سے دعا نکلی کہ یا اللہ ہمارے والدین کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ (محمد خلیل چودھری۔ دینہ)

عشق ممنوع۔ مربوط مکمل تحریر

جنوری کا شمارہ خوبصورت اور تحریروں میں اپنی مثال آپ تھا۔ الطاف صاحب نے شیخ مجیب الرحمن کا ۳۳ رسالہ پرانا انٹرویو شائع کر کے اس متنازعہ لیڈر کی شخصیت کے کئی پہلوئے نقاب کیے ہیں۔

آپ کے مستقل کالم ”دردل پہ دستک“ میں آپ نے اپنے والدین کو بڑے خوبصورت اور درد بھرے انداز میں خراج تحسین پیش کیا ہے اور ہم سب کی ایک مشترکہ لاپرواہی کی نشاندہی بھی کی ہے کہ ہمارے پاس اپنے پیاروں کے لیے دعائے مغفرت کا وقت بھی نہیں رہا۔ نئے لکھاریوں کے صفحات کو آپ نے خوب سجایا ہے۔ کور اسٹوری، عشق ممنوع اور اس کے کاشیوں میں میڈیا کی

درد آنسو بن کر بہہ نکلا

اللہ آپ کے علم و عمل میں برکت دے اور آپ کے قلم کو درد لپہ دستک دینے کی جو صلاحیت عطا کی ہے۔ اس میں روز افزوں ترقی دے۔

جنوری کا شمارہ یکم کی شام کو میرے ہاتھ میں تھا۔ سب سے پہلے آپ کا مستقل کالم پڑھا۔ درد دل آنسو بن کر آنکھوں سے بہہ نکلا۔ ماں باپ کی محنتوں کا قرض چکانے کے لیے ایک نہیں سیکڑوں زندگیاں چاہئیں تب بھی شاید حق ادا نہ ہو سکے۔ میں بھی آپ کی طرح والدین کی شفقتوں سے محروم ہو چکا ہوں۔ لیکن وہ میری روز و شب کی دعاؤں میں خدا کے حضور اٹھے میرے ہاتھوں کے درمیان موجود رہتے ہیں۔ ”رب الرحمہما کما ربیانی صغیرہ“ یہ اللہ کا سکھایا ہوا وہ تحفہ خاص ہے جو میں بھیجتا رہتا ہوں۔

جب گھر سے نکلتا ہوں تو ”بے جی“ کی پیار بھری آواز ”جاؤ اللہ کے حوالے“ میرے ساتھ ہو جیتی ہے۔ لیکن دروازے پر الوداع کہنے والا مسکراتا چہرہ میرے سامنے نہیں ہوتا۔ ذور تک تنگے والی نگاہوں کو میری نگاہیں تلاش کرتی ہیں۔

(محمود الحسن چودھری۔ سیکڑی جزل جماعت اسلامی، مظفر آباد آزاد ہواؤں و کثیر)

میرا خریداری نمبر 2008-11/2754 R ہے۔

میرا تعلق بھی محکمہ تعلیم سے ہے۔ میرے گھر کا ہر فرد پوسٹ گریجویٹ ہے۔ بیٹی، بیٹا، بہو وغیرہ سب ایم اے، وغیرہ میں ہیں۔ خود ۲۰۰۵ء میں بحیثیت ڈپٹی ڈسٹرکٹ ایجوکیشن افسر ریٹائر ہوا ہوں۔ اللہ پاک کا خصوصی فضل و کرم ہے۔

آج خط لکھنے کا مقصد صرف اور صرف یہ ہے۔ ماہ جنوری ۱۳ء کا شمارہ ملا۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد شمارہ کھولا اور سب سے پہلے ”درد لپہ دستک“ کا آخری صفحہ اس طرح پڑھا کہ آنسو رواں..... اور پھر خدا جانے کتنی دیر بعد میں ہوش میں آیا۔ فوراً قلم لیا اور آپ کو لکھنے بیٹھ گیا۔ پہلے بھی آپ کے مضامین پڑھ کر سوچتا تھا کہ اس لڑکے کو کسی بزرگ کی دعا

ہے۔ آج پتا چلا کہ اس کے پیچھے اس کے والدین کا ہاتھ ہے۔ جن لوگوں کا آپ نے ذکر کیا ہے ان کے ساتھ میں نے بھی سروں کی۔ صفدر جنگ وغیرہ ”ایک بوسہ“ بیٹا! تم کتنے خوش نصیب ہو کہ چودھری انور کا نہ صرف بوسہ نصیب ہوا بلکہ ان کی مسکرائشیں بھی نصیب ہوئیں۔ پندرہ دن تو بڑے ہوتے ہیں۔ ایک لمحہ سے بھی تقدیر بدل جاتی ہے۔ چار، پانچ مرتبہ مجھے بھی وہاں جانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ جہاں آپ

مادر پدر آزادی پر آپ نے بہت ہی خوب لکھا، ہر گوشے کو کور کیا ہے۔ اس سے قبل کسی نے اس موضوع پر اتنا مربوط مکمل اور بے تعصب نہیں لکھا۔ ترکی کی بھی سمجھ آئی، لیکن کیا کریں شاید عوام ہی یہ سب کچھ دیکھنا پسند کرتے ہیں یا چینل والے عوام کو دکھا کر عادی کر دیتے ہیں۔ افسوس تو اس پر ہے کہ میڈیا کے کچھ نام نہاد و انشوراب بھی یہ سوال کرتے ہیں کہ فاشی کہاں ہے۔ شاید نگاہوں نے کوئی یہ فاشی سمجھتے ہیں۔ (کرامت رائف۔ اوڈیوالا ضلع شیاری سندھ)

تم کیسے بیٹھے ہو؟

اس سے پہلے کہ میں اصل موضوع کی طرف آنسو مختصر اپنا تعارف کراتا ہوں۔

اُردو ڈائجسٹ کا پرانا قاری ہوں۔ ۱۹۶۰ء سے شاید ہی کوئی شمارہ نظروں سے اوجھل ہوا ہو۔ میرے والد محترم ہائی اسکول کے ٹیچر ہونے کے ساتھ ساتھ عالم دین بھی تھے اور وہ انتہائی خوش الحان و اعظا بھی تھے۔ اُردو ڈائجسٹ کے قاری تھے اور ساتھ ہی نوائے وقت کے۔ پھر میں قاری ہوں اور آج کل میرے پوتے بھی قاری ہیں۔ گویا کہ ہمارا رشتہ اُردو ڈائجسٹ سے ”تین لکھوں“ کا ہے۔

میرے دل سے نکلے الفاظ

میں بازار تو کسی اور کام سے گیا تھا۔ اُردو ڈائجسٹ دیکھا تو رہا نہیں گیا۔ ڈاک سے آنے کا انتظار کون کرتا؟ ۹۰ روپے خرچ کیے اور شمارہ لے آیا۔ اُردو ڈائجسٹ کے لیے یہ میرے دل سے نکلے تحسین کے الفاظ ہیں کہ پوری مارکیٹ میں اتنا عمدہ، خوب صورت اور جدت سے بھرا ہوا رسالہ موجود نہیں ہے۔ ترکوں والا فچر ہر پہلو سے کور کیا گیا تھا۔ ”قول فیصل“ دینے والی روایتی تحریر بالکل نہیں تھی۔ اس حوالے سے کی گئی تحقیق و جستجو کا اندازہ کر سکتے ہوں۔ کئی بار تو ایسا ہوا کہ ہم ابھی اس موضوع پر کام کرنے اور لکھنے کا سوچ رہے ہوتے ہیں اور آپ کے ہاں چھپ بھی جاتا ہے۔ یہ قرض کئی ماہ سے میرے اوپر تھا کہ اُردو ڈائجسٹ کے جنم پہ مبارک باد کہوں۔ طیب العجاز اور پوری یکم کو کبھی میرے احساسات اور شاباش ضرور دیتے گا۔

(عامر خانواری۔ سیکڑی جزل جماعت اسلامی، مظفر آباد آزاد ہواؤں و کثیر)

نے ”ابا حضور“ کو ڈیل چیئر پر بٹھا کر سفر کرایا۔

یقین مانیں اس ایک فقرہ سے میں کتنی دیر روتا رہا۔ ”اختر عباس! تم کیسے بیٹھے ہو تمہاری ماں کو میں نے پچاس، پچپن سال بھی یوں اکیلا نہیں چھوڑا اور تم اسے اکیلا چھوڑ کر جا رہے ہو۔“

بیٹا! مضمون میں آپ کا پڑھ رہا تھا اور چشم تصور میں اپنے والدین کو دیکھ رہا تھا کہ کتنی محنت اور مشکل سے انھوں نے ہمارے مستقبل کو سنوارا۔ خود غریب تھے لیکن ہمیں شہزادوں کی طرح رکھا۔ میرے والد نعیم صدیقی مرحوم کے گاؤں خاپور ہائی اسکول میں ٹیچر تھے جو کہ ہمارے گاؤں سے ۳۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ہیں۔ ابا جان مرحوم ہر روز ۷ کلومیٹر کا فاصلہ سائیکل پر طے کرتے تھے اور واپس گاؤں پہنچ کر مسجد کی بھی خدمت کرتے تھے۔ بیٹا! کہنا آسان ہے آج کل تو لوگ ۷ کلومیٹر سفر کار میں بھی طے کر کے تھک جاتے ہیں۔

ایک بات عرض کروں مجھ پر اللہ پاک کا خصوصی فضل و کرم ہوا کہ ساری زندگی ہی ان کے قریب رہا۔ مجھے یاد نہیں کہ کسی رات کو سونے سے پہلے میں نے ان کے پاؤں نہ داہے ہوں۔ یکم فروری ۱۹۸۲ء کو میرے ابا جان اس دنیا سے تشریف لے گئے۔ یہ ناممکن ہے کہ اس دن سے لے کر آج ۳ جنوری ۲۰۱۳ء کی صبح تک میں اپنے گاؤں میں ہوں اور فجر کی نماز پڑھنے کے بعد

ان کی قبر پہ نہ گیا ہوں۔ سردی ہو، گرمی ہو، بارش ہو، یہ میرا معمول ہے اللہ پاک اس پر قائم رکھے۔

آپ کا مضمون پڑھ کر میرے دکھ تازہ ہو گئے۔ آپ سے ایک وعدہ کرتا ہوں کہ آئندہ جب بھی اپنے ابا جان کی قبر پر حاضری دوں گا تو آپ کے ”بابا سائیں“ کے لیے بھی ضرور دعا کروں گا۔ ان شاء اللہ

(الحاج قاضی محمد انوار الحق، ریٹائرڈ ڈپٹی ڈسٹرکٹ انچیف۔ پکاول)

تین شماروں کا مواد

یہ مواد ایک شمارے کا نہیں تین شماروں کا ہے۔ ”عشق ممنوع“ یہ اس قدر متوازن، عمدہ اور تفصیلاً ہر حوالے سے کور کیا ہے، بہت شائستگی سے لکھا ہے۔ ماشاء اللہ افسانے موسم کے اعتبار سے ہیں۔ ایک چیز ہوتی ہے ٹائمنگ۔ تمام افسانے کمال کے تھے۔ یہ پرچہ To kill the time نہیں رہا۔

تین شماروں کو ایک بنا کر حیران کر دیتا ہے۔ یہ شمارہ آج تک کے تمام شماروں سے اچھا تھا۔ ایک دلولہ بھر دیا ہے آپ نے پورے شمارے میں۔

میرا وعدہ ہے۔ والدین کے لیے دعا کرنے لگوں گا تو اس کے ساتھ آپ کے والدین کے لیے بھی دعا کروں گا۔ امید ہے عادت بن جائے گی۔

(ڈاکٹر شہزاد۔ ملکی)

۷ ماہ، ۱۴ اردن اور ۲ گھنٹے کی جدائی

ہم

دونوں کافی دیر سے اپنے ہی دروازے پر ٹھہرے ہوئے تھے، نہ میں نے گاڑی کا بارن دیا نہ اہلیہ نے کوئی بات کی۔ وقت سے پہلے بوڑھی ہوتی راوی ہلاک کی ایک خوب صورت عورت کے آنسو ہمارے ساتھ ہی پوری گاڑی میں در آئے تھے۔ اس سے پہلے میں کبھی نہیں جان پایا تھا کہ جن گھروں میں بیٹیاں ہوتی ہیں، ان کی نیندیں کیوں اُڑی رہتی ہیں؟

اس بات کی ابتدا ایک ماہ پہلے صبح جگلی کے آغاز میں گاڑی روکنے سے ہوئی تھی۔ میں وہاں سے پیدل چلتا ہوا اپنے پرانے گھر گیا۔ بیل بجانے کے بعد میں پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا اور منتظر رہا کہ چھت پر لگے جنگلے سے کوئی

جھانکے گا اور پھر دروازہ کھلے گا۔ ایک نیم پاگل عورت کا منہ باہر نکلے گا اور وہ مشینی انداز میں بولے گی ”یہی“ گھر نہیں ہے۔“ دروازہ کھول کر گھیراج سے

اوپر جاتی سیڑھیوں پر میرے قدم رکھنے سے پہلے فرش پر بیٹھے ایک معذور آدمی کی آواز آئے گی: ”وہ مستری کے پاس گیا ہوا ہے۔“ اور میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس وقت کون سا مستری بیٹھا ہوتا ہے، اپنا غصہ دباتے ہوئے جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ جاؤں گا اور بالائی منزل پہ واقع کمرے کا تالا کھول کر ایک دم سے رک جاؤں گا۔ سامنے بھری کتابوں اور یونیورسٹی کی اساتذہ

f akhter.abbas.92



akhterabas@ymail.com

در دل پہ
دستک
اختر عباس

کے ڈھیر حیرت سے منہ اٹھائے مجھے دیکھ رہے ہوں گے کہ تم تو ہر بار دل ہی دل میں وعدہ کر کے جاتے ہو کہ کسی سڑے کو آکر چند گھنٹے لگاؤ گے اور ہمیں، سب کو ترتیب دو گے۔ مگر وہ سڑے کبھی نہیں آتا۔ میں انھیں بتا نہیں پاتا کہ میں اس بار بھی یہاں انھیں ترتیب دینے نہیں آیا، کرایہ لینے آیا ہوں جو پچھلے تین ماہ سے ہر بار ”یوسف“ کے گھر کے بجائے مستری کے پاس ہونے کے باعث رکھا ہوا ہے۔ کوئی اور ہوتا تو صبح و شام چکر لگا کر ان کے ناک میں دم کر دیتا۔ میں نے سوچا تھا نو جوان آدمی ہے، خود ہی خیال کرے گا اور اپنے وعدے اور لکھے ہوئے معاہدے کا پاس کرتے ہوئے وقت پر گھر آ کر کرایہ دے جایا کرے گا۔ اس نے صرف چند ماہ اس ادائی کا اہتمام کیا پھر بہانے شروع ہو گئے۔ ”نئی نئی شادی کی ہے،“ ”خراجات زیادہ ہیں۔“ ”دوسرے ماہ بتایا“ ”وحدت روڈ پر واقع جس اسکول سسٹم کے ساتھ معاہدہ ہے۔“

بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنے کا، وہ اس کے مطابق پورے پیسے نہیں دے رہے۔“ اس پر میں نے اسے اپنے ایک جاننے والے کے ہاں شام کی اکیڑی میں بھی لگوا دیا کہ وہاں سے اضافی آمدن ہو جائے۔ تیسرے ماہ اس نے کہا ”میں نے ویگن بیج دی ہے بہت تنگ کرنی تھی۔ اب نئی لوں گا۔“ پھر پتا چلا کہ ”ویگن لے جانے والا پیسہ بھی

ساتھ ہی لے گیا ہے۔ ذریعہ آمدن ہی ختم ہو گیا ہے؟“ میں آج بہت سوچ کر آیا تھا کہ صبح وہ گھر پر ہوگا، مستری کے پاس جانے کا بہانہ نہیں سننا پڑے گا۔ اسے کہوں گا کہ بھائی تم اپنا نہیں اور انتظام کرو، تم سے تو مہینے کا کرایہ نہیں دیا جا رہا۔ پرانے واجبات بڑھتے جائیں گے، یہ کہاں سے دو گے؟ میں اوپر سے کسی کے جھانکنے اور دروازہ کھلنے کے انتظار میں تھا جب وہ پہلی ملاقات میرے سامنے آگئی۔ منشی اصغر جو ہمارا پرانا اسٹیٹ ایجنٹ ہے، اسے اپنے ساتھ لایا تھا۔ اسی نے تعارف کرایا۔ ”صاحب! میرے گاؤں کا ہے۔ کئی سالوں سے یہاں اسکول کی ٹیکوں کو لاتا لے جاتا ہے، تنگ نہیں کرے گا۔ گھر آکر کرایہ دے جایا کرے گا۔ آپ مہربانی کر کے کسی اور پارٹی کو ہاں نہ کرنا۔ اس نے اسی گھر میں آکر شادی کرنی ہے۔“

میرے فضائل سن کر میں نے ”یوپی“ کی طرف دیکھا۔ وہ نظریں جھکائے کھڑا تھا۔ میرے سوالوں کے بارے جواب اس نے ٹھیک ٹھیک دیئے۔ میں کسی چھوٹی سی ٹیلی کو بی گھر دینا چاہتا تھا۔ یہ اس معیار پر پورا اتر رہا تھا۔ منشی کی ضمانت بھی تھی، میں نے ہاں کر دی، خیر۔ گالی کے جذبات سے مغلوب ہو کر نیا پینٹ ہی کرا کر نہیں دیا، ساتھ میں لکڑی کا کام بھی کرا دیا، کہ نئی نئی شادی ہے، دنوں کو اچھا لگے گا۔ تمام کمروں میں پینٹھے اور ٹیوٹیں بھی ایسے ہی لگی رہنے دیں۔ پانی والی موٹر اور گیزر کی خود مجھے ہی ضرورت تھی۔ مگر میں نے وہ بھی نہیں اتروائے اور چابی لے کر حوالے کر دی۔ پہلے ۳، ۴ ماہ وہ باقاعدگی سے کرایہ اکر رہا پھر وقفہ آ گیا۔ جواب چوتھے ماہ پر پھیل گیا تھا۔ دروازہ کھلنے کے لیے مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا۔ ب کے سامنے کسی نیم پاگل عورت کا چہرہ نہیں تھا۔ ایک بات خوب صورت اور خوش شکل لڑکی کھڑی تھی۔ اسے میں نے پہلی بار یہاں دیکھا تھا۔ میں نے دروازہ عبور کیا اسے مخاطب کرنے کے لیے مناسب لفظ سوچنے لگا۔ اس دوران اس نے نہایت اعتماد سے کہا، ”وہ گاؤں لے ہوئے ہیں۔ پیسے لینے، ایک دو روز میں آجائیں گے

تو ہم خود آکر آپ کو گھر پہ دے جائیں گے۔“ ”اچھی بات ہے، پھر میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔“ بیٹا آپ کسی اچھے گھر کی لگتی ہو؟ سمجھتی ہوگی کہ کرایہ کی وقت پہ ادائی کس قدر ضروری ہوتی ہے۔ معاہدہ، زبان، وعدہ سب ایک طرف، جب کوئی ایک ماہ کا کرایہ نہ دے سکے تو اگلے ماہ ڈبل اور اس سے اگلے ماہ تین گنا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ کیونکر اور کیسے ادا ہوگا؟“ ”جی! میں سمجھتی ہوں۔ معذرت کرتی ہوں۔ آئندہ شکایت نہیں ہوگی۔ میں خود خیال رکھوں گی۔“

میں سیڑھیاں چڑھنے کی بجائے واپس آنے کے لیے پلٹا تو اندر کمرے کے ننگے فرش پر روبرو جینز سے نیک لگائے وہ آدمی مجھے دیکھ کر مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ جو ہمیشہ ”یوسف“ کے مستری کے پاس جانے کا جھوٹا بولا کرتا تھا۔ میں نے لڑکی کی طرف سویا لہ لگا ہوں سے دیکھا ”یہ ”یوپی“ کا بڑا بھائی ہے؟ اس کی بیوی اور میری ساس بھی ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔“

میں نے آفس جا کر پہلا کام یہ کیا کہ گھر فون کر کے اپنی اہلیہ سے کہا: ”ہم دونوں ہی کمال کے لوگ ہیں۔ پچھلے ۶، ۷ ماہ سے کبھی گھر کی خبر لی، نہ گھر پر رہنے والوں کی۔“ ”کیوں خیریت!“ اس نے سوال کیا۔ جواب میں نے اپنے ذہن میں پیدا ہونے والے کچھ سوال اسے بتائے۔ دوسرے روز شام میں یوپی کا فون آ گیا۔

”سر! میرے پاس ویگن نہیں ہے۔ کیا آپ گھر آسکتے ہیں؟“ یوں رات کو مہمانوں کی طرح ہم دونوں اپنے ہی گھر میں ان کے بیڈ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ گھر میں وہ واحد کمرہ تھا جو فریج، پردوں، صوفوں اور کپڑوں سے اٹا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم اور ٹی وی لاؤنج بالکل خالی تھے اور وہاں فرش پر سادہ چادریں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن پر یوپی کے گھر والے بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ انھوں نے بچن کی بجائے کور بیڈ روم میں گیس کا چولہا رکھا ہوا تھا۔ کچھ دیر کے بعد میں یوپی کو لے کر بالائی منزل پہ چلا آیا تاکہ میری اہلیہ اس کہانی کے اگلے پڑاؤ کو جان سکے۔ اوپر آکر یوپی نے

ڈیڑھ ماہ کا کرایہ دے کر ساتھ میں ایک وعدہ تھا دیا۔ اس سے رخصت لے کر میں نے اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور اپنے روٹھے ہوئے افسردہ کاغذوں کو منانے کا جتن کرنے لگا۔ اس دوران یوسی محن میں بیٹھا رہا۔ کچھ دیر بعد اپنی بیوی کے کہنے پر بازار سے بوتل لے کر آیا۔ آدھ کھٹے کے بعد میری اہلیہ نے واپسی کے لیے پیغام بھیجا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ ایک المناک کہانی سناری تھی۔

”جانتے ہیں! وہ لڑکی بی ایس سی پاس ہے، اس کی شادی کا سوٹ سوا لاکھ روپے کا تھا اور پچاس ہزار کی فوٹو گرافی ہوئی تھی۔ دو دن کے میک اپ پر چالیس ہزار خرچ اٹھا۔ اس کا بیڈ ایک لاکھ روپے مالیت کا ہے اور ایک کمرے کے فرنیچر پہ دو لاکھ روپے لگے۔“

میں نے حیرت سے پوچھا۔ اس نے دعا پڑھی اور بولی ”آپ کا کرایہ دار ویگن چلاتا ہے ناں، کئی سال سے، پہلے روٹ پر چلتا تھا پھر اسکول کی بچپوں کو لانے لے جانے لگا۔ وہیں ان کی ملاقات ہوئی اور طوفانی قسم کا رومانس پروان چڑھا، چار سال کی ضد اور جھگڑے کے بعد بالآخر خنا کے والد نے ایک شرط پر ہار مان لی کہ تمہاری شادی یہ جو تم کہو گی تمہیں مل جائے گا۔ میرے کاروبار میں بیٹی کے طور پر تمہارا جو بھی حصہ بنتا ہے۔ وہ بھی میں یک مشت تمہیں ادا کر دوں گا۔ چونکہ تم بیٹی کی طرح ہماری بات ماننے سے یکسر انکاری ہو، اسی وجہ سے اس کے بعد ہماری زندگی اور گھر سے تمہارا تعلق نہیں رہے گا۔ ہم تمہارے گھر کبھی نہیں آئیں گے۔ گھر سے میری غیر موجودگی میں تم کبھی آنا چاہو تو تمہاری مرضی، مگر ہم تمہارے میاں کو اپنے خاندان کی کسی تقریب میں نہیں بلائیں گے، نہ کبھی کسی سے متعارف کرائیں گے۔ ساجی اور خاندانی سطح پر یہ ہمارا آخری رابطہ ہوگا۔ ہمیں اس دکھ سے نکلنے میں بہت سال لگیں گے کہ ہم اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم دیتے دیتے اس کے وجود سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہماری خالص محنت، بے لوث پیار اور بے ریا توجہ میں ضرور کمی رہ گئی ہوگی جو ہماری بچی نے اپنا

مستقبل ایک ان پڑھ، گنوار، ڈرائیور کے ساتھ جوڑنا پسند کیا اور ڈرائیور بھی ایسا کہ جس نے ہمارے ہی ساتھ امانت میں خیانت کی۔ اسے ہم نے اپنی بچی اسکول اور پھر کان لانے لے جانے کی ذمہ داری سونپی اور اس ذمہ داری کے بدلے ہر ماہ باقاعدگی سے پیسے ادا کیے تھے۔ یہ ہماری نادانی اور کم فہمی تھی کہ پیسے دے کر یہ بھی سمجھتے رہے کہ ہماری قیمتی متاع، ہماری بیٹی کی وہ ہمارے نقطہ نگاہ سے حفاظت کرے گا اور دھیان سے لاتا لے جاتا رہے گا۔ کاش! ہم نے اپنا فرض اس کے ذمے نہ لگایا ہوتا۔ کیا خبر تھی وہ اسی امانت کو چرائے جائے گا جس پر اسے محافظ سمجھا تھا۔ دن دیہاڑے اس دھوکے، بدعہدی کی کاش ہمیں وقت سے پہلے خبر ہو جاتی تو یوں اس وقت اپنی بیٹی گنوا کر ہارے ہوئے نہ بیٹھے ہوتے۔“ کہانی سن کر ہم دونوں ہی افسردہ تھے۔

آنے والے دنوں میں ”یوسی“ کا معمول تو ویسا ہی رہا۔ البتہ اس کی بیوی نے باقاعدگی سے میری اہلیہ سے رابطہ رکھا، اس کے پاس والد کے دینے ہوئے سارے پیسے خرچ ہو چکے تھے۔ اب اسے عجیب سا دکھ تھا کہ شادی پر اور شادی کے بعد سارے اخراجات اسی نے خوش خوش اٹھائے۔ وہ سمجھداری سے خرچ کرتی تو اتنا برا حال نہ ہوتا، اس کے بقول وہ عجیب سرشاری کے دن تھے، پھر پیسے ختم ہونے لگے اور اب یہ نوبت آگئی کہ حمل ٹھہرنے (Pregnancy) کے باوجود ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے فیس راہ میں حاصل تھی۔

گھر میں کھانا پکانے کے لیے روزانہ ”یوسی“ کے شام کو آنے کا انتظار کرنا پڑتا۔ دودھ کا ایک پیکٹ وہ چھپا کر اسے دیتا، وہ سارا دن کمرے میں بند بڑی ربتی کہ نہ تو وہ اپنے معذور چہیٹھ سے اور نہ اس کی نیم پائل بیوی سے تبادلہ خیال کر سکتی تھی نہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتی تھی، ان مہینوں میں کوئی دوسرا ایسا بچہ نہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو فون کر کے کھانا نہیں منگا سکتی تھی کیونکہ وہاں سے تو پچھلے سات ماہ سے کوئی خود اپنے کسی کا پیغام آیا۔ وہ پھر بھی اپنی زندگی گزارنے کے فیصلے سے خوش رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ خوشی برقرار نہ رہ سکی اور اگلے ہی ماہ ہمیں اس کے

ہزار پر اور بلیک میں واقع خنا کی ماں کے گھر جانا پڑا، جاتے ہوئے میں نے اپنی اہلیہ سے پوچھا تھا۔ ”آپ کیا بات کر رہی ہیں؟“ جواباً وہ خاموش رہی تھی، کچھ سوالوں کا جواب اتنا مشکل کیوں ہو جاتا ہے! وہاں جس عورت سے ہماری ملاقات ہوئی، وہ ہمارے ساتھ صوفے پر یوں بیٹھی تھی جیسے کبھی اٹھ نہ سکے گی۔ جو بیٹی اس کی بیٹی کا ذکر ہوا تو لہجہ گھروں کیوں لگا جیسے کسی نے اسے گلو کوڑی ڈرپ لگا دی ہو۔ وہ دھاڑ مار کر میری اہلیہ کے گلے لگ گئی۔

”بیٹی تمہیں پتا ہے اس گھر میں آج ۱۴ ماہ ۱۴ دن اور ۳۳ گھنٹے کے بعد اس کا نام لیا گیا ہے۔“ پھر اس نے ہنسی سے کہا:

”کیا خنا کبھی سمجھ پائے گی کہ اس کی نادانی میں کیے فیصلے نے ہمیں کس حال سے دو چار کیا ہے۔ میرا بھرا بھرا گھر خالی ہو گیا ہے۔ مفتوں ہم اپنی کوتاہی اور غلطی پر ایک کو الزام دیتے اور کٹھن میں کھڑا کر کے سزا دیتے رہے۔ وہ وین والا سب سے پہلے اس کو لینے آتا تھا۔ سب سے آخر میں اسے چھوڑتا تھا۔ ہم نے کیوں غور نہیں کیا۔ ۳۳ سال ہماری آنکھیں بند رہیں۔ ہم اپنی بیٹی کو نہ تو اپنی اور نہ ہی اپنے خاندان کی عزت اور ناموس کی حفاظت کے بارے میں سمجھا سکے، سمجھا سکے! تمہیں پتا ہے گھر میں ہر گناہ کا قرار دینے جانے والے روک دو دی جانے والی سڑ میں خود پر ہی لیتی تھی کہ ماں میں تھی۔ میری انگلی کی پوروں نے کیوں نہ اس کا بھٹکانا محسوس کیا۔ بیٹی ہمارے ہاتھوں سے ریت کی طرح نکل گئی اور ہمیں خبر ہی نہ ہوئی۔ کوئی کی نہ تھی ہمارے گھر میں، نہ روپے پیسے کی، نہ پیار، ارک، وہ کیسے ایک چالاک اور چالباز آدمی کے ہتھے چڑھ کر سکتی تھی نہ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتی تھی، ان مہینوں میں کوئی دوسرا ایسا بچہ نہ لگایا جاسکتا ہے۔ وہ اپنی ماں کو فون کر کے کھانا نہیں منگا سکتی تھی کیونکہ وہاں سے تو پچھلے سات ماہ سے کوئی خود اپنے کسی کا پیغام آیا۔ وہ پھر بھی اپنی زندگی گزارنے کے فیصلے سے خوش رہنے کی کوشش کر رہی تھی۔ یہ خوشی برقرار نہ رہ سکی اور اگلے ہی ماہ ہمیں اس کے

پاؤں پہاڑے بیٹھا ہوگا کہ جس سے وہ بات بھی نہیں کر سکتی ہوگی، نہ ان کے ادب آداب سمجھتی ہوگی، نہ ان کی زبان اور تہذیب سے واقف ہوگی۔ ایک معذور جیٹھ اور اس کی نیم پائل بیوی کو سارا دن دیکھ دیکھ کر وہ کیسے جیتی ہوگی۔ کاش اس لڑکی نے اس جھوٹی جنت کے خواب نہ دیکھے ہوتے۔“

میری اہلیہ انھیں بتانا چاہ رہی تھی ”تکلیف اور سزا کے دن ابھی ختم نہیں ہوئے۔ قدرت نے بھی اپنی ناراضی کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ آگئی ہے۔ آپ کی بیٹی ایک نامکمل ادھورے بچے کو جنم دینے والی ہے، مگر ان کی دکھ بھری خودکلامی جاری نہیں۔“ اس کا باپ شام کو بھری جیبوں کے ساتھ واپس آتا ہے۔ دوستوں، ملازموں اور بیٹوں کے ہوتے ہوئے بھی خالی گھر آکر وہ اپنے میز پر سر رکھ کر خاموشی سے اترتا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اس کے سر میر کوئی درد نہیں ہوتا مگر اسے اتنا شدید درد ہوتا ہے کہ وہ اسے روز رلا۔ جاتے جاتے۔ تڑپائے جاتا ہے اور میں پوچھ بھی نہیں پاتی کہ سر دبا دوں۔ کیونکہ اس کا جواب جانتی ہوں وہ ”نناہ کار بیٹی کا نہیں اپنا گناہ دبانے کی فرمائش کر دے گا۔“

ملاقات ختم ہو چکی تھی اور ہم تینوں جانتے تھے۔ دکھ اور اذیت کے جو بیج بیٹی بو گئی تھی، ان پر ادھورے پھول آنے والے ہیں اور اب کے یہ دکھ اسے اکیلے ہی جھیلنا ہوگا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے کہ جن بچیوں کو والدین بچانا چاہیں وہی بچنا نہ چاہیں۔ جن کو ہم عزت سے زندہ رکھنا چاہتے ہیں وہی آسودگی کے ساتھ زندہ رہنے پر آمادہ نہیں ہوتیں۔ دھی کرتے ہوئے وہ کبھی یہ جان نہیں پاتیں کہ جب کوئی اپنا درد سے تڑپتا ہے تو کیا نہیں ہوتا، اس کے ساتھ کتنے ہی پیاروں کی جان پر بھی بن آتی ہے۔ انھیں مرنے سے بہت پہلے مرنے کی اذیت یوں بھگتی پڑتی ہے کہ درد ہڈیوں میں اترتا ہے اور وہیں ٹھہر جاتا ہے۔

ہم دونوں کافی دیر سے اپنے ہی دروازے پہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ نہ میں نے گاڑی کا بارن دیا ہے، نہ اہلیہ نے کوئی بات کی ہے اور ہم دونوں ہی جانتے ہیں کہ ابھی ہم سے بات نہ ہوئیں سکے گی۔

بوجھیں تو جانیں

مرتب: یفینٹ کرٹل (ر) مبشر احمد (دوالمیال، پیکوال) (جواب لکھنے سے پہلے دیکھ لیجیے کہ آپ کی عمر ۱۸ سے ۲۸ سال کے درمیان ہی ہے)

ماہ جنوری میں دیے گئے اسلامی کونز کے صحیح جوابات

کونز نمبر ۱ ((الف) ابو دجانہ (ب) جنگ یمامہ کونز نمبر ۲ (الف) حضرت ابوذر غفاریؓ (ب) مدینہ

درست جوابات دینے والوں کے نام

اسامہ رمضان (کندیاں)، ایاز غلیل (حیدر آباد)، مرزا اسرار بیگ (حیدر آباد)، محسن رضا (گوبرا نوالہ)، محمد حسن ندیم (اسلام آباد)، عبدالمنان شاہ (تلہ گنگ)، حافظ محمد باقر (بھاول)، ڈاکٹر امین حیا (نٹو محمد خان)، سید انس ارشاد (نٹو محمد خان)، سید زید ارشاد (نٹو محمد خان)، جویریہ یوسف (کوٹلی لوہاراں)، الفت حسین (شیخوپورہ)، محمد حسن ضیاء (سیالکوٹ)، امتیال بنت سلیم (حیدر آباد)، عطیہ سلیم (حیدر آباد)، مرزا فرحان بیگ (حیدر آباد)، اہتال سلیم (حیدر آباد)۔

قرعہ اندازی میں جیتنے والوں کے نام

- ۱۔ محمد حسن ندیم گلی نمبر ۱۸/۱۸ مکان نمبر ۶ سرکراؤنڈ فلور ۱۰/۴-۱۱ اسلام آباد
- ۲۔ عبدالمنان شاہ ہاشمی ولد حافظ فتح شاہ شیخ نزد مدنی چوک تلہ گنگ تحصیل تلہ گنگ ضلع چکوال
- ۳۔ ڈاکٹر امین حیا رحمت ہاؤس شامی بازار نٹو محمد خان
- ۴۔ جویریہ یوسف گورنمنٹ گرلز ہائیڈر سکول مشرقی سیالکوٹ

اسلامی کونز ۱

فتح مکہ کے بعد آنحضرت محمد ﷺ سب سے پہلے خانہ کعبہ تشریف لے گئے اور اپنے دست مبارک سے ایک ایک بت توڑا۔ آپ ﷺ گراتے اور زبان مبارک سے قرآن حکیم کی ایک آیت پڑھتے۔ خانہ کعبہ کی تعمیر کے بعد آپ ﷺ نے نماز شکرانہ ادا فرمائی اور حرم کے مرمرائے قیام فرماتے ہوئے خطبہ دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ ایک پہاڑی پر تشریف لے گئے اور بیعت لی۔

(الف) بت گراتے ہوئے حضور ﷺ کی زبان مبارک پر کون سا کلمہ (آیت مبارک) جاری تھا؟

(ب) کس پہاڑی پر حضور ﷺ تشریف لے گئے؟

اسلامی کونز ۲

حضرت امام حسینؑ نے کوفیوں کے خطوط آنے اور بنیہم و عوت کے پیش نظر اس شخصیت کو کوفہ روانہ کیا۔ جب یہ نیک انسان کوفہ پہنچا تو پہلے ہی روز بارہ ہزار کوفیوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ کوفہ کے حکمران نعمان بن بشیر نے ان کے ساتھ زنی کا سلوک کیا جس کی پاداش میں انھیں معزول کر کے شقی القاب عبید اللہ بن زیاد کو کوفہ کا گورنر بنادیا گیا۔ اُس نے اس نیک دل شخص پر مظالم ڈھائے۔ بعد کے حالات کے پیش نظر اس شخصیت کو وہ جگہ پناہ لینی پڑی اور سخت مزاحمت کے دوران شہادت پائی۔

(الف) یہ شخصیت کون تھی؟ (ب) کن دو جگہ انھوں نے پناہ لی؟

آپ کے جوابات ہمیں ۱۵ تاریخ تک مل جانے چاہئیں

مدیر اُردو ڈائجسٹ

325۔ جی ۱۱۱، جوہر ٹاؤن لاہور

انعامات کے لیے تعاون

اسلامک پبلی کیشنز

۴۔ کورٹ سٹریٹ، لوہڑ مال لاہور
ہیڈ آفس: بیرون منصورہ ملتان روڈ لاہور